

تختہ دار کے سہائے تلے

مصنف

جاوید ہاشمی

فہرست خطوط

صفحہ نمبر	عنوان پیش لفظ	نمبر شمار
	تختہ دار کے سائے تلے	
9	تختہ دار کے سائے تلے	-1
13	جیل کے معمولات	-2
16	جیل کیا ہے؟	-3
	میرا گاؤں	
41	میرا گاؤں	
43	گلوبل ولیج کی کہانی	-4
47	صدر پاکستان رانا عبد الوحید خان	-5
51	کاش میں نیامت موچی ہوتا	-6
55	مقدر کی تختی	-7
58	احساس جرم کی صلیب	-8
62	ماضی سے نجات	-9
64	غریب نواز سلامت	-10
67	تاریخ کانیا رخ	-11
70	سچائی کے بیج	-12
74	نقارے پر چوٹ	-13
78	غلاموں سے بڑھ کر غلام	-14
82	بھٹی کا ایندھن	-15
85	ہم سب بھٹے مزدور	-16

90	علامہ ابوالخیر اسدی صاحب	-17
93	مولانا نور احمد فریدی صاحب	-18
97	گیلی لکڑی کے آنسو	-19
100	بھیانک تصویر	-20
102	یہ ایک صدی کا قصہ ہے	-21
105	تو شاہ ہم گدا	-22
107	مہاجر	-23
110	روشنی کے منار	-24
114	ذہن کی غلاظت	-25
119	حدیث دل	
121	یوم پاکستان اور بھٹکے ہوئے راہی	-26
126	سرخ اور کالے گلاب	-27
128	زلزلہ زدگان اور درد کے رشتے	-28
131	شوق شہادت	-29
134	چاچا منگتو خان رحمۃ اللہ علیہ	-30
137	پانچ ہزار بچے!	-31
139	انتقالِ اقتدار	-32
143	زیتون کی شاخ	-33
146	ماریہ سے بشری	-34
148	یقین زندگی کا پیغام ہے	-35
153	احساس ذمہ داری	-36
156	اجتماعی قیادت کا تصور	-37

160	بڑے باپ کا بڑا بیٹا	-38
165	آزادی کی خوشبو	-39
168	زمینی حقائق	-40
172	دل دریا سمندروں ڈونگے	-41
173	پردہ غیب سے باہر	-42
178	تاریخ کا پنڈولم	-43
181	حیات جاودانی	-44
185	زرعی فارم کی کہانی	-45
188	نیب کی عدالت میں بیان	-46
198	وطن کی بیٹیو!	-47
203	ماں	-48
207	شکم سامانِ موت	-49
209	روشنی کا دریچہ	-50
212	سیکولر ازم اور اسلام	-51
220	کوئے کی لاش	-52
223	دلیل نہ وکیل فقط تمہیں	-53
226	شناخت پریڈ	-54
229	انقلاب کے آثار	-55
232	نا کام ریاست	-56
236	ناقابل علاج	-57
239	مورثیت کی سیاست	-58
244	تہذیبوں کی ناکامی اور نوشتہ دیوار	-50
251	سونے کا شہر (CITY OF GOLD)	-60

257	آخری ملاقات	-61
260	پہلا قدم	-62
263	قیدی کا قیدی سے رابطہ	-63
267	انجیل مقدس سے مشکوٰۃ شریف تک	-64
270	انسٹھ سالہ آزادی	-65
275	زندہ دلان لاہور	-66
284	الوداع اکبر گیٹی	-67
290	ہیرو	-68
293	بشریٰ کے نام	
295	نا قابل معافی	-69
297	فیوڈل ازم اور بلدیاتی نظام، ایک چہرہ دورخ	-70
302	افسر شاہی.....نوکر شاہی	-71
306	فیوڈل مسٹر کلین (Mr. Clean) ہوتا ہے	-72
310	کیا میں غدار ہوں؟	-73
316	متوسط طبقے کی قیادت	-74
319	قوت برداشت	-75
322	آٹھ ارب کا فائدہ	-76
	اقتدار اور اختلاف کی سیاست	
327	عہدے کی سیاست اور نیلسن منڈیلا سے ملاقات	-77
332	قیادت کا تصور اور چرچل کا گاؤں	-78
335	گلوبل ویج اور بین الاقوامی سیاست	-89
340	پارلیمنٹ کی بالادستی واحد علاج	-80
345	صبح آزادی	-81

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

یہ کتاب تحریر سے زیادہ خود کلامی پر مشتمل ہے میں نے جتنے خطوط لکھے ہیں ان سب کے کردار حقیقی ہیں، واقعات کی صحت کا خیال اس لئے بھی ضروری تھا کہ میں نے انہی لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے کے لئے جانا ہے، جن کا ذکر اس کتاب میں ہے، اگر کوئی بات خلاف واقعہ ہوئی تو جو ابدهی مشکل ہو جائے گی اس لئے خود کلامی خود احساسی میں تبدیل ہو گئی۔ میرا عقیدہ ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے مذہب اسلام کو تنگ دائروں میں محدود کر دیا گیا ہے میں خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہوں۔ میرا کامل یقین ہے کہ خدا انسانوں میں رہتا ہے غریبوں کی بھلائی اور خوشنودی میں خدا کی خوشنودی شامل ہے۔ اشرف المخلوقات یا عظمت انسان کا درس قرآن میں ہر جگہ دیا گیا ہے۔ جب یہ فرمایا گیا کہ خدا اپنے حقوق معاف کر دے گا مگر انسان کے حقوق غصب کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا۔ تو گویا ہماری بخشش کو انسانوں کی رضامندی سے مشروط کر دیا گیا یہی انسانیت کی عظمت کا فلسفہ ہے اس فلسفہ حیات کو دنیا کے سامنے کامیاب طریقے سے پیش کرنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے میں نے کوشش کی ہے کہ اس ذمہ داری کا احساس دلوا سکوں۔

میں سمجھتا ہوں دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام کو ایک نئے روپ میں پیش کیا گیا، ملک آزاد ہو گئے مگر معاشرے غلام بنا دیئے گئے۔ معاشرتی غلامی کی جکڑ بندیوں کو افرادی قوت اور قدرتی وسائل کے ذریعے شکست ہو چکی ہے۔ اب سامراج نیو ورلڈ آرڈر کو نوآبادیاتی نظام کے طور پر دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اس عفریت کا سامنا حکمرانوں کی بجائے تو میں کر سکتی ہیں۔ کسی قوم کی سوچ کی عکاسی صرف جمہوریت سے ہو سکتی ہے، باقی تمام راستے منزل سے بھٹکا دیتے ہیں۔ فرد واحد کی حکمرانی والے معاشرے تباہی سے

ہمکنار ہو رہے ہیں۔ طاقت کا توازن مغرب سے مشرق یا شمال سے جنوب کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ اجتماعی سوچ اپنانے والے معاشرے بالادست ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنے گرد و پیش کو بہتر بنانے کے لئے اجتماعی سوچ اور اجتماعی قیادت کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مقصد صرف اور صرف جمہوریت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا پہلے حصے میں جیل کا تذکرہ ہے اس میں جیل کے اندر کی زندگی کے کئی گوشے نقاب کیے گئے ہیں میں کیسے اپنے شب و روز گزارتا ہوں اس کا ذکر بھی اس میں شامل ہے اس حصے کو شامل کر کے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اگر نظام عالم کو بغیر کسی نظریے کے چلایا جائے تو وہ لوٹ کھسوٹ کا نظام بن جاتا ہے جس میں شرف انسانیت کی قدم قدم پر تزلزل ہوتی ہے۔

دوسرے حصے میں میرے مخاطب دنیا بھر کے محروم عوام ہیں میں نے کوشش کی ہے اپنے گاؤں کے محروم طبقات کے حوالے سے دنیا بھر کے مظلوم اور محروم لوگوں کی پسماندگی کی وجوہات کی نشاندہی کر سکوں تاکہ خود احتسابی کے عمل سے گزر کر غربت جہالت اور بیماریوں کے خلاف جنگ کو تیز کیا جاسکے۔

تیسرا حصہ جیل میں ہونے والے مشاہدات اور ارد گرد وقوع پذیر حالات پر مشتمل ہے ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ بھی اس میں شامل ہے اور درددروں کی کہانی بھی اس میں نصیحتیں بھی ہیں کچھ در پردہ حکایتیں بھی اور شکایتیں بھی۔

چوتھے حصے میں اڈیالہ جیل میں بشری کے نام تحریر کیے گئے خطوط شامل ہیں یہ خطوط میری پہلی کتاب ”ہاں میں باغی ہوں“ میں شائع ہو چکے ہیں انہیں معمولی رد و بدل کے بعد اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے تاکہ تمام خطوط یکجا ہو جائیں اور قاری کو آسانی ہو۔

قید میں کتاب لکھنے میں کئی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے خوف کے پہرے میں ہر لفظ کو قید سے آزاد کرانا پڑتا ہے قیدی کی تلاشی جیلر کا قانونی حق ہے اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں جیل حکام رات اور دن کے کسی حصے میں تالہ کھول کر آدھکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تلاشی کے لئے آئے ہیں۔ یہاں مسودے کی حفاظت کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل کام

ہے۔ تاہم اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر میں قید تنہائی میں نہ ہوتا تو کوئی کتاب نہ لکھ پاتا یہ جیل کی زندگی کا مثبت پہلو ہے۔

کتاب لکھنے کا محرک یہ جذبہ تھا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اسے کسی نہ کسی طرح جیل کی باہر کی دنیا تک پہنچایا جائے ہو سکتا ہے درد دروں کی یہ داستان در ماندہ قافلوں کو منزل کا نشان بتانے کا سبب بن جائے۔ میں اپنا پیغام پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوا یہ فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑتا ہوں۔

(مصنف)

تختہ دار کے سائے تلے

تختہ دار کے سائے تلے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بُشی جی!

اسلام علیکم!

12 اپریل 2005ء کو میں کوٹ لکھپت جیل میں داخل ہوا تو مجھے لگا کہ میں ایک ویران اور سنسان جزیرے پر اتر اہوں۔ سائیں سائیں کی آوازیں، مہیب خاموشی کا پیش خیمہ تھیں۔ مجھے سیکورٹی سیل میں بند کر دیا گیا جو الگ احاطے میں قائم کیا گیا ہے، اسکی دیواروں پر خاردار تاریں بچھائی گئی ہیں۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اس سیل میں رکھا گیا تھا۔ احاطے کے ارد گرد موت کی سزا پانیا والے قیدی ہیں۔ اس حصے کو جیل کا حساس ترین علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ میرے احاطے کی دیوار پھانسی گھاٹ کیساتھ ہے، گویا، میں تختہ دار کے سائے میں رہ کر رموز زندگی سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چاروں طرف موت کے سائے ہیں۔ جب ملاقات کیلئے ڈیوڑھی کی طرف جاتا ہوں تو پھانسی گھر کے دروازے سے گذرنا پڑتا ہے۔ گذشتہ دنوں کچھ افراد کو موت سے ہم کنار کیا گیا۔ میں چند قدموں کے فاصلے پر موجود ہونے کے باوجود موت کے قدموں کی چاپ نہیں سن سکا۔ البتہ، خوفناک خاموشی اور گہرے سناٹوں سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی موت ہے۔ اس خاموشی نے مجھے پورے معاشرے کی خاموشی کے معنی سمجھا دیئے۔ معاشرہ اگر جبر ناروا کے خلاف خاموش ہو جائے تو شہر خموشاں کے معنی سمجھنے میں مزید دیر نہیں لگتی۔ جیل کے اس حصے میں ہر وقت موت کا راج رہتا ہے۔ ہر کوٹھڑی کے دروازے پر DEATH CELL اور ہر احاطے پر ”سزائے موت کا احاطہ“ جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ یہاں پر تقریباً سو سے زیادہ موت کی کوٹھڑیاں اور چار سو سے زیادہ موت کے منتظر قیدی پھانسی گھاٹ کو اپنے سامنے دیکھتے رہتے ہیں۔

جب مجھے قید تنہائی میں ڈالا گیا تو اس اجڑے احاطے میں صرف ایک مریل بلی نظر آتی

تھی۔ شام کو جب مجھے کمرے میں تالہ بند کر دیا جاتا تو میں اسے اپنی جالیوں سے ریٹکتا ہوا دیکھتا۔ کسی جاندار کا نظر آنا زندگی کی علامت تھی پھر میں نے بنجر زمین پر کام کا آغاز کیا۔ جیل والوں نے THE FRONTIER POST کے چیف ایڈیٹر رحمت شاہ آفریدی کو دن کے کچھ حصہ کیلئے میرے پاس آنے کی اجازت دے دی، جو تین سال سزائے موت کی کوٹھڑی میں رہے، وہ اس کام میں میرے معاون ہو گئے۔ تم انہیں اس وقت سے جانتی ہو جب وہ تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ ملتان ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔

سب سے پہلے سنگلاخ زمین کی پیمائش کر کے اسے کیاریوں کی شکل دی گئی۔ زیر زمین اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر کو گہری کھدائی کر کے باہر نکالا گیا۔ کمرے کے پھلی جانب گئروں سے گندگی نکلتی رہتی تھی جو ایک متعفن تالاب کی صورت اختیار کر گئی تھی، بدبو کے بھبھوکوں سے متلی ہونے لگتی۔ اس پر پختہ اینٹوں کی فرش بندی کر دی تو کسی حد تک مسئلے کا حل نکل آیا۔ اب یہ جگہ پھولوں کی کاشت کیلئے تیار تھی۔ ہم نے اشوکا اور ایرو کیریا کے پودے منگوائے۔ نیم، لیمون، جامن، انار اور آم کے چند پودے پہلے سے موجود تھے لیکن ان کی حالت سزائے موت کے منتظر قیدیوں سے مختلف نہیں تھی۔ انہیں وقت پر پانی اور کھاد ملنے لگی تو ان میں زندگی کی رعنائیاں رنگ بھرنے لگیں۔ کچھ حصوں کو گلاب کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ سخت گرم موسم میں پودے سوکھنے لگتے، شدید سردی نے بھی چالیس سالہ ریکارڈ توڑ دیا سخت نگہبانی کی وجہ سے موسموں کو شکست ہو گئی۔

آج تم اگر اس جگہ کو دیکھ سکو تو گوشہ قفس، گوشہ چمن میں تبدیل ہو چکا ہے۔ چار سو پھولوں کی قطاریں ہیں، رنگوں کی بہار ہے۔ ریٹانے والی بلی کو متواتر غذا ملنے لگی، اب وہ چھلانگیں لگاتی ہے۔ درختوں پر آنے والے پرندوں کو شکار کرنے کیلئے باقاعدہ گھات لگا کر حملہ کرتی ہے۔ پرندوں کیلئے دانہ ڈال دیتا ہوں۔ وہ بھی بہت بڑی تعداد میں آ موجود ہوتے ہیں۔ ان پرندوں کی آوازوں سے کئی ساز چھڑتے ہیں۔ موت سے ہمکنار ہونیوالی یاسیت کے ماحول میں زندگی کو چار سو مسکراتے دیکھتا رہتا ہوں۔

میرے پاس موسمی پھولوں کا وسیع ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ اتنے پھول شاید ہی لاہور میں کسی اور جگہ موجود ہوں۔ جس قدر ہمارے اس چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے پر ہیں۔ صرف گلاب، بیس سے زیادہ رنگوں میں ہے، بجری کی کیاریوں کا اپنا حسن ہے، زمینیا اپنا رنگ؟ دکھارہا ہے۔ پینزی کبھی بلی کی طرح لگتا ہے، کبھی مکی ماؤس (Micky Mouse) اور کبھی بھالو کی طرح۔ ڈیلیا نے تو پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جافری، میری گولڈ، گل اشرفی اور مسبری سے موسم بہار کا بسنتی رنگ بھی شرمارہا ہے۔ نمائشی گو بھی کے پھولوں نے گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے ہیں۔ پیپر فلاور (Paper Flower) اور لوٹن میں توس قزح کے سارے رنگ نکھر آئے ہیں۔ پٹونیا، پکوٹی اور سٹاک، اگرچہ دیر سے نکلے مگر خوب نکلے۔ موتیا، رات کی رانی اور دن کا راجہ نہ ہوتے تو سارا آنگن خوشبو سے خالی ہوتا۔ ہماری ثقافت بھی اب ولایتی پھولوں کی طرح ہر طرف رنگ بکھیرتی ہے، مگر اس کا اپنا دامن خوشبو سے خالی ہے۔ مجھے اڈیالہ جیل میں لگائے گئے چنبا، چنبیلی اور موتیا کے پودے بہت یاد آتے ہیں جو یہاں کوشش کے باوجود میسر نہیں آسکے۔ پھولوں کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے۔ ان کا کھلنا اور مسکرانا ہی ان کا جوہر کامل ہے۔ وہ فضاؤں کو معطر کر کے ایک دو دن کے اندر موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں۔ مگر جو سرتیں وہ بکھیرتے ہیں اسی میں زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔ فنا تو ہر ایک شے نے ہونا ہے پھر ہم پھولوں کی طرح خوشبو پھیلا کر دنیا سے رخصت کیوں نہ ہوں۔ یہی موت کے اندر زندگی کا پیغام ہے اور زندگی میں موت کا۔ میں سوچتا ہوں جس طرح اس دو کنال کے بیابان ٹکڑے کو بہتر باغبانی سے گلشن میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اسی محنت اور لگن سے وطن کو رشک چمن بنانا کوئی مشکل کام نہیں، بس جگر کا خون دے کر ہی امیدوں کا چمن پھولتا اور پھلتا ہے۔

ایک دن میں پیڑ کے نیچے تنہا بیٹھا تھا کہ درخت کا سوکھا پتہ مجھ پر گرا گویا یہ موسم خزاں کی آمد کا اشارہ تھا۔ موسموں کے ستم سے پتے گر جاتے ہیں مگر پیڑ کھڑے رہتے ہیں ان خیالوں میں گم تھا کہ جیل کا ایک ملازم قریب آ کر کہنے لگا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھولوں

کی یہ حسین کیاریاں ہمارا پیارا ملک پاکستان ہے اور آپ اس کے مالی ہیں۔ پھر اپنی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا، میرے سمیت قوم کا ہر فرد اس دھرتی سے اُگنے والا پھول ہے اور آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ ہماری نگہداشت ایسے کریں جیسے پھولوں کی کیجاتی ہے۔ مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ مالی کو باغ کی مزدوری سے یقیناً خوشی ہوتی ہے مگر جتنی خوشی باغ کی ہری بھری شاخیں دیکھنے سے ہوتی ہے اُسکی کوئی قیمت نہیں۔ اگر ملک کے سیاستدان اپنے لوگوں کے پسینے کی خوشبو سے اپنے دماغ کو معطر کر سکیں تو قوم کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیر نہیں لگتی۔ قیادت کی طرف سے اخلاص اور دستِ شفقت قوم کو اور جُتُریا تک پہنچا سکتا ہے۔ میں پیدائشی طور پر رجائیت پسند ہوں، لیکن آجکل شمالی وزیرستان، کوہلو، ڈیرہ بگٹی اور پورے بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری راتوں کی نیند اُڑانے کیلئے کافی ہے۔ یہ یقین مجھے جاہد پیمائی پر اکساتا ہے کہ روشنی کی معمولی کرن اندھیروں کو بھگا سکتی ہے۔ جب شور زدہ زمین سے کوئٹیس پھوٹی ہیں تو میرے وجود سے نکلنے والے خیالات کا دھارا مجھے کشاں کشاں منزل کی طرف کھینچتا ہے۔ مجھے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے۔ لیکن میں جب موت کو زندگی میں بدلتے دیکھتا ہوں تو عالم امکان کی وسعتوں کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ مجھے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ دوست! سے میری مشکل پسندی کہتے ہیں۔ علم طاقت ہے مگر ادراک میں طاقت پرواز ہے جو غلاموں کو شہنشاہیت کی منزل پر پہنچا کر دم لیتی ہے، جہدِ مسلسل ہی زندگی ہے۔ کم کوشی سامانِ موت ہے، فیصلہ ہم نے خود کرنا ہوتا ہے، ہمیں زندگی سے پیار ہے یا موت سے؟

والسلام

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

جیل کے معمولات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

5 جنوری 2006ء رات ایک بجے۔

بُشی جی!

السلام علیکم!

نیا سال شروع ہوا تو پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ آج عمر رفتہ کو آواز دینے کو جی چاہ رہا تھا سوچا، تمہیں بھی اس خرابے کی سیر کرا دیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ 14 جنوری تک میری جیل سردس کو 40 سال ہو جائینگے؟ ویسے تو میں 1964ء میں جب آٹھویں جماعت میں تھا طلبہ کے مطالبات کے حق میں مظاہرہ کرنے پر حوالات تک پہنچ گیا۔ مگر جیل جانے کا اتفاق 1966ء میں اعلانِ تاشقند کے خلاف تحریک چلانے پر ہوا۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ میں نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ دسمبر 1970ء میں پنجاب یونیورسٹی پہنچ گیا۔ اسی عرصہ میں کوٹ لکھپت میں نئی جیل بنی تھی۔ 1971ء میں میں بھی ”لکھ پتی“ بن گیا۔ تب سے اس جیل کے درو دیوار سے ایک رشتہ استوار ہو گیا۔

2 اپریل 2005ء کو جب میں کوٹ لکھپت جیل میں آیا تو جانتا تھا کہ یہاں لمبے عرصے کیلئے رہنا ہے۔ میں نے ایک ٹائم ٹیبل بنایا اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔

صبح نماز کی ادائیگی کے بعد تلاوتِ قرآن مجید کرتا ہوں۔ چائے کی پیالی پیتا ہوں۔ جونہی کمرے کا تالا کھلتا ہے، دالان میں جا کر سیر کرتا ہوں، پھولوں اور پودوں کی نگہداشت کیلئے وقت نکالتا ہوں، نہادھو کر ناشتہ کرتا ہوں ناشتہ سے فارغ ہونے تک اخبارات آجاتے ہیں۔ مجھے بچپن سے اخبارات کے مطالعہ کا شوق رہا ہے۔ جیل ہو یا باہر کی دنیا، انگریزی اور اردو کے تقریباً سب اخبار تفصیل سے پڑھتا ہوں، روزانہ تیرہ (13) اخبارات آتے ہیں، ان کے آنے میں تھوڑی سی دیر ہو جائے تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ دس بجے تک

قاری سعید صاحب آجاتے ہیں۔ اُن سے عربی گرامر اور قرآن مجید کا ترجمہ پڑھتا ہوں، پھر ملاقاتی آجاتے ہیں۔ ڈیوڑھی میں جا کر اُن سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے، ایک بجے کے قریب واپس آ کر کھانا کھاتا ہوں۔ تین بجے تک آرام کرتا ہوں۔ تین سے پانچ بجے تک مطالعہ کرتا ہوں، پانچ سے چھ بجے تک بیڈنٹن کھیلتا ہوں، شام چھ ساڑھے چھ بجے مجھے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا جاتا ہے۔ جو نہی تالا لگتا ہے اپنے آپ کو آزاد دنیا میں پاتا ہوں۔ یہاں مکمل تنہائی ہوتی ہے۔ صبح تک کمرے میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ چابیاں مین گیٹ پر جمع کرادی جاتی ہیں۔ میرے کمرے کے باہر جو جیل ملازمین موجود ہوتے ہیں وہ بھی میری طرح قیدی ہوتے ہیں۔ کیونکہ احاطہ کے دروازہ کے باہر بھی تالا لگا ہوتا ہے اور اُس تالے کی چابیاں بھی مین گیٹ پر جمع ہوتی ہیں۔

رات کو میں اور میری تنہائی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔ 7 بجے شام ملحقہ باورچی خانے میں کھانا گرم کرتا ہوں، چائے بناتا ہوں، ریڈیو پر خبریں سنتا ہوں، میز پر کتابیں سجاتا ہوں اور مطالعہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میرے پاس کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے آزاد دنیا میں کتاب دوست ہوتی ہے اور جیل میں نعمت اپنی جہالت کم کرنے اور مطالعہ کو وسعت دینے کے لئے کتاب کا قیدی ہو گیا ہوں۔ یکسانیت کا شکار ہونے لگوں تو کاغذ اور قلم کے ذریعے گفتگو کی کوشش کرتا ہوں۔ گذشتہ اپریل سے دسمبر تک باقاعدہ تحریر کا کام موقوف رہا، مگر اخبارات کیلئے روزانہ بیان تیار کرتا رہا، میں چاہتا تھا کہ قومی معاملات کے بارے میں اپنا اور جماعت کا نقطہ نظر عوام تک ضرور پہنچایا جائے، بے شمار رکاوٹیں ہیں مگر میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہوں۔

رات کو 12 بجے سونے کی تیاری کرتا ہوں، البتہ مطالعے میں دلچسپی کی وجہ سے کئی مرتبہ ساری ساری رات جاگتا ہوں۔ کوئی تحریر یا کتاب شروع کروں تو کوشش ہوتی ہے اسے مکمل کر کے چھوڑوں۔ اس نظام الاوقات کی وجہ سے جیل کی پابندیوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ "ہاں! میں باغی ہوں" لکھنے کے بعد بہت تھک گیا تھا۔ سوچتا تھا کہ میں سیاسی

کارکن ہوں، مفکر نہیں ہوں، اس لئے مجھے سیاسی کارکن ہی رہنا چاہئے۔ قید کی طوالت نے مجبور کیا تو دوبارہ قلم اور کاغذ کو سہارا بنا لیا۔

ایک سال میں کوئی خاص فکری ارتقاء نہیں ہو سکا۔ لیکن جو آڑے ترچھے تصورات ذہن میں گھد بد کر رہے تھے انھیں ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ خطوط کے ذریعے جاری رہیگا۔ ان خطوط میں بالواسطہ طور پر چالیس سالوں کا تذکرہ بھی ہوتا رہیگا اور ہو سکتا ہے یہ خطوط قوم کیلئے دعوتِ فکر کا ذریعہ بن جائیں لہذا میرے اگلے خط کا انتظار کرنا۔

والسلام

تمہارا والد!

جیل کیا ہے

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میرے والد محترم بچپن میں ہمیں چڑیا گھر دکھانے کے لئے بہاولپور کے شیر باغ میں لے جایا کرتے تھے میں آج تک آپ سب کو کہیں سیر کے لئے نہ لے جاسکا۔ میں نے سوچا تمہیں جیل کی سیر کیوں نہ کرادوں جیل بھی ایک چڑیا گھر ہی تو ہے آج اگر قیدیوں کو نکال کر ان پنجروں میں جانوروں کو بند کیا جائے تو کسی قسم کی معمولی سی تبدیلی لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی انہیں سلاخوں اور لوہے کے جنگلوں میں شیروں اور گیڈروں کو بند کر اسے چڑیا گھر کا نام دیا جاسکتا ہے اور اسے شیر باغ بھی کہا جاسکتا ہے حکمران تو ہمیں پنجروں میں بند دیکھ کر محفوظ ہوتے ہیں تم دلگیر نہ ہونا۔

حضرت ابراہیم نے نمرود سے کہا! میرا رب زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ نمرود نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا جیل سے قیدی نکال کر لائے جائیں حکم کی تعمیل ہوئی نمرود نے کہا جن قیدیوں کو پھانسی ملنے الی ہے انہیں رہا کر دو اور جو رہا ہونے والے ہیں انہیں قتل کر دو حکم پر عمل درآمد ہو گیا نمرود نے کہا تم نے دیکھ لیا میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت بھی دیتا ہوں اس لئے مجھے اپنا خدا تسلیم کیوں نہیں کرتے یہ ہزاروں سال پہلے کا قصہ ہے۔

عزیر مصر کی قید میں حضرت یوسف چھ سال تک جیل میں رہے قیدی کا گناہ گار ہونا ضروری نہیں ورنہ یوسف علیہ السلام کی بے گناہی تو ثابت ہو چکی تھی۔ فرعون کی قید سے بنی اسرائیل کی رہائی کے ذکر سے تو رات، انجیل اور قرآن کے صفحات مزین ہیں حضرت عیسیٰ کو قید میں ڈالا گیا پھر پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

جب سے انسان کو شعور ملا اس نے معاشرے کی صف بندی شروع کر دی۔ یونان کی

پانچ ہزار سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ معاشرتی اصولوں کو توڑنے والوں کو سزا دینے کے لئے انہیں جنگی دشمن کی طرح سماج دشمن قرار دیا گیا ان کا ٹھکانہ قید خانہ کو بنایا گیا سقراط کو بھی سماج دشمن قرار دیا گیا اور اسے قید خانہ میں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔

ٹیکسلا میں ہندوستان پر حکومت کرنے والے اشوکا کے دور میں پہلا تحریری آئین معرض وجود میں آیا اس میں بھی جیل قیدی اور سزاؤں کا ذکر موجود ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنے کا حکم دیا، قرآن حکیم تو گردن چھڑانے والوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے حضور نے جنگی قیدیوں کو کہا جو قیدی دو مسلمانوں کو تعلیم دے اس کو رہا کر دیا جائے گا اس سے تعلیم کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور قیدیوں سے حسن سلوک کو بھی مثال بنایا گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ جیل کا نظام متعارف کیا۔ دور حاضر میں ترقی یافتہ ممالک نے جیل کو انسانی زندگی سدھارنے کے مراکز میں تبدیل کر دیا ہے۔ سزا کے خوف سے جرائم پر قابو پایا جاسکتا ہے مگر اصلاح معاشرے کے لئے صرف خوف کافی نہیں۔ برطانیہ میں جیب کتروں کو سرعام پھانسی کا رواج تھا مگر پھانسی دیکھنے والے اجتماع میں لوگوں کی جیب تراشی کی واردات ہو رہی ہوتی تھی لہذا برطانیہ نے اپنے قوانین کو تبدیل کر کے اصلاحی رنگ کو نمایاں کر دیا۔

ترقی پذیر ممالک میں جیلیں ابھی تک خوف کی علامت ہیں یہ خوف اب سفید پوش طبقے تک محدود ہے۔ ہمارے سیاستدان جیل کے خوف اور لالچ کی وجہ سے آئین توڑنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ جیلوں میں بے گناہ افراد کو دھکیل دیا جاتا ہے اور ان پر جیل کے ظالمانہ نظام کا شکنجہ کس دیا جاتا ہے طاقت و سزا سے بچ جاتا ہے۔ ہماری جیلیں غریب اور متوسط طبقے کے افراد سے بھری پڑی ہیں شاید ہی کوئی با وسیلہ فرد جیل میں ہو۔

اصل سزا قیدی کو نہیں ملتی ان کے خاندان اور پورے معاشرے کو ملتی ہے۔ معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لئے جرائم پیشہ افراد کو سزا دینے بغیر چارہ نہیں مگر سزا ایسی ہونی چاہیے جس سے مزید جرائم پیدا نہ ہوں اس مقصد کے حصول کے لئے جیل کے پورے نظام

کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

ازمنہ قدیم سے لے کر اب تک جیلوں میں اصلاحات کا سلسلہ بھی سات ساتھ جاری رہا ہے۔ پرانے وقتوں میں قیدیوں کو شہر میں لا کر ان سے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے در در پر بھیک منگوائی جاتی تھی۔ کابل کی جیل پل چرخی میں تو یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ جیلوں کی ایک قسم ایسی بھی تھی کہ قیدی کو کنوئیں میں ڈال دیا جاتا اور پیٹ بھرنے کے لئے رسی کے ذریعے اسے زندہ رکھنے کے لئے کھانا پہنچایا جاتا۔

فیوڈل اور قبائل ڈھانچے میں جو ذاتی جیلوں کا رواج ابھی تک موجود ہے۔ اگر کوئی سردار یا جاگیردار حکومت کی فرمانبرداری نہ کرے تو ہمارا میڈیا اس کی جیلوں پر خصوصی فیچر چھاپتا ہے اور اسے مہذب معاشرے کی توہین قرار دیتا ہے اگر وہ سردار اور حکومت کی اطاعت قبول کر لے تو سب کھ برداشت کر لیا جاتا ہے۔

میمونہ بی بی!

چونکہ تمہیں جیل کی سیر کرانی ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ تمہیں یہاں کی زبان بھی آتی ہو اگرچہ بے زبانی ہی جیل کی زبان ہے عام زندگی میں جس طرح زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ اسی طرح جیل کی اپنی زبان ہے میں روزمرہ کی اس زبان کی لغت کے بارے میں تفصیل میں تو نہیں جاسکتا چند اصلاحات حاضر ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جیل کی زبان

ملاقات ملاقات ملاقات، دورہ دورہ دورہ، موت موت موت، تلاشی تلاشی تلاشی، پرچہ پرچہ پرچہ، مشقت مشقت مشقت۔ تم حیران ہو رہی ہو کہ میں نے کس زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ یہی تو جیل کی روزمرہ کی زبان ہے۔ اگر کوئی دوزخ کے نظام کو سمجھنا چاہے تو اُسے چند روز کیلئے جیل میں ضرور آنا چاہئے۔ کیونکہ جیل دُنیا میں دوزخ کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوزخ میں پھانسی گھاٹ نہیں ہے اور وہاں کے فرشتے رشوت اور سفارش کے بغیر کام کرتے ہیں۔ جیل میں پتہ بھی رشوت کے بغیر نہیں مل

سکتا۔ جیل میں داخل ہوتے ہی جو لفظ اور آوازیں آپ سنتے ہیں انکی تفصیل کیلئے ایک الگ کتاب درکار ہے۔ چند اصطلاحات کا ذکر کئے دیتا ہوں، اردلی، نمبردار، دربان، چیف چکر، دھوبی خانہ، قالین بانی، معافی، کسبل، سزائے موت کی ملاقات، پلاسٹک کے برتن، تھپڑ گھونے، جہاز بنانا، وارنٹ نکالنا، وارنٹی۔ جیل کی جکڑ بندیوں کے نظام سے تمہیں برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کو سمجھنا آسان ہو جائیگا۔ جیل کے اندر معاشرے کے منہ زور لوگوں کو، بغیر اسلحہ کے، اتنا بے بس کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جیل حکام کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ سپاہی سے لیکر سپرنٹنڈنٹ کے پاس ایک چھڑی کے علاوہ کوئی اسلحہ نہیں ہوتا، مگر جیل سپرنٹنڈنٹ کے اختیارات مغل بادشاہوں سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ سپریم کورٹ کی طرف سے دی گئی پچیس سال قید بھی معافیاں دے دے کر آدھی کر سکتا ہے۔ قیدی کی سب سے بڑی خواہش آزادی ہوتی ہے اور آزادی سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ عام قیدی کی نظر میں ایک مانوق الفطرت چیز ہے۔ ہزاروں قیدی ہر ہفتے دورے کے وقت اس کے قدموں کی چاپ سنتے ہیں۔ وہ ہر ایک کو دیکھ سکتا ہے اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ قیدی سالہا سال جیل میں گزار کر چلے جاتے ہیں، مگر اس کی شکل سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ کیونکہ دورے کے وقت وہ قطاروں میں زمین پر بیٹھے ہوتے ہیں، انھیں نظر اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی، اگر انہوں نے اپنی عرضداشت پیش کرنی ہو تو جھکی نظروں سے کرتے ہیں۔ سوال کرنا گستاخی کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے، اور اگر قیدی نظر اٹھا کر دیکھے تو اسے بغاوت سمجھا جاتا ہے، اور پھر بغاوت کی سزا تو تم جانتی ہو۔

دورے سے پہلے مخصوص فضا پیدا کی جاتی ہے۔ صبح سویرے جاگ کر اپنی ہر ایک چیز کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔ جیل کے دورے والے حصے کو قیدیوں کی بیگار سے چکایا جاتا ہے۔ محشر کا منظر ہوتا ہے۔ قیدی کا تمام سامان باہر نکال کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا اعمال نامہ بھی سامنے کی دیوار پر لگایا جاتا ہے۔ اس پر اُس کے مقدمات اور سزا کی تفصیل ہوتی ہے۔ گتے کے اس ٹکڑے کو جیل کی زبان میں ٹکٹ کہتے ہیں۔ اسے اسمبلی کا ٹکٹ نہ سمجھ لینا، یہ دنیاوی دوزخ کا

نکٹ ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ڈیوڑھی سے نکلتا ہے تو گھنٹی بجائی جاتی ہے، یہ گھنٹی گویا صور اسرافیل ہے جس کا مطلب ہے کہ دورہ چل پڑا ہے۔ دورے کے وقت سپرنٹنڈنٹ کا نام، سپرنٹنڈنٹ کی بجائے، دورہ ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر رک جاتی ہے۔ سانس بھی آہستہ لینا پڑتی ہے۔ جس جگہ سے دورہ گذرتا ہے۔ وہاں کے چھوٹے ملازمین پر جان کنی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ دورے کا آغاز ہوتے ہی پل پل کی خبریں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اب دورہ لنگر میں ہے، اب دورہ بلاک دو میں ہے، اب دورہ پھانسی گھاٹ کے قریب ہے۔ انچارج وارڈر دشتناک انداز سے پل پل کی خبر سناتا ہے۔ قیدیوں کی اوپر کی سانس اوپر ہوتی ہے اور تلے کی تلے۔ تین سو افراد کی پوری بارک کو سانپ سونگھ جاتا ہے پتہ بھی گرے تو اسکی آواز آتی ہے۔ یہ حقیقت ہے، افسانہ نہیں کہ ایک سپرنٹنڈنٹ دورہ کر رہا تھا۔ درخت سے کوئے نے بیٹ کر دی جو کہ دیوار پر آگری۔ صاحب بہادر کو بہت برا لگا، انہوں نے وارڈر (WARDER) سے کہا! یہ کیا ہے؟ وہ بیچارہ سر جھکانے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسکی معطلی کا حکم پہنچ گیا اور اسکی بیلٹ اتار لی گئی۔ ایک سپرنٹنڈنٹ کے دورے کے دوران ایک بیل کے ڈکارنے پر بے زبان کو کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اسے بے ادبی کی جرأت کیسے ہوئی؟ پرندوں کی آواز بھی اگر سپرنٹنڈنٹ کو ناگوار گزرے تو ملازموں کی کارکردگی پر حرف آجاتا ہے۔ صرف ایک آواز گونجتی ہے!

”پریڈ ہوشیار“

یہ آواز بادشاہوں کے ”بالملاحظہ ہوشیار نگاہ رو برو بادشاہ سلامت تشریف لاتے ہیں“ کا ترجمہ ہے۔ جس احاطہ میں سپرنٹنڈنٹ داخل ہوتا ہے چکر چیف اونچی آواز میں اس کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اگر کوئی اعتراض کئے بغیر خاموشی سے اگلے احاطے میں چلا جائے تو چھوٹے ملازمین دورے کی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اسی طرح کے دورے متعلقہ وزیر اور اعلیٰ حکام بھی کرتے رہتے ہیں مگر سب سے خوفناک دورہ سپرنٹنڈنٹ کا ہی ہوتا ہے۔

جیل کا سٹاف قیدیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ پانچ ہزار قیدیوں کو قابو میں رکھنے کیلئے دو تین سو کا سٹاف کافی سمجھا جاتا ہے۔ باقی تمام کام قیدیوں سے لیا جاتا ہے۔ جب ان کے اندر سے روح آزادی کھینچ لی جاتی ہے تو وہ جیل کے نظام کو چلانے کیلئے بہترین معاون ہوتے ہیں۔ وہی مجبری بھی کرتے ہیں اور اپنے قیدی ساتھیوں کو سزا دینے میں شامل ہوتے ہیں۔ مجبری اور معاونت کرنے والے قیدیوں کو نگران کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں نگران وزیراعظم کی اصطلاح شاید جیل کے نگرانوں سے لی گئی ہے۔ دفتر چلانے سے لے کر گٹروں کی صفائی تک ہر کام قیدی کرتے ہیں۔ بالکل نوآبادیاتی نظام کی طرح۔ جس طرح دس بارہ ہزار انگریز تیس کروڑ کے ہندوستان کو مقامی ٹوریوں سے کنٹرول کرتے رہے اور عصر حاضر میں فوجی حکمران کو اقتدار پرست سیاستدانوں کا تعاون حاصل ہو تو پورا ملک جیل بن جاتا ہے۔

انگریز کے دور میں جیل سپرنٹنڈنٹس زیادہ تر گورے ہوتے تھے کیونکہ انگریز آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کیلئے جیل کو ہیبت ناک جگہ بنا کر خوف کی علامت کے طور پر رعایا کے سامنے لانا چاہتا تھا، تاکہ کوئی سراٹھا کر چلنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بعد میں دیسی حکمرانوں نے بھی اسی نظام کو اپنے عوام کو شکنجے میں کسے کیلئے جاری رکھا۔ تمام عملے کی تنخواہیں بہت قلیل ہیں اور ڈیوٹی بہت سخت۔ سپرنٹنڈنٹ سے لے کر عام سپاہی اپنے آپ کو حکمران طبقہ سمجھتا ہے اور بڑے سے بڑے قیدی کو (خواہ وہ سابق وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو) اپنی رعیت۔ کم تنخواہوں کی وجہ سے وہ ہر قیدی کا خون نچوڑتے ہیں اور سخت ڈیوٹی انہیں سنگدل بنا دیتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ جو جیل کا بادشاہ ہوتا ہے سترھویں، اٹھارہویں گریڈ سے بڑا افسر نہیں ہوتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ اگر جیل میں انتخابات کرائے جائیں تو سپرنٹنڈنٹ بلا مقابلہ منتخب ہوگا۔ اگر کوئی وزیراعظم مقابلے میں آجائے تو میرا دوٹ پھر بھی سپرنٹنڈنٹ کے خلاف نہیں ہوگا۔ وردی والے کو انکار کا نتیجہ دیکھ چکا ہوں۔ لہذا مزاج درست ہو گئے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے مظہر انگریز نے اپنے ملک کی جیلوں کو فلاحی

اداروں میں تبدیل کر دیا ہے مگر یہاں ابھی تک یہ انسانیت کی تذلیل کے مراکز ہیں۔
کرائم یونیورسٹی

پہلے وقتوں میں جیل کو جرائم کی زسری کہا جاتا تھا مگر اب اسے جرائم سکھانے کی یونیورسٹی کہا جاتا ہے جو ایک مرتبہ جیل میں آجاتا ہے اس کا خوف ختم ہو جاتا ہے اسے اپنے ہم پیشہ افراد کے ساتھ رہنے سے جرم کے خلاف نفرت بھی نہیں رہتی بلکہ اسے یہاں آکر معلوم ہوتا ہے جو جتنا بڑا مجرم یا ڈاکو ہے۔ اس کی اتنی زیادہ عزت افزائی ہو رہی ہے وہ اپنی دولت اور "شہرت" کے بل بوتے پر زندگی کی تمام سہولتوں کے ساتھ رہ رہے ہیں اب تو مافیا والے جیل میں رہ کر خود کو محفوظ کر لیتے ہیں اور باہر کی دنیا کے مافیا کو چلاتے ہیں یہاں بیٹھ کر نئے آنے والوں میں سے "باصلاحیت" افراد کو بھرتی کرتے ہیں یہیں بیٹھ کر ان کی تربیت کرتے ہیں۔ نئے آنے والے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ معمول کی زندگی نہیں گزار سکتے نہ ہی معاشرہ انہیں قبول کرے گا اس لئے وہ ان گھاگ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لیتے ہیں جرائم کی تربیت میں P-H-D کرانا ہو تو کسی بچے کو ایک مرتبہ جیل آنے دیں۔

میں نے خط کے شروع میں جیل کی اصطلاحات کا ذکر کیا تھا تمہاری معلومات کیلئے چند ایک کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ تمہیں اس زبان سے شناسائی ہو سکے جو چالیس سال سے تمہارے والد کی زندگی کا حصہ ہے۔

ڈیوڑھی

جیل کو اگر الگ ملک تسلیم کر دیا جائے تو ڈیوڑھی بیک وقت اس کا دار الخلافہ اور G.H.Q ہے۔ یہاں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ وردی میں ملبوس صدر بھی ہوتا ہے اور کمانڈر انچیف بھی۔ اس کی زبان سے نکلا ہر لفظ جیل کے آئین یعنی جیل مینول پر بھاری ہوتا ہے۔ مرکزی دروازے کے ساتھ ہی جیل کے دفاتر ہیں، اسی کو جیل کی ڈیوڑھی کہا جاتا ہے۔ جو نہی مین گیٹ سے داخل ہوں تو نئے آنے والے کے نام کا اندراج ہوتا ہے۔ ہتھکڑیاں کھول دی جاتی ہیں۔ پولیس والے قیدی کو جیل حکام کے سپرد کر دیتے

ہیں۔ باہر کی دنیا کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کی کھڑکی سے گذرتے ہی جیل کے قوانین پر عملدرآمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، یہ الگ دنیا ہے یہاں پاکستان کی کرنسی رکھنا بھی جرم ہے۔

ملاحظہ

ڈیوڑھی سے نکلنے کے بعد تلاشی ہوتی ہے اور قیدی کو نئے ملاحظے کیلئے بند کر دیا جاتا ہے۔ اگلی صبح 6 بجے نئے ملزمان کو ملاحظہ کیلئے چکر سے گزارتے ہوئے ہسپتال میں ان کا قد، وزن، عمر، تعلیم نوٹ کی جاتی ہے۔ آنے بہانے درگت شروع رہتی ہے۔ یہ کام نگران قیدی کرتے ہیں، بعد ازاں ہر ایک کے سینے پر ایک نمبر میڈل کی طرح سجایا جاتا ہے۔ جسے قیدی نمبر کہتے ہیں، گویا، یہ نئی مملکت میں رہنے کا پاسپورٹ ہے، سب کی تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ سخت سردی کے موسم میں بھی نئے آنے والے سویٹر اور جوتے اتار کر سر جھکائے خوفزدہ، زمین پر کچھی صفتوں پر اپنے نمبروں کی ترتیب سے بیٹھتے ہیں، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ان سے ان کے کردہ نا کردہ جرائم سے متعلق پوچھتا ہے۔ اگر اسے کوئی بات ناگوار گذرے تو وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی پنسل کو اٹھاتا ہے۔ یہ اس چیز کا اشارہ ہے کہ اس قیدی کو اٹھا لو۔ نگران قیدی اس نئے قیدی کو اٹھا کر مارنا شروع کر دیتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ کب پنسل نیچے ہو۔ سپرنٹنڈنٹ کے آنے پر ملاحظہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ بعد میں جو ہوتا ہے اس کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا۔ یہ سلسلہ کم و بیش 11 بجے تک رہتا ہے۔ ملاحظہ کے بعد کوٹ موقع کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دیواروں کے اندر کی زندگی شروع ہو جاتی ہے، جس کی اپنی زبان ہے، جس کا مختصر تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

گنتی پڑنا

ملاحظہ سے فارغ ہونے کے بعد آئیو الے نئی قیدیوں کو مختلف بارکوں یا کوٹھڑیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ گویا اب وہ جیل کے باشندے تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ یہ گنتی پڑنا کہلاتا ہے۔ گنتی پڑھنا ایسے ہی ہے جیسے کسی ملک کی شہریت مل جائے اگر کوئی قیدی کی بجائے

حوالاتی ہے تو اسے مکمل شہریت کی بجائے ”گرین گارڈ“ جیسے حقوق مل جاتے ہیں۔ جب تک گنتی نہ پڑے قیدی کو راشن نہیں ملتا۔ گنتی پڑتے قیدی کو جیل کے حقوق مل جاتے ہیں اسے کھڈا ملنے کا امکان بڑھ جاتا ہے اگر قیدی کی کسی اچھی جگہ گنتی پڑ جائے تو دوسرے قیدی آ کر اسے مبارکباد دیتے ہیں اس محاورے کی سمجھ بھی آ جاتی ہے کہ فلاں کسی گنتی میں شمار نہیں۔

اڑتی

اڑتی سے مراد ہے کہ ملزم ہر روز اپنے سامان کی گھنٹی سر پر اٹھائے رات نئی کوٹھڑی میں نئے لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ آئیو الی رات کس کوٹھڑی اور کن لوگوں کے ساتھ بسر ہوگی۔ ہماری جمہوریت کو بھی اڑتی لگی ہوئی ہے اسے نہیں معلوم اس نے ہر نئے حاکم کی تبدیلی کے ساتھ کیسے گزارا کرنا ہے جمہوریت ملزم کی طرح ہر رات اجنبی چہروں کے ساتھ گزارتی ہے کبھی گورنر جنرل، کبھی صدر، کبھی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کبھی چیف ایگزیکٹو، کبھی سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کبھی جمہوریت وردی کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی وردی اتار دیتی ہے۔

پیشی

کوئی ملزم یا اہلکار کسی جرم یا نفلطی کا مرتکب ٹھہرے یا اس سے کوئی مشتبہ اور غیر قانونی چیز مثلاً منشیات، چاقو، چھری یا موبائل وغیرہ برآمد ہو جائے تو اس کو جیل سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اسے سزا دی جاتی ہے اس عمل کو پیشی کہتے ہیں۔

قصوری بند

جیل میں اگر کوئی جرم کرے تو اسے سپرنٹنڈنٹ سزا سنا تا ہے۔ ان مجرموں کو ایسی کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا ہے جو 24 گھنٹے بند رہتی ہیں۔ ان کی ملاقاتیں بھی بند کر دی جاتی ہیں۔ انہیں قصوری بند (PUNISHMENT BLOCK) کہا جاتا ہے۔ مجھے بھی بائیس دن کیلئے فوجی حکمرانوں نے اس چکی میں رکھا۔ سخت گرمیوں کا موسم تھا چکی تندور بنی ہوئی تھی میں سینٹ کے فرش پر وردی کے کاغذ بچھا کر جسم کو جلنے سے بچانے کی کوشش کرتا

تشدد کی وجہ سے جسم زخموں سے چور تھا، پتہ ہوا فرس زخموں میں چلچلاہٹ پیدا کر دیتا، مجھے آج تک نہیں بتایا گیا کہ میں نے جیل کا کون سا قانون توڑا تھا۔ میں جیل ملازموں کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا، وردی والوں پر دوسری وردی والوں کے حکم کی تعمیل لازم تھی ویسے بھی فوجی حکمرانوں کے دور میں پوری قوم تصوری چکی میں بند ہو چکی ہے۔ میرا شکوہ بے جا ہے۔ جس طرح عام زندگی میں تھانے کا خوف ہوتا ہے۔ تصوری چکی بھی جیل کا تھانہ ہے یہ جگہ جیل کی چار دیواری کے اندر خوف کی علامت ہے اگر جیل حکام کسی کو ڈرانا چاہیں تو کہتے ہیں تمہیں تصوری چکی میں بند کر دیا جائے گا یہ سنتے ہی بڑے سے بڑے مجرم کی جان ہوا ہوتی ہے اور وہ اس سزا سے بچنے کے لئے ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہو جاتا ہے 10x8 فٹ کی تنگ جگہ پر زس سے بارہ قیدی ٹھونس دیئے جاتے ہیں یہی ان کا سونے کا کمرہ ہے، یہی غسل خانہ ہے اور یہی جگہ کچن کا کام دیتی ہے سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

A...B کلاس قیدی

A کلاس جیل کا وہ حصہ ہے جس میں خاص شخصیات یعنی سابقہ وزراء وغیرہ اور B کلاس میں مختلف درجوں کے افسران اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ رہتا ہے۔ انہیں اُن کے کام کرنے کیلئے مشقتی مہیا کئے جاتے ہیں اور اُن کے رُتبے کے مطابق کچا راشن اور دیگر سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ جیل قوانین کے مطابق سپرنٹنڈنٹ جیل میں کسی جگہ کو A یا B کلاس بنا سکتا ہے۔ جب میں کیمپ جیل میں تھا تو مجھے چودہ ہفتے تک موت کی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ اس طرح عدالتی حکم سے ملنے والی ”بی کلاس“ بھی مجھے مل گئی اور سزا بھی جاری رہی اسی طرح اڈیالہ جیل میں عدالت نے مجھے اے کلاس کی سہولت سے سرفراز فرمایا مگر جیل حکام چونکہ مجھے قید تنہائی میں رکھنا چاہتے تھے انہوں نے سیکورٹی سیل کو ہی اے کلاس کا درجہ دے دیا یا حالانکہ اڈیالہ جیل، واحد جیل ہے جہاں پر A کلاس قیدیوں کے لئے ایک خوبصورت بلاک بنایا گیا ہے میں ایک سال تک وہاں جانے کی کوشش کرتا رہا مگر مجھے صرف چودہ دن وہاں رکھا گیا یہاں پر سید یوسف رضا گیلانی سمیت پندرہ بیس افراد موجود تھے جو

رات دن ایک دوسرے کو مل سکتے تھے یہ ایک طرح کی ہوٹل لائف تھی جہاں ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ویسے تو جیل کی ہر جگہ جیل ہوتی ہے مگر ان تین سالوں میں اڈیالہ جیل کے یہ چودہ دن کافی آرام دہ تھے۔

سیکورٹی سیل

خطرناک قیدیوں کیلئے پھانسی گھاٹ کیساتھ الگ سیل بنایا گیا ہے۔ یہ جیل کے اندر ایک اور جیل ہے، اسکی دیواروں پر خاردار تاریں لگا کر اس میں بجلی چھوڑ دی جاتی ہے۔ پانچ سو قیدیوں کو کنٹرول کرنے کیلئے جتنا عملہ درکار ہوتا ہے، اتنا اس ایک سیل کیلئے مخصوص کیا جاتا ہے۔ اس سیل میں رہنے والے قیدی کے رابطے پوری جیل سے منقطع کر دیئے جاتے ہیں تاکہ سیل کے اندر کے واقعات مزید خفیہ رہ سکیں۔ اب اس سیکورٹی سیل پر جدید کیمرے لگا دیئے گئے ہیں اور موصلاتی نظام کو جام کرنے کیلئے مزید مشینری نصب کر دی گئی ہے۔ میں اسی سیل کا باسی ہوں۔ مجھے اڈیالہ جیل راولپنڈی میں بھی سیکورٹی سیل میں رکھا گیا تھا۔ میرے سیل کے سامنے قصوری چکیاں بنائی گئی ہیں جہاں قیدیوں پر بے پناہ تشدد کیا جاتا تھا میں روزانہ ان کی چیخوں کو سنتا جو ناقابل برداشت تھیں میں نے جیل حرام کو سختی سے منع کیا تو انہوں نے تشدد بند کر دیا۔

میں گزشتہ تین سال سے قید تنہائی میں ہوں۔ پاکستان کا قانون کسی کو تین مہینے سے زیادہ قید تنہائی میں نہیں رکھ سکتا۔ اقوام متحدہ بھی قید تنہائی کو دنیا کی تمام سزاؤں سے سخت قرار دے کر اسکی شدید مذمت کرتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں تین سال تک کوئی قیدی تنہائی میں نہیں رکھا گیا۔ مجھ سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کو چودہ مہینے الگ تھلگ رکھا گیا، یا پھر کچھ عرصہ کے لئے میاں نواز شریف کو انک کے قلعے میں گوشہ تنہائی میسر آیا۔

ہسپتال

جیل کے اندر پانچ ہزار آبادی کا ایک پورا شہر آباد ہے۔ مریضوں کیلئے جیل میں ہسپتال بھی موجود ہے۔ جس میں میڈیکل چیک اپ کا سامان تو موجود ہے، لیکن شاید ہی کوئی چیز

ٹھیک ہو، اگر کوئی چیز صحیح ہو تو بھی اسکا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ان کا استعمال کسی کو نہیں آتا۔ جیل میں کوئی مستقل ڈاکٹر نہیں ہے۔ مجھے تو اس ہسپتال میں جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ میں ایک مرتبہ بغیر اجازت ہسپتال چلا گیا تو ڈاکٹر کے خلاف کارروائی کی گئی۔

بیڑیاں

کچھ ملزمان کو عدالت سے اور کچھ کو جیل میں بیڑیوں کی سزا سنائی جاتی ہے۔ یہ دونوں پاؤں میں کڑوں کی طرح چڑھائی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ لگی سلاخیں اوپر بیلٹ کے ساتھ کس کر کمر پر باندھی جاتی ہیں یہ بہت سخت سزا ہے۔ مسلسل بیڑیوں میں رہنے کی وجہ سے انسان اپنا بچ ہو جاتا ہے۔ ملک کی جمہوریت کو بھی اسی طرح کی بیڑیاں لگی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ملکی معیشت اپنا بچ ہو چکی ہے۔

پنچہ

مختلف قیدیوں کو جیل کے اندر اور باہر کام کروانے کیلئے بیڑیاں لگائی جاتی ہیں جو کہ "پنچہ" کہلاتے ہیں مختلف کاموں کیلئے مختلف پنچے ہوتے ہیں پنچے میں ان قیدیوں کو شامل کیا جاتا ہے جو سال چھ مہینے میں رہا ہونے والے ہوتے ہیں ان پر اعتماد کر لیا جاتا کہ وہ فرار ہو کر اپنے لئے مزید مشکلات پیدا نہیں کریں گے اس کے باوجود بارہا ایسا ہوتا ہے کہ "آزادی" کی جھلک دیکھتے ہی وہ فرار ہو جاتے ہیں ان میں سے اکثر پکڑے جاتے ہیں۔ انہیں دوسروں کے لئے درس عبرت بنانے کے لئے سخت سزا دی جاتی ہے۔ وہ لمبا عرصہ جیل کی دیواروں میں گزارتے ہیں مگر آزادی کی کشش ایسی ہے کہ پھر بھی کوئی نہ کوئی پنچے سے فرار ہوتا رہتا ہے۔

بیڑی پنچہ

جیل کے بیرونی حصہ کی صفائی کیلئے جانے والا پنچہ بیڑی پنچہ ہوتا ہے۔ (اسے سنگل والی بیڑی پہنائی جاتی ہے) اسے تم کسی فوجی حکمران کی بنائی ہوئی سیاسی جماعت سمجھ لو جو حکمرانوں کی گندگی صاف کرتی ہے اس کے بدلے میں اسے جیل کے باہر کی دنیا دیکھنے کا

موقعہ مل جاتا ہے۔ ان میں سے ایک آدھ فرار ہو جاتا تھا سنا ہے ان کو مزید قابو کرنے کے لئے امریکہ سے جدید بیڑیاں اور ہتھکڑیاں منگوائی گئی ہیں۔

باغیچہ پنچہ

جیل افسران کی کوٹھیوں میں بنے باغات کی دیکھ بھال جیل کے قیدی کرتے ہیں۔ یہ مخصوص قیدی ہوتے ہیں اور باغیچہ پنچہ کہلاتے ہیں۔ (ان کی سزائیں مختصر ہوتی ہیں)۔

مالی پنچہ

جیل کے اندر پھولوں کی کیاریوں اور گھاس وغیرہ کی صفائی ستھرائی کا ذمہ مالی پنچہ کے سپرد ہوتا ہے۔

بوٹی پنچہ

بوٹی پنچہ جیل کے باہر فصلوں میں کام کرتا ہے۔ قیدیوں کیلئے اس میں سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔

شیر پنچہ

ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور یا اونچی دکان پھیکا پکوان شیر پنچہ کوئی نامی گرامی پہلوان یا طاقتور لوگ نہیں ہوتے بلکہ تمام قسم کے گٹر اور گندگی کو صاف کرنے والے شیر پنچہ ہوتے ہیں۔

کھڈا / چری

بارکوں میں رہنے، یعنی سونے کیلئے قیدیوں کو جو جگہ دستیاب ہوتی ہے اسے کھڈا کہتے ہیں۔ چونکہ جیل میں گنجائش سے زیادہ قیدی ہیں۔ اس لئے ہر کسی کے پاس اپنا کھڈا نہیں ہوتا۔ اڑتی والے روزانہ جگہ بدلتے ہیں، اسلئے اُن کا اپنا کوئی کھڈا نہیں ہوتا۔ جیل میں آئے روز کھڈے کی وجہ سے پھڈا رہتا ہے۔ جیل میں ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ جیل میں ایک کھڈا کا مالک ایسا ہی ہے جیسا کہ ڈیفنس میں کوٹھی کا.... بھی۔ چری، کھڈے ہی کی ایک قسم ہے۔ کھڈا نسبتاً پکا اور چری مٹی کی بنی ہوتی ہے۔

کچھ بارکوں میں چار پائیاں بھی مہیا کی گئی ہیں یہ چار پائیاں کئی منزلہ ہوتی ہیں فرش سے روشندانوں تک قیدی ان پر سوتے ہیں جگہ کی کمی کی وجہ سے قیدی غسل خانے میں بھی سو جاتے ہیں اب ہر بارک میں ایک اضافی غسل خانہ بھی بنا دیا گیا ہے مگر پھر بھی غسل خانے کے باہر لمبی قطار لگی ہوتی ہے اکثر اوقات غسل خانوں میں پانی اور بجلی دونوں غائب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پوری بارک میں بدبو پھیل جاتی ہے۔

بارک اور بلاک

قیدیوں کے رہنے والی جگہ تو بارک ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی قصوری بند، خطرناک افراد، سزائے موت کے قیدی اور ایسے افراد جن کی مخالف پارٹی بھی متعلقہ جیل میں ہی ہو، انہیں علیحدہ چکیوں میں رکھا جاتا ہے۔ اُن کیلئے الگ الگ احاطوں پر بلاک بنے ہوئے ہیں۔ اس نظام کے ذریعے امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کو باسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ امریکہ بھی دنیا کو بارک اور بلاک میں تقسیم کرتا ہے۔ جو بلاک اس کا حکم نہ مانے اسے دہشت گرد کہہ کر الگ کر کے قصوری چکیوں میں رکھا جاتا ہے اس کی نگرانی کے لئے اتحادی فوجیں آ جاتی ہیں۔ قوموں کے جھگڑوں میں زبردستی ثالث بن کر اس کے وسائل پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

حوالاتی / قیدی

جن ملزمان کو سزا نہیں سنائی گئی ہوتی وہ حوالاتی اور سزایافتہ، قیدی کہلاتے ہیں۔ حوالاتی سے مشقت نہیں لی جاتی اور نہ ہی وہ قیدی کی وردی پہنتا ہے۔

ملاقات

ملاقات سے زیادہ بیٹھا لفظ قیدی کی زندگی میں نہیں ہوتا عزیزوں سے ملنے کا منظر دیکھنے والا ہوتا ہے اگرچہ قیدی اور ملنے والوں کے درمیان لوہے کی جالیاں حائل ہوتی ہیں رش کی وجہ سے ایک دوسرے کی آواز بھی صاف سنائی نہیں دیتی، پھر بھی یہ ایک جشن کا سماں ہوتا ہے عزیز واقارب قیدی کے لئے کھانے پینے کا سامان لاتے ہیں، چوری چھپے کچھ نقدی بھی دے جاتے ہیں جس قیدی کی جتنی زیادہ ملاقاتیں آئیں اسے اتنا بڑا خوش بخت سمجھا

جاتا ہے کئی قیدیوں کی سالہا سال تک ملاقاتیں نہیں آتیں اسے ملازم اور ساتھی قیدی بھی لاوارث ہونے کے طعنے دیتے رہتے ہیں اس کی زندگی قابل رحم ہوتی ہے مگر جیل میں رحم کہاں۔

پرچہ بولنا

جن کی ملاقات آتی ہے، اُن کی فہرست ایک پرچے پر درج ہوتی ہے۔ پھر اس پرچے کو بارکوں میں پکارا جاتا ہے۔ اگر بارکوں میں کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا کوئی خاص اعلان کرنا مقصود ہو تو کوئی فرد اٹھ کر اونچی آواز میں پرچہ بولتا ہے۔

ڈاک

عام ڈاک کے علاوہ جیل کے اندر جو کوئی قیدی یا ملازم غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو یا مخبریاں کرتا ہو وہ ڈاک کہلاتا ہے۔

نگرانی کا نظام پترا

پترا، دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک جیل میں قیدی انواہ پھیلانے کو پترا کہتے ہیں۔ دوسرا جیل کی چار دیواری کے اندر کوٹ موٹے کیساتھ جو ملازم ڈیوٹی دیتے ہیں وہ سب اچھا کی رپورٹ بذریعہ پترا ڈیوٹی تک پہنچاتے ہیں، جو ایک ملازم سے دوسرے ملازم تک، ایک لوہے کے پترے کے ذریعے ہوتا ہے، جس پر کوٹ موٹے کا نمبر لکھا ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے پترا، ڈیوٹی میں دیر سے پہنچے تو اس کا سخت نوٹس لیا جاتا ہے۔ یہ پترا چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے۔ یہی نظام، درحقیقت، جیل کی چوکی اور نگرانی کا نظام ہے۔ پترے والوں پر کنٹرول کے لئے وائرلیس کے ذریعے نگرانی کی جاتی ہے۔ اسی وائرلیس سے بارکوں اور بلاکوں میں پہرہ دینے والے عملے کی نگہداشت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ پل پل کی خبررات کے ڈیوٹی افسر اور اسی طرح دن کے ڈیوٹی افسر تک پہنچائی جاتی ہیں۔

مشقت

عدالت سے قید بامشقت کی صورت میں قیدی کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ اُنکی

مختلف ڈیوٹیاں لگادی جاتی ہیں۔ کسی کی لنگر خانہ میں، فیکٹری میں پڑھانے، یا صفائی کیلئے، اس کام کو مشقت کہتے ہیں۔

ٹوری

ٹوری لفظ ٹور یعنی ٹھاٹھ سے ہے، نام سے ہی ظاہر ہے کہ ٹوری لوگ بڑے ٹور سے جیل میں وقت گزارتے ہیں۔ ٹوری بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو جیل میں دنیا کی ہر چیز دولت سے خرید لیتے ہیں، دوسرے اپنی دھونس سے..... جیل حکام انکے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے کام کرنے کیلئے مشقتی موجود ہوتے ہیں، جو صرف دو وقت کے کھانے یا سگریٹوں کی ڈبی کیلئے سارا دن ٹوریوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں پھر سارے معاملے کو نیوورلڈ آرڈر کے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ اگر نیوورلڈ آرڈر کو جیل سمجھ لیں تو دنیا کے تمام فوجی حکمران ٹوری لگتے ہیں، مصر کے حسنی مبارک سے لے کر ضیاء الحق، صدام حسین، شہنشاہ ایران، معمر قذافی اور ہمارے تمام فوجی حکمران اس میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ٹور خریدنے کے لئے ٹوری اپنی قوم اور ملک کے مفاد جیل یعنی سپر پاورز کے ہاتھوں میں بیچ دیتے ہیں قوم ان کی مشقتی بنا دی جاتی ہے جو صرف دو وقت کی روٹی یا سگریٹ کی ڈبی کے لئے ساری عمر ٹوریوں کی خدمت کرتی ہے۔ جیل میں جو ٹوری دھونس سے کام کرواتے ہیں ان کا حشر آخر میں صدام حسین، معمر قذافی، انور سادات اور ضیاء الحق جیسا ہوتا ہے یا وہ رام ہو جاتے ہیں یا ان کا وجود مٹا دیا جاتا ہے۔

مشقتی

یہ وہ غریب قیدی ہوتے ہیں جو دوسرے قیدیوں کی خدمت کر کے گذر بسر کرتے ہیں۔ A اور B کلاس کے قیدیوں کی خدمت کیلئے جیل قواعد کے مطابق ایک ایک مشقتی فراہم کیا جاتا ہے۔

سوال

عموماً سوال کرنے والے کو شکایت کنندہ سمجھ کر اس کی ٹھکانی کی جاتی ہے۔ سوال کا

مطلب ہے کہ کسی سے کوئی بات پوچھنا۔ جیل خانہ جات میں اگر کسی کو سپرنٹنڈنٹ سے کوئی عرضداشت کرنا ہو تو اسے دورہ کے دوران سوائی بن کر سوال کرنا ہوتا ہے۔

چکر

چکر جیل کا اعصابی مرکز ہوتا ہے، مختلف بارکوں کے دروازے ایک گول سی جگہ پر کھلتے ہیں، اسے چکر کہتے ہیں۔ اس جگہ چیف چکر بیٹھتا ہے۔ جیل کے نظام میں اس جگہ کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں سے ایک ایک فرد کی نگرانی کی جاتی ہے۔ قیدیوں کو چکر میں سزا دی جاتی ہے اس لئے چکر کا رعب قیدیوں کے ذہن پر ہر وقت مسلط رہتا ہے۔

میٹ

میٹ (MATE) نام سے ہی ظاہر ہے معاونت کرنے والا۔ ہر بارک کے انچارج کا ایک میٹ ہوتا ہے جو کہ قیدی ہی ہوتا ہے۔ اڈیالہ جیل میں قیدی اپنا میٹ منتخب کرتے ہیں مگر منتخب وہی ہوتا ہے جو جیل حکام کا ٹاؤٹ ہوتا ہے، اسے تم فوجی حکمرانوں کی حقیقی جمہوریت سمجھ لو۔

ٹہلائی

جیل میں چہل قدمی کرنا ٹہلائی کہلاتا ہے۔ باہر کی دنیا ٹہلائی کی اہمیت کا تصور نہیں کر سکتی کیونکہ وہاں چلنے پھرنے پر پابندی نہیں ہوتی جیل میں خواہ محدود جگہ پر ہی سہی ایک گھنٹہ چلنے پھرنے کی اجازت مل جائے تو اسے بہت بڑی عیاشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ ٹہلائی بند کر دینا بہت بڑی سزا ہوتی ہے۔ قصوری بند کو کوئی ٹہلائی نہیں ملتی۔ سزائے موت کے قیدیوں کو ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کو ٹہلائی ملتی ہے۔ بقیہ 22 گھنٹے وہ اپنی کوٹھڑیوں میں بند رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اکثریت بیمار ہو جاتی ہے ہمارے عدالتی نظام کی وجہ سے کئی سالوں میں اپیل کی شنوائی نہ ہونے کی وجہ سے اکثر قیدیوں کی ٹانگیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ چھوٹی سی جگہ پر چلنے پھرنے کیلئے الگ ریٹ مقرر ہیں۔ (مسلل بند رہنے کی وجہ سے کئی ذہنی مریض بن جاتے ہیں)

لنگرخانہ

جیل کے سارے کھانے کا انتظام لنگرخانہ میں ہوتا ہے۔ پانچ ہزار قیدیوں کے لئے کھانے کا انتظام آسان کام نہیں جیل کام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھیں کوئی قیدی بھوکا نہ رہے جیل کے کھانے کو بہتر بنانے کے لئے ہر حکومت کوشش کرتی ہے اور یہ بہتری نظر بھی آتی ہے لیکن جیل انتظامیہ جو کھانا قیدی کو مہیا کرتی ہے وہ عموماً بہت ناقص ہوتا ہے قیدی شور بے کوڈیزل کہتے ہیں اور چائے کو کچھ اور تقریباً تمام قیدی اپنے کھانے کا انتظام خود کرتے ہیں اور جیل کے کھانے پر انحصار نہیں کرتے اپنا کھانا تیار کرنے کے لئے انہیں بے شمار رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جیل کی زبان کی طرح لنگر کی بھی اپنی ہی ایک زبان ہے۔

(a) لانگری

لنگرخانہ میں کام کرنے والا ہر مشقتی لانگری کہلاتا ہے۔

(b) گنڈ مار

آٹا گوندھنے والا۔

(c) پیڑچی

روٹیوں کیلئے پیڑے بنانے والا۔

(d) ٹوک

آٹے کے پیڑے کو ٹوک کہتے ہیں۔

(e) وزنی

ہر ٹوک کا وزن برابر رکھا جاتا ہے۔ وزن کرنیوالا وزنی کہلاتا ہے۔

(f) پکوا

تندور میں روٹی لگانیوالا۔

(g) گنڈی مار

تندور میں سے روٹی نکالنے والا۔

(h) تھمب

جیسے جیسے روٹیاں تیار ہوتی جاتی ہیں۔ ان کو اکٹھا کرتے ہیں۔ جب 40 روٹیاں اکٹھی ہوتی ہیں ان کو تھمب کہتے ہیں۔

(i) تھامی

تھمبوں کو گنے والا تھامی کہلاتا ہے۔

(j) سبزی پنچہ

دوسرے پنچوں کی طرح لنگر میں بھی سبزی کاٹنے کیلئے سبزی پنچہ موجود ہے۔

(k) دیگچی

گھروں میں جس برتن میں کھانا پکاتے ہیں اسے دیگچی کہتے ہیں۔ لیکن جیل میں کھانا پکانے والے کو دیگچی کہتے ہیں۔

(L) صفائی پنچہ

لنگر میں برتن، دیگیں اور دیگر صفائی کرنے والا صفائی پنچہ کہلاتا ہے۔

ٹانگہ

جیل کافی بڑے ایریا میں پھیلی ہوئی ہے لیکن اس میں کسی سواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ٹانگہ اس شخص کو کہتے ہیں جو جیل میں سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ اس کو معمولی اجرت مل جاتی ہے، جس سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتا ہے۔ تم نے ٹانگے کی سواری والی سیاسی جماعتوں کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ پچھلے انتخابات میں ایک پارٹی نے اپنا انتخابی نشان ہی ٹانگہ لے لیا تھا وہ بھی اقتدار کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہے لیکن اس نے معاوضہ بھاری وصول کیا ہے اب دیگر ٹانگہ بانوں سے اس کا اجرت

کی تقسیم رتنا زرع سدا ہوگا۔ آخر کر

نفری

نفری کا لفظ خود اپنا معنی بتا رہا ہے..... لیکن جیل میں ملزمان کو جو کھانا دیا جاتا ہے وہ نفری کہلاتا ہے۔ جب لانگری نفری لاتا ہے تو ہر کوٹھری میں پوچھتا ہے کہ کتنی نفری۔ ہر ملزم کی نفری دو روٹی اور ایک ڈلو پر مشتمل ہوتی ہے۔ سالن ایک بالٹی میں ہوتا ہے جسے نکالنے کیلئے ایک چائے والا ڈونگہ ہوتا ہے جو ڈلو کہلاتا ہے۔

کوٹ موقعہ

جیل پناہ یعنی جیل کی فصیل کو کوٹ موقعہ کہتے ہیں۔

کھڈے وال

لفظ "وال" اصل میں پارٹنرشپ کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسا عام زبان میں پارٹنر کو "بھائی وال" کہتے ہیں۔ اسی طرح جیل میں دو یا اس سے زیادہ قیدی جب ایک ہی کھڈے پر رہتے ہیں، گویا کہ وہ ایک کھڈے کو شیئر کر رہے ہیں، اس لئے کھڈے وال کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی کوٹھری یا چکی میں رہنے والے چکی وال کہلاتے ہیں۔ اقتدار کی بچی کچھی ہڈیوں پر گزارہ کرنے پر فوجی حکمران کی حکومت میں کھڈے وال بن جاتے ہیں اور بعد میں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

ہانڈی وال

کھڈے وال جب اپنے کھانے پینے کے اخراجات بھی شیئر کریں تو ان کے درمیان ہانڈی والی ہو جاتی ہے۔ ہانڈی اصل میں مٹی کا سالن پکانے والا وہی برتن ہے۔ جسے دیگھی کہتے ہیں۔

گارد

گارد جیل اہلکاروں کے ایک گروپ کو کہتے ہیں۔ سپاہیوں کی ہر چار گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی ہے۔ جیل ڈیوٹی سے فارغ ہونے والے سپاہی باہر اپنی بارکوں میں چلے جاتے ہیں اور تازہ دم سپاہیوں کی گارد اندر آ جاتی ہے۔ کسی سپاہی کی ڈیوٹی بارہ گھنٹے سے کم نہیں۔

بارک بندی

قیدیوں کی ایک بارک سے دوسری بارک آمدورفت پر پابندی ہوتی ہے، اس لئے بارکیں بند ہونے کو بارک بندی کہتے ہیں۔

تلاشی

دوروں کی طرح قیدی تلاشیوں سے بھی تنگ رہتے ہیں۔ تلاشی ہفتہ یا پندرہ دن بعد ہوتی ہے۔

جامہ تلاشی

جامہ تلاشی میں تو جیل حکام کی کوشش ہوتی ہے کہ قیدیوں کی روح بھی نکال کر لے جائیں۔ قیدیوں کے پرائیویٹ کپڑے، شیشے کی کوئی چیز، کاغذ پنسل، موبائل وغیرہ، غیر قانونی تصور کئے جاتے ہیں اور ان کی برآمدگی پر سزا ملتی ہے۔

اسی سے ملتی جلتی تلاش آج کل تیسری دنیا کے ممالک کے وزرا بے اعظم اور صدور کی امریکہ کے ہوائی اڈوں پر ہو رہی ہے جس طرح ہم قیدی اس توہین کو دوسرے قیدیوں سے چھپاتے ہیں اسی طرح ہمارے رہنما اپنے ساتھ ہونے والے سلوک یا بدسلوکی کو اپنی قوم سے چھپاتے ہیں۔

ٹکٹ

قیدی کی جیل آمد کی تاریخ، اس کے جرائم، حکومت کی طرف سے یا اسکی اپنی تعلیمی کاوشوں کی وجہ سے حاصل ہونے والی معافیاں، جیل کی پیشیاں، ساری معلومات ایک جگہ پراکٹھی کی جاتی ہیں۔ جس صفحہ پر یہ تفصیل درج ہوتی ہے، قیدی ٹکٹ کہلاتا ہے۔ یہ قیدی کا آدمیوں کے ہاتھ سے لکھا ہوا اعمال نامہ ہے۔ غالب کو شکایت تھی کہ فرشتوں نے ہمارا اعمال نامہ لکھ کر ہمیں پھنسا دیا اگر کوئی آدمی کرانا کا تبین کی جگہ ہوتا تو ہمارے جذبات کو سمجھ کر اعمال نامے کو سیاہ نہ کرتا ہم اہل قفس کا تجربہ آدمی کے لکھے ہوئے اعمال نامے کے بارے میں خاصا تلخ ہے غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ۔

چالان

قیدی کا ایک جیل سے کسی دوسری جیل میں منتقل ہونا چالان کہلاتا ہے۔ بعض اوقات قیدی اپنے گھر سے دوسرے شہر میں جیل کاٹ رہا ہوتا ہے تو وہ محکمہ جیل کے اعلیٰ افسران یا ہوم منسٹر وغیرہ سے اپنے شہر کی جیل میں چالان کی درخواست کرتا ہے۔ لیکن اکثر جیل انتظامیہ بطور سزا قیدی کے رویے یا کسی بڑی پیشی کی وجہ سے اسکا چالان کسی دور دراز شہر میں نکال دیتی ہے۔ بغیر کسی وجہ کے چالان کا نکل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ قیدی کے ٹکٹ پر صرف انتظامی امور میں دخل اندازی لکھ دیا جاتا ہے۔ حکام سے صاف گوئی کا نتیجہ تو تمہارے والد کی صورت میں سامنے ہے۔ اڈیا لہ جیل سے میرا چالان کوٹ لکھتے بطور سزا نکالا گیا ہے۔ جلا وطن سیاستدان کا بھی باہر کا چالان کاٹا گیا۔ تم اب چالان کٹنے کا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔

فیکٹری

سزایافتہ قیدی کو مشقت کرنا ہوتی ہے، اس ضمن میں، جیل کے وسیع ایریا میں فیکٹری موجود ہے۔ جس میں جیل ملازمین کے سامان رکھنے کے لئے لوہے کے بکس بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قالین سازی کیلئے اڈے لگے ہوئے ہیں۔ جیل مینوئل میں قیدی کو فیکٹری میں مشقت کرنے کے معاوضے کا ذکر ہے، عملی طور پر مشقت کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

سب اچھا ہے

جس طرح ہر ملک کی ایک سرکاری زبان ہوتی ہے اسی طرح جیل کی سرکاری زبان ”سب اچھا کہلاتی ہے“ شام کو جب تمام قیدی بارکوں اور چکیوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں تو اس کو سب اچھا کہتے ہیں جب تک سب اچھا کی رپورٹ ڈیوڑھی میں نہیں پہنچتی۔ جیل حکام ڈیوٹی چھوڑ کر گھر نہیں جاسکتے عصر کے بعد سے ہیڈ وارڈ اپنی بارک کے قیدیوں کو اندر کی طرف ہانکنا شروع کر دیتے ہیں قیدی ایک لمحہ باہر رہنے کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر

اس وقت ہیڈ وارڈز کا رویہ درشت ہو جاتا ہے اگر کوئی وارڈ ہر وقت سب اچھا کی رپورٹ چکر میں نہ پہنچا سکے تو حکام اس کی سخت بے عزتی کرتے ہیں۔

فوجی اور آمرانہ حکومتوں میں بھی ساری قوم مہنگائی اور بے روزگاری کی چکی میں پس جاتی ہے مگر اوپر سب اچھا ہوتا ہے۔

سب اچھا جیل کے ہر اچھے برے کام میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً اگر کوئی قیدی سہولتوں کے حصول کے لئے جیل والوں کی مٹھی گرم کر دے تو کہا جاتا ہے اس کا سب اچھا ہو گیا ہے سزا سے بچنے اور قصوری بند ہونے سے بھی سب اچھا کام آتا ہے۔

پہلے جیل میں رات کی گشت کرنے والا عملہ ایک دوسرے سے نعر لگاتا تھا ”سب اچھا“ دوسری سے دوسرا گروہ جواب میں سب اچھا کہتا تھا اس طرح چوکیدار اور چوکی کا نظام چلتا رہتا تھا ضیاء الحق کے دور میں سب اچھا کا نعرہ ختم کر دیا گیا اب ایک طرف سے آواز آتی ہے یا اللہ خیر دوسری جانب سے یہی جواب آتا ہے اگر کوئی ہنگامی حالت ہو یا باہر کے کسی افسر کے چھاپے کا خطرہ درپیش ہو تو اس نعرے میں یا اللہ خیر کے ساتھ یا محمد خیر کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس سے متعلقہ عملہ سمجھ جاتا ہے کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

تم اندازہ کر سکتی ہو کہ جیل کی تکلیف دہ زندگی میں جب سب اچھا کہا جاتا ہے تو یہ زخموں پر نمک چھڑکنے کے برابر ہوتا ہے اسی طرح ملک کے حکمران جب غربت بیماری نا انسانی اور امن و امان کی خرابی، جمہوریت اور آئین کا قتل کر کے سب اچھا کی رپورٹ دیتے ہیں تو آپ آزاد لوگوں اور ہم قیدیوں کی زندگی میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

وارنٹی (WARRANTY)

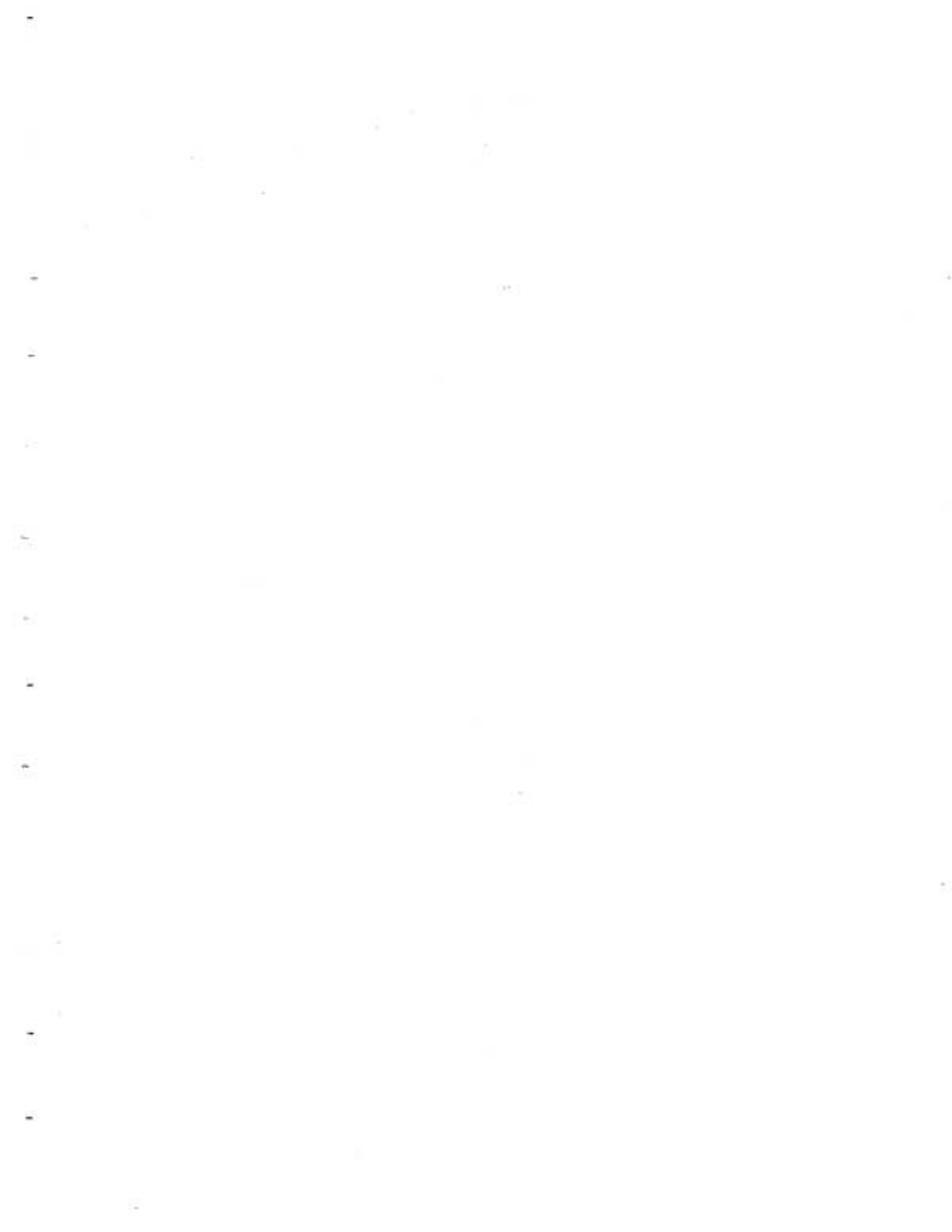
قید کار ریکارڈ رکھنے کے لئے الگ سٹاف مقرر ہے حوالاتیوں کا انچارج الگ ہوتا ہے اور قیدیوں کا الگ۔ یہ انچارج وارنٹی کہلاتا ہے۔ یہ عموماً سات گریڈ کا ملازم ہوتا ہے مگر قیدیوں کے لئے یہ اہم ترین افسر سمجھا جاتا ہے یہ قیدیوں کی رہائیوں کا ریکارڈ رکھتا ہے قیدیوں میں یہ تصور گہرا ہو چکا ہے کہ وارنٹی کسی کو رہا کرنا چاہے تو زیادہ معافیاں ڈال دیتا ہے

جس سے قید مختصر ہو جاتی ہے اب اس شعبے کا سربراہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (لیگل) کو بنایا گیا ہے لیکن عملی طور پر اب بھی وارنٹی ہی موثر سمجھا جاتا ہے قیدی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کب رہا ہونا ہے۔ جب تک وارنٹی کی مٹھی گرم نہ کی جائے عدالتی فیصلے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور قید ختم ہونے کو نہیں آتی اس شعبے کو کمپیوٹرائز کرنا انتہائی ضروری ہے تاکہ ہر قیدی کو معلوم ہو کہ اسے کب رہا ہونا ہے۔

جیل خانے سے زندگی سنوارنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ تربیت کے ذریعے ایسا جیل سٹاف تیار کرنا ہوگا جو حسن سلوک سے قیدیوں کے ذہن کو مثبت رویہ اپنانے پر مجبور کر دے سٹاف کے ڈیوٹی اوقات کار کو بہتر کرنے سے مثبت تبدیلی آسکتی ہے ملازمین کی تنخواہیں نہ ہونے کے برابر ہیں نہ ہی انہیں صحت کا تحفظ حاصل ہے اور نہ ہی ان کے بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام ہے جیلوں کو اصلاح خانوں میں تبدیل کرنے کے لئے عدالتی نظام کی اصلاح از حد ضروری ہے اس مختصر سی تحریر سے جیل کی زندگی کے چند گوشے بے نقاب ہو سکتے ہیں باقی پھر سہی۔

والسلام!

تمہارا والد!



ساری دنیا میرا گاؤں

میرا گاؤں مخدوم رشید ایک استعارہ ہے جب میں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو وہاں بچیوں کا پرائمری سکول تھا اور بچوں کے لئے ایک ہائی سکول۔ اب وہاں لڑکیوں اور لڑکوں کے ڈگری کالجز ہیں دو ہائی سکول اور کئی مڈل اور ماڈل سکول۔ گاؤں کی ساری گلیاں پختہ ہو چکی ہیں۔ ٹیلی فون، سوئی گیس اور بجلی موجود ہے۔ صحت کے تحفظ کے لئے پورے علاقے میں مثالی ادارے قائم ہیں۔ عالمی ادارہ صحت نے پاکستان میں جو پانچ مراکز قائم کئے ہیں ان میں سے ایک مخدوم رشید میں واقع ہے۔ اردگرد کے علاقے میں میں نے ایک سو کے قریب ہائی سکول اور دیگر ادارے قائم کرائے ہیں۔ مخدوم رشید سے جو لوگ سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں گئے وہ غربت کے جالی سے نکل آئے ہیں۔ ان میں سے کئی ہم سے بھی زیادہ دولت مند ہیں اس ترقی کے باوجود کوئی غیر زمیندار قومی اسمبلی میں تو کجا یونین کونسل کے ناظم کے الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے ملک میں ایک غیر تحریری آئین موجود ہے جس نے پاکستان کے چاروں صوبوں کے محنت کشوں کو قومی دھارے میں شامل ہونے سے روک رکھا ہے۔ شہروں میں کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں مگر دیہاتوں کا غیر زمیندار طبقہ ابھی تک بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہے۔ انہیں پاکستان کی آدھی شہریت ملی ہوئی ہے۔

جمہوری عمل تمام طبقات کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد دیتا ہے۔ دنیا کی انقلابی کونسلوں نے بھی مساوات کا دعویٰ تو کیا ہے مگر چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ دعویٰ عمل کی دنیا میں ایک سراب ثابت ہو وقت نے ثابت کیا ہے کہ ووٹ کی طاقت انقلاب کی گولی سے دیر پا اثر مرتب کرتی ہے، کم از کم میں نے عملی سیاست میں یہی سیکھا ہے۔ جب تک غریب کو فیصلوں میں شریک نہیں کیا جائے گا کوئی معاشرہ فلاحی معاشرہ نہیں کہلائے گا اور جب تک محنت کش کو احترام نہیں ملے گا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ گاؤں کے لوگوں کے نام خطوط میں اسی سوچ کو پیش نظر رکھا ہے۔

گلوبل ولیج کی کہانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

میں نے چند خطوط گاؤں کے ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جو شب و روز کی محنت سے گاؤں کو خود کفیل بناتے رہے۔ ان میں سے کچھ لوگ زندہ ہیں اور کچھ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کے حالات سے باخبر ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کے پیشے کو اس کی ذات بنا دیا گیا ہے اور پھر ذات پات کی جکڑ بند یوں میں ان کی پہچان گم ہو گئی ہے وہ راجپوت، کچھی، بلوچ، بھٹی، ملہانس کی بجائے صرف کمی بنا دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے نام کو اس قدر بگاڑا جاتا ہے کہ ان کے نام کی وجہ سے برگزیدہ ہستیوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا مثلاً خدا بخش صرف خدا یا کھدو بن جاتا ہے غلام مصطفیٰ میتو ہو جاتا ہے عمر امرا اور علی لئی میں بدل دیا جاتا ہے حسین حسینا اور رسول رسول پکارے جاتے ہیں۔ یہ صرف ایک گاؤں کی کہانی نہیں بلکہ پاکستان کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں رہنے والے کچلے ہوئے طبقوں کی نسلوں کی کہانی ہے۔ اب تو پوری دنیا گلوبل ولیج کہلاتی ہے۔ اس بڑے گاؤں کی کہانی بھی میرے گاؤں مخدوم رشید سے مختلف نہیں۔

یہ ایک ایسے صحرا کی داستان ہے جس میں کوئی شجر سایہ دار نہیں، کڑی دھوپ کے اس سفر میں نہ جانے اور کتنی نسلیں در بدر ٹھوکریں کھاتی رہیں گی۔ گاؤں کے کسان اور چھوٹے زمیندار کی زندگی اپنے جانوروں کی زندگی سے قدرے بہتر ہوتی ہے وہ اکٹھے رہتے ہیں اکٹھے کھاتے ہیں اور ایک تالاب سے پانی پیتے ہیں اور ایک ہی چھپر کے نیچے سو جاتے ہیں۔ پورے ملک میں ایک بھی کسان ایسا نہیں ملے گا جس کی کمر پر قرصوں کا بوجھ نہ ہو۔ وہ سارے ملک کے لئے اناج پیدا کرتا ہے مگر خود بھوکا رہتا ہے اس کے بچے کاشتکاری میں

شریک ہو کر اس کا بوجھ بانٹے ہیں اور تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ غربت اور بیماریوں نے اسے لاچار کر دیا ہے۔ اب تو کسانوں کی خودکشیاں ایک مسئلہ بن گئی ہیں۔ مگر میں خطوط میں صرف ان لوگوں کا ذکر کر سکا ہوں جنہیں بھوک کے ساتھ توہین آمیز زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج بھی ہاتھ سے کام کرنے والوں کی محنت سے دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس بھی ہمارے گاؤں کے محنت کشوں کی زندگی کو بھوک اور توہین کے آمیزے کی گرفت سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اسلام سمیت تمام مذاہب کی انسانی مساوات کی تلقین بھی اس سنگلاخ زمین سے برابری اور انصاف کی فصل نہیں اگا سکی۔ جب نظر اٹھا کر پوری دنیا کے مظلوموں کی طرف دیکھتا ہوں تو دل درماغ جلنے لگتے ہیں۔ ممبئی کی آدھی آبادی فٹ پاتھوں پر سوتی ہے اور کولکتہ میں ایک تہائی کی جھونپڑیاں مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ ان پر ترپال کی چھت ڈال دی جاتی ہے۔ کیا ممبئی کو ممبئی کہنے سے اور کولکتہ کو کولکتہ کہنے سے ان غریبوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے؟ میں نے اپنے گاؤں کے لوگوں کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہاں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ غریبوں کے سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ ہم ان سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنی مٹی سے محبت کریں اور اس سے وفا نبھائیں جو مٹی ان کی ہے ہی نہیں اگر وہ اس سے محبت کئے جا رہے ہیں تو یہ ان کا اس دھرتی پر احسان نہیں تو کیا ہے؟

ہر مذہب نے غریبوں کی خدمت کی تلقین کی ہے بادشاہت کے نظام میں اچھا بادشاہ اسی کو کہا گیا۔ جس نے کچلے ہوئے طبقے کا خیال رکھا۔ کیونکہ کاتو دعویٰ ہی یہی ہے کہ وہ غریبوں کا نظام ہے۔ نبیوں کی بعثت کا مقصد خدا کی عبادت کے علاوہ مساوات پر مبنی معاشرے کی تشکیل تھی۔ ہر پیغمبر نے اپنے عمل سے محنت کی عظمت کا درس دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کسان تھے، وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام جو لاپے تھے، وہ کپڑا بنتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام لوہار تھے، اللہ نے انھیں زرہ بکتر اور تلواریں بنانے کا علم دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سارا خاندان ترکھان تھا، وہ بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام

نے فرمایا کہ تمام انبیاء نے چرواہے کا کام کیا۔ کوئی ایسا بنی نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ حضور ﷺ نے بھی کئی سال بکریاں چرائیں۔ حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا رزق اپنے ہاتھ سے کماتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہما قصاب تھے۔ گوشت بیچتے تھے۔ حضرت سیدنا حباب رضی اللہ عنہ لوہار پیشہ تھے۔ حضرت ایوب انصاری جو لالہ ہے تھے، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تیر بنا کر بیچا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مزدوری کرتے تھے اذحر کی لکڑیاں چن کر لاتے اور مدینہ میں فروخت کرتے۔

ہمارے معاشرے میں کام کرنے والوں کو نہ صرف معاشی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ انہیں حقیر سمجھ کر ان سے توہین آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں کمزوروں کا استحصال صدیوں سے جاری ہے۔ کوئی مذہب کوئی نظام اس معاملے میں قطعی کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ان طبقات کی عزت اور توقیر تب ہی بحال ہوگی جب انکی رائے کو اہمیت دی جائے گی۔ ان کے دوٹ کا حق انہیں دیدیا جائیگا اور وہ بھیک مانگنے والے کے بجائے احتساب کرنیوالے بن جائیں گے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے کمزوروں کا ساتھ دیکر انہیں بالا دست کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونوں کے ظلم سے انسان کو نجات دلائی۔ حضرت ابراہیم نے نمرود کی خدائی کو چیلنج کیا۔ تمام انبیاء کا ساتھ دے ہوئے طبقات نے دیا اور وہ انبیاء علیہم السلام کے یمن و یسار بن گئے۔ حضور ﷺ نے غلاموں کو آقا کر دیا، عورت کی کمزوری کو طاقت میں بدل کر مکہ کے سرداروں کی خدائی کو چیلنج کیا۔ حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے ارد گرد کمزور طبقات کا جگمگٹھا تھا، پے ہوئے طبقات کی خدمت انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ ان کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے جان دینا شہادت ہے۔ میں نے جن حضرات کے نام خط لکھے ہیں یہ ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اگر ان طبقات کے دروازے تک تمام سہولتیں نہ پہنچیں تو پاکستان کیسے ترقی کریگا، پاکستان تو نام ہی انہی لوگوں کا ہے۔ ترقی پست کو بالا کرنے کا نام ہے۔ انفرادی ترقی میں امیر امیر سے امیر تر ہو جاتا

ہے مگر معاشرہ اس ترقی کی برکات سے محروم رہتا ہے بلکہ انفرادی ترقی معاشرے میں ناہمواری، محرومی اور تلخی پیدا کرتی ہے۔ پست طبقوں کی اجتماعی ترقی ہی ترقی کہلا سکتی ہے۔ اسی ترقی سے کسی ملک یا معاشرے کی ترقی کو ماپا جاسکتا ہے۔

یہاں جیل کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے یہ احساس شدید ہو گیا ہے کہ میں ان لوگوں کیلئے کچھ نہ کر سکا جنہوں نے اپنی ہڈیاں اس ملک کو بہتر سے بہتر بنانے میں گھلا دیں چونکہ میں ان تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے یہ ذمہ داری تمہیں دیتا ہوں کہ تم یہ خطوط ان تک پہنچا دینا، مجھ سمیت جن کا احترام کرنا معاشرہ آج تک نہیں سیکھ سکا۔ اس بات کا اندازہ تم میری تحریروں سے بھی با آسانی کر سکو گی۔ میں نے اپنے خطوط میں کہیں انہیں آپ کہہ کر مخاطب کیا ہے اور کہیں تو نگار پر اتر آیا ہوں اگر مجھ جیسے "روشن خیال" کا یہ حال ہے تو معاشرے کے خداوندان تضاد و قدر کا "حسن سلوک" ان سے کیسا ہوگا؟

والسلام!

تمہارا باپ!

صدرِ پاکستان رانا عبد الوحید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

محترم جناب رانا عبد الوحید صاحب!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

معذرت خواہ ہوں کہ آپ سے کوسوں دور ایک ایسی جگہ پر ہوں جہاں سے آپ تک خود نہیں پہنچ سکتا، اس لئے خط کا سہارا لیا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا، آپ کی منفرد شخصیت میرے سامنے تھی۔ آپ کی بیٹھک کی دیواروں پر قائد اعظم، علامہ اقبال، لیاقت علی خان، مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اور تاج محل آگرہ کی تصویریں فریم میں لگی ہوئی تھیں۔ میرے ذہن میں آپ کی شخصیت کا پہلا تاثر ایک خوش لباس، سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص کا ہے جس کے گھر میں پاکستان کی کامیابی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ آپ کے والد محترم نے تعلیم کیلئے آپ کو علی گڑھ بھیجا۔ میرے دادا مخدوم نور چراغ شاہ کا تعاون بھی اس سلسلے میں شامل تھا۔ آپ نے قیام علی گڑھ کے دوران خود کو تحریک پاکستان کیلئے وقف کر دیا۔ میری یادداشتوں میں آپ ایک ہمدرد انسان کے طور پر محفوظ ہیں۔ 56-1955ء کی بات ہے آپ کے دماغ سے ابھی قیام پاکستان کا نشہ نہیں اُترا تھا کہ آپ نے گاؤں کے چھوٹے موٹے بہبود کے کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ آپ نے ایک انجمنِ رفاہ عامہ کے نام سے بنائی اور کہنا شروع کیا کہ گاؤں میں بیٹھاپانی نہیں ہے اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات تھی کیونکہ ایک پسماندہ علاقے میں ٹینکی کا تصور ہی بعید تھا۔ اُمراء کے طبقے نے اسے دیوانگی کا نام دیا، غریب آدمی تو کڑوے، بیٹھے اور آلودہ پانی کا فرق محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ باخبر لوگوں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ دُور دراز سے مشکوں میں پانی بھر کر لانے والی عورتیں ایک دن ٹونٹی کھولیں گی اور پانی اُن کے چولہے تک پہنچ جائیگا۔ مجھے یاد ہے آپ نے گاؤں کے ہر کنویں سے ماہرین کی نگرانی میں پانی کے نمونے حاصل

کئے اور لاہور جا کر ان کا لیبارٹری ٹیسٹ کرایا، یہ پانی مضر صحت نکلا۔ آپ ان رپورٹوں کو اعلیٰ حکام کے سامنے رکھ دیتے۔ پھر آپ نے ان رپورٹوں کو اخبارات میں شائع کر دیا۔ آپ کی دیوانگی رنگ لارہی تھی، مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان سرگرمیوں کیلئے آپ کے پاس وسائل نہ تھے، میں بہت کم عمر تھا۔ آپ کے خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا، میں بھی آپ کے اس مشن میں شامل ہو گیا جو کچھ مالی طور پر کر سکتا تھا میں نے کیا۔ آپ کے پاس کرایہ تک نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے پاس اپنے کپڑے بھی نہیں رہ گئے تھے۔ آپ اس کے باوجود ہر جگہ پہنچتے اور حکام کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ بیٹھے پانی کی ٹینکی منظور ہو گئی۔ جب پانی کی لائنیں بچھائی جا رہی تھیں تو یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ لگتا تھا۔ پائپ بچھانے والوں نے ہر بااثر فرد کے گھر کے ارد گرد پائپ بچھا دیئے آپ کے گھر میں سب سے آخر میں پانی آیا۔ اس دوران ایک جانکاہ حادثہ ہوا۔ ارد گرد بچھائے گئے پانی کے پائپ پھٹ گئے اور آپ کا گھر اس پانی کی زد میں آ کر بلبے کا ڈھیر بن گیا۔ آپ کے گھر کا ملبہ سا لہا سال تک پڑا ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آپ نے پھر ایک اور بات کہنا شروع کی کہ اس گاؤں میں بجلی ہونی چاہئے۔ گاؤں کا زمیندار طبقہ آپ کا مذاق اڑاتا تھا۔ کچھ کہتے تھے کہ بجلی آئے گی تو وہی پنکھا ہماری رعایا کو بھی ہوا دے گا اور ہمیں بھی۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسی بجلی۔ کچھ کہتے تھے ہمارے گاؤں میں بجلی پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ کچھ کہتے تھے ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، میں خود ان دنوں لائٹن کے سامنے بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ آپ ملتان سے 20 کلومیٹر دور واپڈا کی سروے ٹیم کیساتھ پیدل چل کر گاؤں تک آتے۔ کبھی جہانیاں کا 15 کلومیٹر راستہ تاریں کھینچتے ہوئے طے کرتے، کبھی ٹھٹھہ، صادق آباد سے آنیوالی واپڈا کی لائن کو ناپتے رہتے۔ آپ کا چہرہ دھول سے اٹا ہوا ہوتا تھا۔ ایک دم کھبے آنے شروع ہو گئے، یہ ایک خوش گن منظر تھا۔ جیسے ہر نئی چیز کی خوشی ہوتی ہے ہم سب خوش تھے۔ کھبے لگے، بجلی پہنچی، آپ کا گھر بجلی کے بغیر تھا کیونکہ آپ کے پاس بجلی لگوانے کے اخراجات نہیں تھے۔

اس کے بعد آپ نے ٹیلی فون کی بات شروع کر دی کہ گاؤں میں ٹیلی فون ہونا چاہیے۔

گاؤں میں ایک آپکھینج لگ گئی۔ یہ 1973ء کا قصہ تھا۔ آج 2006ء ہے مخدوم رشید کے ہر گھر میں بلکہ ہر فرد کے پاس نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے ٹیلی فون پہنچ چکا ہے، لیکن آپ اب بھی کسی پی سی او (PCO) پر جا کر فون کرتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔

آج بھی آپ اسی طرح قائد اعظم کی محبت میں گرفتار ہیں جس طرح علی گڑھ میں ان کے قافلے کیساتھ ان کے ایک کارکن کے طور پر کام کرتے تھے۔ آپ کے پاس بچوں کو تعلیم دلانے کے کوئی وسائل نہیں تھے۔ وہ گاؤں کے سکول میں ٹائٹوں پر پڑھتے رہے۔ آج ان میں سے کوئی سکول کا چپڑا سی ہے، کوئی کلرک بنا ہے۔ آپکا بیٹا ظفر، جسے آپ کے کسی محسن نے نیوی (Navy) میں بھرتی کرایا تھا، وہ بھی آپ کے کندھوں پر اپنے بچوں کا بوجھ چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا۔ مجھے معلوم ہے آپ بیماریوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑ رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گذشتہ تیس سال سے آپ نے محلے کی مسجد کی تزئین و آرائش اپنے خون و جگر سے کی ہے۔ آپکا شعروں کا انتخاب، آپ کی انگریزی ادب پر گہری نظر، ہم جیسوں کی رہنمائی کیلئے اہمیت کی حامل ہے۔ رانا صاحب، ہم آپ سے شرمندہ ہیں اگرچہ آپ نے آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانے کسی کا احسان نہیں لیا اور اپنی انا کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ لیکن گاؤں کے بڑے لوگ جو پاکستان کے بننے کی وجہ سے اب اور بھی بڑے ہو گئے، وہ آپ کو آپکا مقام دینے کیلئے تیار نہیں، لیکن تاریخ نے آپ کو مقام دیدیا ہے۔ آپ ہم جیسوں کیلئے روشنی کی وہ کرن بنے ہیں جس کا اُجالا منزل کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کی جوانی بھی شاندار تھی، آپ کا بڑھاپا بھی شاندار!

آپ نے 1964 میں بی ڈی (B-D) کونسلر کا الیکشن لڑا۔ غریب عوام نے آپکا ساتھ دیا۔ آپ جیت چکے تھے، آپ کی بیٹھک میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر عجیب رونق تھی۔ ان کے اُنک اُنک میں فتح کی سرشاری تھی۔ وہ ناچ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ الیکشن کے عملے نے آپکی شکست کا اعلان کر دیا۔ آپ کے حامیوں کے چہروں پر ایسی کیفیت تھی جو کسی ماں کے چہرے پر اس کے

جوان بیٹے کی موت کی خبر پر ہوتی ہے۔ سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ضبطِ غم سے اُن کے ہونٹ نیلے ہو گئے اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ یہ پہلی انتخابی دھاندلی تھی جس سے میں رُوشناس ہوا۔

آپ نے اس کے باوجود اپنے گاؤں کی خدمت جاری رکھی۔ پندرہ سال بعد جب میں وزارت سے مستعفی ہو کر گاؤں پہنچا تو بلدیاتی انتخاب کا پہلا مرحلہ شروع تھا۔ آپ کو نسلر کے ایکشن کیلئے میرے حمایت یافتہ پیپل میں شامل ہو گئے۔ اب آپ کے خلاف دھاندلی آسان نہ تھی۔ آپ بی ڈی منتخب ہو گئے، یہ آپکی تیس، پینتیس سالہ خدمات کا اعتراف تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ کی صلاحیتوں سے کام لینے کیلئے بڑا فورم ہونا چاہئے۔ ضلعی انتخابات کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، میں مخصوص نشستوں کے ذریعے آپ کو آگے لانا چاہتا تھا۔ آپ محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے جسے احترام ملنا چاہئے۔ مگر فیوڈل نظام میں آپکی علی گڑھ کی ڈگریاں بھی آپ کو کوئی مقام نہ دلا سکیں۔ آپکی معاشرتی حیثیت پر دو ایکڑ کا زمیندار بھاری ہے۔ آپ نے انتخابی فہرست میں اپنا پیشہ حکمت لکھا کیونکہ آپ نے ہو میو پیٹھک کا ڈپلومہ حاصل کیا ہوا تھا، میں نے انتخابی عملے کو کہا کہ یہ حکمت نہیں محنت ہے۔ یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری دھاندلی ہے جس پر میں شرمسار نہیں ہوں۔ آپ مزدور کی سیٹ پر ہمارے پیپل سے بلا مقابلہ ممبر ضلع کونسل بن گئے، آپ کی ترقیاتی سرگرمیوں کا میدان وسیع ہو گیا۔

آپ قیام پاکستان سے پہلے بھی مسلم لیگی تھے اور آج بھی مسلم لیگی ہیں، آپ اقتدار کا ساتھ دینے والی مسلم لیگ کی بجائے جمہوریت کا ساتھ دینے والی مسلم لیگ کے ساتھ رہے۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ صدر پاکستان یا وزیراعظم کسے ہونا چاہئے، میں بے دھڑک آپ کا نام پیش کر دوں گا۔ آپ جیسے افراد کی بدولت ملکوں کا نظام چلتا ہے بلکہ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی انسانیت کا سر بلند ہے۔

رانا صاحب! میرا اسلام عقیدت قبول کر لیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

والسلام! آپ کا مخلص!

جاوید ہاشمی!

کاش میں نیامت موچی ہوتا!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب شیر محمد "موچی" صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میں نے بچپن میں کئی سال آپ کے گھر بیٹھ کر آپ کو کام کرتے دیکھا، مجھے یہ لالچ بھی ہوتا تھا کہ میری موجودگی میں میرا جوتا جلد بن جائیگا اور خوبصورت بھی ہوگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ بڑی سوئی میں دھاگہ ڈال کر مہارت سے چمڑے کے سوراخ میں ڈالتے پھر اسکو جوتی کے اوپر والے حصے سے جوڑ دیتے، آپ چمڑے کو پتھر پر رکھ کر تیز رندی سے اس کی تہیں اتارتے اور جوتے کا نیچے والا حصہ تیار کر لیتے تھے۔ آپ کی نظر جوتے کے تلووں پر مرکوز ہوتی تھی۔ آپ کے ہاتھ مشینی انداز سے چلتے رہتے تھے۔ اور جب دھاگے سے سیتے تو دھاگے کا ایک حصہ آپ کے منہ میں ہوتا۔ آپ گردن جھکا کر پوری توجہ سے یہ مراحل طے کرتے اور میں بڑے غور سے دیکھتا رہتا۔ آپ کی بیوی "انور مائی" آپ کی توجہ گھر کی بری حالت کی طرف دلاتی۔ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور آپ کہتے تھے، اللہ مسبت الاسباب ہے۔ آپ کارٹ پر یقین اور اُس یقین کے اظہار کا انداز میں آج تک نہیں بھول سکا۔ مجھے اُس وقت تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ روزانہ قومی خزانے میں اپنے خون پسینے کی کمائی جمع کروا رہے ہیں۔ آپ جو دھاگہ خرید کر لاتے ہیں اُس کا ٹیکس قومی خزانے میں جمع ہوتا ہے۔ آپ جو چمڑا خریدتے ہیں، اُس کا ٹیکس قومی خزانے میں جاتا ہے۔ آپ جس بس پر سفر کر کے جاتے ہیں، اُس کے ڈیزل کا ٹیکس حکومت کے خزانے میں پیشگی جمع ہوتا ہے۔ آپ جو چائے، سبزیاں لاتے ہیں، اس پر ٹیکس دیتے ہیں۔ میں آپ کو ٹیکس دہندہ (Tax Payer) نہیں سمجھتا تھا بلکہ آپ کی غربت کی وجہ سے آپ کو قومی خزانے پر بوجھ سمجھتا۔ آج بھی آپ کا شمار ٹیکس دینے والوں میں نہیں ہے۔ جب میں بڑا ہوا تو احساس ہوا کہ آپ

ساری زندگی خزانہ بھرتے رہے ہیں اور بڑے بڑے پیٹوں والے اسے خالی کرتے رہے۔ آپ ووٹ دے کر جب قومی اسمبلی یا مقامی کونسل کا ممبر منتخب کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو ٹیکس ادا کر رہے ہیں، اس کی نگرانی خود نہیں کر سکتے، آپ اُن کو چوکیدار بنا کر بھیجتے ہیں، تاکہ آپ کے خون پسینے سے جمع کئے ہوئے پیسے کا استعمال صحیح طور پر ہو سکے، لیکن اگر چوکیدار ہی چوروں سے مل جائے تو چاچا شیر محمد اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ہم نے سکولوں کا جال بچھا دیا حالانکہ تمہارے بیٹے اور اب تمہارے پوتے پوتیاں ان سکولوں کی شکل نہیں دیکھ سکے، مجھے یاد ہے پھر تمہارا بیٹا ”مئی“ تمہارے ساتھ جوتے سینے کیلئے بیٹھ گیا اسی چہرے کے نیچے جس کے نیچے تم بیٹھتے تھے۔ سردیوں اور گرمیوں میں اسی درخت کے نیچے بدبودار پانی کے تالاب کے کنارے پر آج تک وہ اسی جھونپڑے میں بیٹھا ہوا ہے بلکہ اب تو اُسکے نیچے بھی اُسکے ساتھ موجود ہیں۔ تمہارا ایک بیٹا نشہ کا عادی ہو گیا، آتے جاتے لوگوں سے بھیک مانگتا ہے، اُس کے جسم پر پورے کپڑے بھی نہیں ہوتے۔ تم اس گھر سے کب کے چلے گئے ہو مگر فاقے اب تک اس گھر سے نہیں گئے۔ مجھے آج بھی چالیس پچاس سال پرانا منظر یاد آ جاتا ہے، جب تم خون تھوکتے تھے، بخار میں جل رہے ہوتے تھے، تمہیں مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ آج تیسری نسل بھی اُسی طرح خون تھوک رہی ہے، بیماریوں نے انہیں گھیرا ہوا ہے وہ تعلیم کے لفظ سے آشنا نہیں۔ ہم دعوے کر رہے ہیں کہ ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے لیکن تمہاری اولاد تو زمین پر رہنے کے بھی قابل نہیں۔ تمہارے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہارے بچے، بچیاں، پوتے، پوتیاں اور بہویں، جو رات دن مزدوری کرتی ہیں، آرام سے سو سکیں۔ تمہارے کنبے کی وجہ سے مجھے انتہائی جنگوں میں بار بار کامیابی ملی، تمہارے رشتہ دار رب نواز، غلام محمد وغیرہ نے ہر مرتبہ میرا ساتھ دیا، سچ بات تو یہ کہ نہ صرف مخدوم رشید بلکہ اردگرد کی بستوں کے موچیوں، نائیوں، لوہاروں، ترکھانوں، جولاہوں، کہاروں، قصابوں، ماشکیوں اور دایوں کا کردار میری کامیابی کی بنیاد بنا اور میں اسمبلی تک پہنچ گیا۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ علاقے کی

حالت بدلنے کے اتنے مواقع ملے مگر وہ کچھ نہ کر سکا جو مجھے کرنا چاہیے تھا، میں تو لوگوں کو یہ بھی نہ بتا سکا کہ ہمارے پیارے نبیؐ اپنے جوتے خود گانٹھتے تھے۔ یقیناً ان کے ہاتھ میں جوتا سینے والی آرہوتی ہوگی، جب وہ دھاگے کو جوتے سے گزارتے ہونگے تو یہ منظر نہ صحابہؓ سے چھپا رہتا ہوگا اور نہ گھر والوں سے، جو کام دُنیا کی عظیم ترین ہستی نے کیا، چاچا شیر محمد تم بھی وہی کام کرتے رہے۔ جبہ دستار پہننے والے بھی حضور ﷺ کی اس سنت پر عمل کرنے کی تلقین کرتے تو کم از کم اس پیشے سے توہین کا عنصر ختم ہو جاتا اور معاشرے میں آپ کو وہ مقام مل جاتا جسے طبقاتی نفرت نے آپ سے چھین لیا ہے، دُنیا کے محنت کشوں کی بات کرنے والوں نے بھی صرف تقریروں میں آپ کے دکھوں کا علاج ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ یہ خط لکھ کر میں بھی ان گفتار کے غازیوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

چاچا شیر محمد! تمہارے ساتھ باتیں کرتے کرتے مجھے اپنا بھائی نیامت موچی یاد آ گیا ہے، میں سوچ رہا ہوں کاش! میں نیامت موچی ہوتا جو بستی چٹھہ سے مخدوم رشید آ کر میرے ماموں الحاج صوفی امیر شاہ کی دکانوں کے سامنے بیٹھ کر تیس سال تک لوگوں کے جوتے چمکا تا رہا، اب اس کا بیٹا بھی اسی جگہ بیٹھ کر وہی کام کر رہا ہے۔

وہ وقت پر نماز پڑھتا تھا۔ بڑے لوگوں کی طرح بجلی چوری نہیں کرتا تھا۔ تمام واجبات وقت پر ادا کرتا تھا، قومی دولت کی لوٹ مار میں ملوث نہیں تھا، ووٹ کی قیمت وصول نہیں کرتا تھا اور اپنے نظریات پر سودے بازی نہیں کرتا تھا۔

وہ کٹر ”وہابی“ تھا اور میرے ماموں روزانہ دربار شریف پر حاضری دینے والے، محفل میلاد کے اجتماعات کا انعقاد کرنے والے، ہر جگہ وہابیوں کے خلاف تبرایوں لےنے والے، وہ بااثر مرشد زادہ تھے، تھانہ اور تحصیل کے افسران ان کو جھک کر سلام کرتے تھے، نیامت موچی کی اکثر شاہ صاحب سے اس مسئلہ پر تو تکرار ہو جاتی، نیامت موچی انہیں کھری کھری سنا دیتا، اسے اپنے نظریات، اپنے رزق سے زیادہ عزیز تھے وہ اس بات سے بے نیاز ہو جاتا کہ شاہ صاحب اگر اسے اٹھادیں تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا۔ شاہ صاحب اور نیامت

موچی اجتماع ضدین تھے، مگر ان کی دوستی بھی مثالی تھی۔ نیامت موچی جماعت اسلامی سے متاثر تھا۔ وہ ہمیشہ انتخابات میں میرا ساتھ دیتا جب جماعت اسلامی کا امیدوار میرے مد مقابل ہوتا تو وہ مجھے ووٹ دینے سے انکار کر دیتا بلکہ جماعت اسلامی کی انتخابی مہم میں میرے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

چاچا شیر محمد! انگریز نے ووٹ کا حق ان لوگوں کو دیا تھا جو ٹیکس گزار تھے، نیامت موچی اور آپ دونوں بھی ٹیکس گزار ہیں۔ لیکن ٹیکس دینے کی اس تشریح پر پورا نہیں اترتے جو انگریز نے کی تھی۔ آپ لوگوں نے جب اپنی مرضی سے اپنا ووٹ مجھے دیا تو آپ کو چوہدریوں اور شاہ صاحبان کے عتاب کا نشانہ بنا پڑا کیونکہ آپ ابھی تک Tax Payer کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔ اس لئے آپ کو اپنا ووٹ آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ ہمارے جنرل اور ہمارے فیوڈل اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ حکومت کا حصہ بننے کا حق اسی کا ہے جسے انگریز نے وفاداری کی سند عطا کی تھی اس طبقے کو تمہارے ووٹ نہ بھی ملیں تو اس کا حق حکمرانی ختم نہیں ہوتا، اور اگر آپ کو ووٹ کا حق مل بھی جائے تو آپ کو اسے آزادانہ استعمال کا حق ہرگز نہیں دیا جاسکتا، ان پر لوٹ کھسوٹ کے الزامات بھی انہیں حکومت کا حصہ بننے سے نہیں روک سکتے، وہ ملک اور قوم کے وفادار ہوں نہ ہوں ہر حکومت کے وفادار ہوتے ہیں، حکومت جس کسی کی ہو وہ اسی کے ہوتے ہیں، وہ تمہارے ووٹ کے حق کو دل سے تسلیم نہیں کرتے، وہ جمہوریت کا راستہ روکنے کی سازشوں کا حصہ بن جاتے ہیں تاکہ انہیں تمہاری آنے والی نسلوں کے سامنے جو ابدہ نہ ہونا پڑے میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ میں تمہارے بچوں کے اس حق کے لئے آخری سانس تک لڑوں گا۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

مقصد کی تختی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادر محترم عاشق محمد پاوولی "جولاہا" صاحب

السلام علیکم!

کئی دنوں سے اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ آپ کو خط لکھوں یا نہ لکھوں، بالآخر آج قلم اٹھا ہی لیا۔ میں نے آخری مرتبہ آپ کو اس وقت دیکھا تھا جب آپ ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو چکے تھے، بیماری نے آپکا کچھ مر نکال دیا تھا، آپ چند لمحوں کے مہمان نظر آتے تھے۔ آپکی وفات کی خبر مجھے نہیں ملی نہ ہی میں آپکے جنازے میں شریک ہو سکا۔ جسکا مجھے آج تک دکھ ہے۔ آپ جس وقت کپڑا بن رہے ہوتے تھے، میں پہروں بیٹھ کر یہ عمل دیکھتا تھا۔ بھائی عاشق محمد، آپکی ساری زندگی ایک قبر میں گذری۔ ساتھ والے کھڈے پر بھابھی فاطمہ بھی یہی عمل دہرا رہی ہوتی تھی، آپکے دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ مصروف کار ہوتے تھے، آپکی نظریں دھاگے پر جمی ہوتی تھیں، آپکے ہاتھوں کے بنے ہوئے کپڑے میں نے بچپن میں پہنے، آپکے ہاتھوں کی بنی ہوئی رنگین کھیسیاں مجھے سردی سے بچاتی تھیں۔ بستر کی چادریں اور چاندنی بنانے میں تو آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ آپکی بیوی، بچے قبرستان کی وسیع جگہ پر دھاگوں کو لکڑی کے بنائے ہوئے شینڈ پر پھیلاتے تھے، اس شینڈ کو گھوڑی کہتے تھے۔ دھاگے کو مضبوط کرنے کیلئے اُس پر پان چڑھائی جاتی تھی، یہ گندم کا گودا ہوتا تھا جو دھاگے میں تناؤ پیدا کرتا تھا، سارا دن آپ کے خاندان کے افراد رچھ ہاتھ میں لئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتے رہتے۔ یہ عجیب منظر ہوتا کہ سب اپنی دُھن میں ایسے بھاگتے جیسے یہ اُن کی زندگی کی آخری دوڑ ہے، مگر یہ تو نہ ختم ہونے والی میرا تھاں تھی۔ خواتین گنگنائی رہتی تھیں، لگتا تھا کہ وہ کچے دھاگوں کیساتھ اپنے دُکھ سکھ بانٹ رہی ہیں۔ لوگ انکے بالکل قریب مُردے دفنانے کیلئے آتے مگر یہ مرد، عورتیں اپنے خیال میں گم ہوتے۔ انہیں ایک دُھن سوار ہوتی کہ وہ اتنے کپڑے بن لیں کہ اپنے

بچوں کو پال سکیں۔ آپ کے گھر کے سامنے مسجد تھی، آپ اکثر کنوئیں سے پانی نکال کر مسجد کے سقاوے میں ڈالتے دکھائی دیتے تھے، تاکہ نمازیوں کو وضو میں آسانی ہو، آپ ہمیشہ جماعت کی پہلی صف میں ہوتے تھے، آپکو معاشرے کی ناہمواریوں سے کوئی گلہ نہیں تھا، آپکے بچے آج بھی اسی مکان کے اندر ہیں، آپ کے پوتے پوتیوں کا طرز زندگی بھی وہی ہے۔ نئے قائم ہونے والے سکولوں کے دروازے اُن پر نہیں کھل سکے، وہ فکرِ معاش سے باہر نہیں آسکے۔ تمہارا بیٹا خان محمد ملتان سے سبزیاں لا کر بیچتا ہے۔ زندہ درگور ہونے کی بجائے دکان کے تھڑے پر بیٹھتا ہے، قبر سے نکل کر ایک تھڑے پر بیٹھ کے سبزیاں بیچنا اسکی ترقی ہے، آپ کے والد اور اس کے دادا غلام محمد نے بھی گنڈیریاں بیچنے سے مٹھائی بنانے تک سب کاروبار کیے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہمارے گاؤں میں تمام دوکانیں ہندوؤں کی تھیں چاچا گامن ہمارے گاؤں کا پہلا مسلمان تاجر تھا۔ تمہاری پوتیاں، تمہاری نوایاں کولہو کے بیل کی طرح اپنے معاش کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آپکی بیٹیاں جب کپاس چننے کیلئے جاتی تھیں تو اُنہیں کھیت مالکان کی جھڑکیاں سُنا پڑتی تھیں اور اگر اپنی بکری کیلئے تھوڑا سا گھاس اٹھا لیتیں تو اُنہیں دشنام طرازی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اچھا ہوا تمہارا بیٹا حسن جوانی میں مر گیا ورنہ اس کا انجام بھی یہی ہوتا جو باقیوں کا ہو رہا ہے۔

اب تم اس دُنیا میں نہیں ہو، تمہاری بیوی فاطمہ بھی نہیں ہے۔ مجھے دھاگے کی بُنت اور وہ مشقت، جسکے نشانات تمہارے ہاتھوں پر تھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ایک ایک لمحہ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ سوچتا ہوں قومی سطح کے فیصلے کرنے کے قابل ہو گیا ہوں، ملک کی تقدیر سنوارنے کی باتیں کرتا ہوں، میرے بچے اچھے سکولوں میں پڑھ گئے ہیں، میرے اور میرے تمام رشتہ داروں کے بچوں کے تعلیمی معیار میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ صرف اس بات پر پورے پاکستان کو تعلیم یافتہ کہہ دینا اور اسی کو ترقی کا نام دے دینا منافقت نہیں تو کیا ہے؟ یہ سفید جھوٹ نہیں تو کیا ہے؟ میں واپس گاؤں کیسے آؤں؟، تمہارا سامنا کیسے کروں؟، تمہاری وہ ساری خدمات جو والد محترم کیلئے تم رات دن سرانجام دیتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ تم ساری ساری رات جاگ کر ہمارے لئے سوہن حلوہ بناتے تھے۔ ہمارے گھر اور

بازار کے سارے کام تم نے اپنے ذمہ لئے ہوئے تھے مگر میں اس کے بدلے میں تمہارے خاندان کیلئے کچھ بھی نہ کر سکا۔

والد محترم کے مریدین میں آپ کو خاص مقام حاصل تھا۔ آپ نے ان کے حلقہ ارادت کی زنجیر اپنے گلے میں ڈالی ہوئی تھی اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ نہیں عاشق محمد میں نہیں آنا چاہتا، میں آنکھیں پڑا رہا ہوں تم سے، تم زندہ ہوتے ہوئے بھی قبر میں تھے، اب تمہارے گھر سے تمہاری قبر کا فاصلہ چند سو گز سے زیادہ نہیں۔ جو پیچھے بچے ہیں کیا وہ زندہ ہیں؟ کیا ان کا حق زندگی پر اسی طرح ہے؟ ان کو سر چھپانے کیلئے چھت جو تم بنا کر دے گئے تھے وہی موجود ہے۔ پاکستان ترقی کر گیا ہے۔ یہ بات میں کہوں تو تم عقیدت کی وجہ سے اپنے لب سی لوگے، میں تمہاری اس عقیدت کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں، تمہاری زبان بند کرنا چاہتا ہوں، میں تمہارا مرشد زادہ ہوں، میرا کہا غلط نہیں ہو سکتا، کیا تم احتساب کرو گے میرا؟ ہاں اب تم مرنے کے بعد میرا احتساب کر سکتے ہو۔ مجھے جیل میں بیٹھے ہوئے تمہارے سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہے، یہی چھین مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ جب تک میں ملک کے ہر بچے کے ہاتھ میں کتاب نہ دیکھ لوں ہر بچے کے چہرے پر مسکراہٹ نہ دیکھ لوں، جب تک اُسکے معاشی مستقبل کو محفوظ نہ کر سکوں، میں سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے، اب میں نے وعدہ کر لیا ہے، تمہیں اپنے مرشد زادے کے وعدے پر یقین کرنا ہوگا۔

اگر قائد اعظم محمد علی جناح کے دادا پونجا بھائی، اُنکے چچا ولی بھائی، ننھو بھائی اور والد جناح بھائی کا ٹھیاوار میں پلی کے گاؤں میں کھڈیوں پر اپنے ہاتھوں سے کپڑا بکتے ہوئے ایک ایسا فرزند پیدا کر سکتے ہیں جو بابائے قوم ہے، تو تم اور تمہاری نسلیں کپڑا بننے کی وجہ سے معاشرے میں باعثِ احترام کیوں نہیں ہیں۔ رانا عبدالوحید علی گڑھ میں پڑھنے کے باوجود وہ مقام کیوں حاصل نہیں کر سکا جو اُس کا حق ہے۔ تمہارے مقدر کی تختی پر تو وہ کچھ نہیں لکھا ہوا تھا جو تمہاری موت کے بعد تمہاری قبر کی تختی پر لکھ دیا گیا ہے۔

خدا حافظ!

تمہارا مخلص! جاوید ہاشمی!

احساس جرم کی صلیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

چاچا خیر محمد "کہار" صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

مجھے معلوم ہے کہ آپ اب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ میں بھی کئی سالوں سے اُس دُنیا میں نہیں ہوں۔ جہاں آپ سے ملاقات ہوتی تھی، آپ اور آپ کے تمام رشتہ داروں کے گھروں کے ارد گرد ہماری زمینیں تھیں، میں اکثر آپ کے گھر سے گذرتا، آپ کے صحن میں بیویوں کے تین گھنے درخت تھے، برابر میں سرکنڈوں کی ایک چھپر بنی ہوئی تھی جس کے نیچے بیٹھ کر آپ چاک کو پاؤں سے گھماتے ہوئے نظر آتے، گھر کے شمالی حصے میں آپ کی اور آپ کے بھائیوں کی رہائش تھی اور گلی کے مغرب میں جانور باندھنے کا باڑہ۔

آپ کی سفید داڑھی اور سر پر بغیر کلف کی سفید پگڑی آپ کی شخصیت کا حصہ تھی، گرمیوں میں کام کرتے ہوئے آپ کے گلے میں قمیض نہیں ہوتی تھی، مگر سر پر پگڑی ہر وقت موجود رہتی۔ آپ کے خاندان کی اکثریت کارنگ گورا تھا اور آنکھیں سبز اور نیلی، آپ کا چھوٹا بھائی غلام رسول گدھوں پر مٹی اور پکی اینٹیں ڈھو کر جو کچھ کماتا آپ کی تلی پر رکھ دیتا، آپ اور آپ کے تمام بھائی نماز کے وقت، اپنا سب کام چھوڑ کر، مسجد میں اکٹھے ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے۔

میں انہماک سے آپ کو کام کرتے دیکھتا رہتا۔ چاچا خیر محمد! میں اب بھی دیکھ رہا ہوں، تمہارا بھائی شیر محمد، تمہاری بیوی، تمہاری بھابھیاں، تمہارے کام میں شریک ہو گئی ہیں، تمہارا بیٹا غلام محمد، بھتیجا خدا بخش، عاشق محمد سارے مل کر تمہاری مدد کر رہے ہیں۔ مٹی میں پانی ڈال کر اسے گوندھا جا رہا ہے۔ ریت ملا کر اس میں لچک پیدا کی جا رہی ہے۔ اب مٹی کو چاک پر چڑھایا جا رہا ہے۔ تمہارے پاؤں چاک کو چلا رہے ہیں، دونوں پاؤں زمین کے گڑھے میں

ہیں، دونوں ہاتھ مٹی کو مختلف برتنوں میں ڈھال رہے ہیں۔ کہیں پیالہ بن رہا ہے، کہیں لوٹا اور گھڑے بنائے جا رہے ہیں، کہیں آٹا گوندھنے کی پراتیں، سالن پکانے کی ہانڈی بن رہی ہے اور مٹی کٹی روپ اختیار کر رہی ہے۔ مٹی کا یہ روپ اب مٹی نہیں کہلا رہا۔ اب یہ لوٹا، گھڑا، پیالہ ہے، اس کے کٹی نام ہیں۔ اس کو پکانے کیلئے مختلف جگہوں سے ایندھن جمع کیا جا رہا ہے۔ ہمارے کھیتوں سے بھی کچھ لکڑی، بطور امداد آپ کو دی گئی ہے، جس کی وصولی کٹی طریقوں سے کر لی جائیگی۔ مٹی کے کچے برتنوں کو ایندھن کے نیچے ڈھانپ کر آگ لگا دی جائے گی، کٹی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ قبل از وقت برتن نکال لئے گئے جو کچے رہ گئے کٹی مہینوں کی محنت ضائع ہو گئی۔ ایسا بھی ہوا کہ ابھی برتن آوے میں رکھے جا رہے تھے کہ بارشوں کی وجہ سے وہ دوبارہ مٹی ہو گئے مگر میں نے کبھی تمہیں حوصلہ ہارتے نہیں دیکھا تھا، تمہارے بھائی شیر محمد کے چہرے پر بھی ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

تمہاری خواتین ہمارے گھروں میں کام کاج کرتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا احترام کیا جاتا تھا لیکن دوسرے گھروں میں جا کر برتن دھونا، کپڑے دھونا، صفائی کرنا آسان کام نہیں، پھر کھیتوں میں جا کر کپاس کی چنائی کے دنوں میں اضافی مزدوری کرنے سے خواتین کا کام مردوں سے بھی بڑھ جاتا تھا اور آج بھی یہ محنت مزدوری جاری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اب آپ کے بچوں نے برتن بنانے چھوڑ دیئے ہیں۔ ان تمام بچوں نے سکول کا منہ نہیں دیکھا۔ تمہارے خاندان کے چند ایک افراد کے پاس گدھے موجود ہیں۔ جن پر وہ بار برداری کا کام کرتے ہیں، مگر ٹریکٹر ٹریلیوں نے ان کی اس مزدوری کو بھی محدود کر دیا ہے۔ پلاسٹک کے برتنوں نے تمہاری مٹی کے برتنوں کو ہماری زندگیوں سے باہر کر دیا ہے۔ تمہارے بچے بیروزگاری کے عفریت کا سامنا کر رہے ہیں۔ مجھے سارا ماحول اور سارے مراحل اچھی طرح یاد ہیں۔ میں پانچ مرتبہ رکن منتخب ہونی والا، کئی مرتبہ وفاقی وزیر بننے والا آپ کا ہمسایہ ہوں۔ آپ کے گھر کو دیکھتا ہوں، جہاں کا ایک بچہ بھی تعلیم یافتہ نہیں ہے تو میرے دامن میں سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ میری ان تمام کوتاہیوں کے باوجود تمہارے تمام بچے

تمہارے بھتیجے تمہاری خواتین، تمہارے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں مجھے اسمبلی تک پہنچانے کیلئے اپنے ووٹ کا استعمال میرے حق میں کرتے ہیں، میں ان کیلئے کیا کر سکا ہوں؟ میں ان کی محبتوں کا جواب نہیں دے سکا وہ میری ہر انتخابی مہم کا ہر اول دستہ ہوتے ہیں۔ وہ میری سیاست کا ایندھن ہیں یا مٹی کے کچے برتن جن پر بارش برس جاتی ہے اور وہ مٹی میں مل کر پھر مٹی ہو جاتے ہیں، ان کی معاشی حالت اس سے بھی اتر ہے جو پچاس سال پہلے تھی۔ ترقی کا قافلہ ان کی دہلیز سے گذر کر ہماری حویلیوں تک پہنچتا ہے۔ ان کے دروازے کھلے رہتے ہیں، مگر ترقی وہاں داخل نہیں ہوتی، ان کی بیٹیاں اسی طرح لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں، زمینداروں کی زمینوں پر کام کرتے ہوئے جھڑکیاں سنتی ہیں۔ روشنی کی کرن راستہ بھول کر بھی ان تک نہیں پہنچتی ان کی قسمت کی خرابی کا ذمہ دار کون ہے؟ ان کا مسیحا کہاں ہے؟ آپ کی بھابھی ماسی حیات آج بھی بڑھاپے کے باوجود ہمارے گھروں میں مزدوری کر رہی ہے۔

چاچا خیر محمد! مجھے تم سے آنکھیں چرانے کا یہ راستہ ملا ہے کہ میں خاموش رہوں، میری خاموشی کو میرا اعتراف جرم سمجھ لینا۔ اس جرم کی سزا میں پہلے ہی کاٹ رہا ہوں، مزید سزا بھی دو گے تو میں اس کا مستحق ہوں، میں نے اگرچہ تختہ دار پر قدم نہیں رکھا مگر احساسِ جرم کی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں اور اُس وقت تک لٹکا رہوں گا جب تک اپنی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کر لیتا۔

چاچا خیر محمد! تم جسے سچ سمجھتے تھے، منہ پر کہہ دیتے تھے۔ تم بڑے انسان تھے، تمہارے چہرے پر آج بھی وہی مسکراہٹ ہے جس مسکراہٹ کی میں تمنا کرتا ہوں، جس خوشی کی تلاش میں در بدر ہوں، جس خوشی کو حاصل کرنے کیلئے قید میں ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں جیسے میں جنت میں داخل ہو رہا ہوں۔ یہ معمولی سی قربانی دے کر اگر میں اس نظام کی تبدیلی کے عمل میں اپنا حصہ ڈال لوں تو پھر تمہاری قبر پر پھول چڑھانے ضرور آؤنگا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اب اس ملک میں کوئی ان پڑھ نہیں رہیگا، کوئی ظالم نہیں آئیگا، جبر کے نام پر لوگوں کی

گردنوں میں طوق ڈالنے والا کوئی نہیں ہوگا، انتظار کرنا چاچا خیر محمد، دیر ضرور ہوئی ہے لیکن میں بھٹکا ہوا مسافر نہیں ہوں۔ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوں، مقاصد میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے، اس ملک کے کونے کونے میں تعلیم کے دیئے روشن کرنے ہیں، ہر گھر کو بھوک اور افلاس سے نجات دلانی ہے۔ لوگوں پر لوگوں کی بالادستی کو ختم کرنا ہے، رات کے دو بجے بیٹھ کر اس ملک کے بچوں کے بارے میں جو درد محسوس کر رہا ہوں، دعا کرو یہی درد میرا سرمایہ بن جائے اور اس سرمائے کیساتھ میں تعمیر وطن کر سکوں، میرے لئے دُعا ضرور کرنا! میں جو خواب بن رہا ہوں اسکی تعبیر مل گئی تو یہ میری خوش بختی ہوگی اور میرے لئے ایک بے پناہ مسرت کا سامان بھی۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ پاکستان بنانے والوں میں فکری مواد فراہم کر نیوالے اکثر افراد کچلے ہوئے طبقات میں سے تھے۔ دولت مندوں نے پاکستان بننے وقت انگریز اور ہندوؤں کا ساتھ دیا، تمہارے قبیلے کے ایک فرد مولانا ظفر علی خان نے اپنے افکار سے انگریز اور ہندو کو لاکارا۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

ماضی سے نجات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

چاچا حیر محمد " کمہار " صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

چاچا حیر محمد! میں اسوقت یونان کے دارالحکومت ایتھنز کے اس حصے میں کھڑا ہوں جہاں مٹی کے برتنوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں، یہ تمام برتن پہلے زمانے کے ہیں، انہیں آثارِ قدیمہ کہتے ہیں، ان برتنوں کو دکھانے والی ایک لڑکی نے جب "پاٹری" (Pattery) کا نام لیا تو مجھے فوراً آپکے ہاتھوں کے بنائے ہوئے برتن یاد آئے جسکو گاؤں میں پاٹری کہتے ہیں۔ اس میں آٹا گوندھا جاتا ہے، برتنوں کی یہ مماثلت مجھے کہیں دُور لے جا رہی ہے میں اس لڑکی کو کہتا ہوں کہ یہ برتن جو تمہارے لئے آثارِ قدیمہ ہیں ہمارے گاؤں کے ہر گھر میں آج بھی استعمال ہو رہے ہیں تمہاری بیٹی نوران، اللہ وسائی اور یونان کی گلیوں میں چلنے والے لوگوں کی شکلوں میں کتنی مماثلت ہے نوران کی ساری زندگی میرے سامنے ہے تم نے اسے اپنے بھتیجے خدا بخش سے بیاہ دیا جس کی شکل واجبی تھی مگر عمل کی دُنیا میں وہ مردِ درویش تھا وہ کئی بچے چھوڑ کر اس دُنیا سے چلا گیا، اسے واپسی کی جلدی تھی، نوران بیوہ ہو گئی وہ ہمارے گھروں میں برتن دھو کر اپنے بچوں کا رزق تلاش کرتی ہے اس کی گہری سبز آنکھیں اور سر جیسا قد اس کے کردار کی بلندی کی مثال بن گیا ہے۔ خدا بخش کے بچے اب جوان ہو رہے ہیں نوران کے دُکھ ٹل جائیں گے۔ ایک مرتبہ میں نے نوران اور اس کی بہنوں کو کپاس کی چنائی کے دنوں میں کوئی سخت بات کہہ دی مجھے کہنے لگیں سائیں "تہاں کوں اے نہیں ٹھاہندی" (جو بات آپ کر رہے ہیں یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے) یہ فقرہ میری پوری زندگی پر اشتہار بن کر چسپاں ہو گیا میں ساری عمر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ کروں جو مجھے "نہیں ٹھاہندی" ہو یعنی میرے شایان شان نہ ہو۔ مجھے عزت نفس (Self

Respect) کا یہ سبق بہت ساری کجیوں سے اور بہت ساری کم ہمتیوں سے بچا لیتا ہے۔ ہر کام کرنے سے پہلے دیکھتا ہوں کہ یہ کوئی گری ہوئی بات تو نہیں ہے، اللہ وسائی اور نوراًں کا تصور میرے بارے میں کیا ہوگا، اس ایک بات نے مجھے ہر کام میں توازن اور عزتِ نفس کو برقرار رکھنے کا سبق دیا ہے۔

چاچا خیر محمد! کبھی کبھی تو میں سمجھتا ہوں کہ میرا جیل میں بیٹھنا بھی عزتِ نفس بچانے کی واردات ہے۔ میں ایتھنز (یونان) سے پھر واپس اپنے گاؤں آ گیا ہوں، سنا ہے اب یہاں کوئی پراتیں بھی نہیں بناتا، پلاسٹک کے برتنوں نے مٹی کے پیالوں کی جگہ لے لی ہے اور تمہارے بچوں کا روزگار اب اس فن میں نہیں رہا جو صدیوں سے تمہارے پاس تھا۔ ایتھنز میں جوڑ کی مجھے مٹی کے برتنوں میں تین ہزار سال کی تاریخ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی اس کو دیکھ کر لگتا تھا تمہاری بیٹی نوزاں اپنی بیوگی کے دکھوں کے مداوے کے لئے تین ہزار سال پیچھے چلی گئی ہو۔ میں نوراًں کو تمہارے مٹی کے برتنوں سمیت ایتھنز میں دیکھ سکتا ہوں، مخدوم رشید میں نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ ہم اپنے ماضی سے نجات حاصل کرنے کی جلدی میں ہیں اور ایتھنز والے اپنے ماضی کو سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ ہم زندہ فن کو دفن کرنا چاہتے ہیں اور وہ مردہ دینوں کو زندہ جاوید بنانا چاہتے ہیں۔

اللہ حافظ!

آپ کا مخلص!

جاوید ہاشمی!

غریب نواز سلامت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

ماما پیر بخش "حجام" صاحب!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آپ اکثر صبح سویرے میرے والد محترم کی حجامت بنانے کیلئے ڈیوڑھی پر موجود ہوتے تھے۔ بیشتر اوقات صبح سے شام تک حجامت کے ہتھیار سجا کر بیٹھے رہتے، اس انتظار میں کہ مخدوم صاحب زانا خانے سے نکلیں اور ان کے بال تراشے جائیں۔ پانی گرم کرنے کیلئے کنسٹر چولہے پر رکھا ہوتا تھا۔ شام ہو جاتی اندر سے پیغام آتا پیر بخش کل آئے۔ آپ دوسرے دن پھر آتے۔ والد صاحب باہر نکلتے تو گھنٹوں بالوں کی خراش تراش جاری رہتی۔ آپ کے حجامت بنانے کے سامان والا چڑے کا بکس، رچھانی پرانی ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ آپ ہر دروازے پر جا کر زمینداروں کی حجامتیں بناتے تھے، جس کا معاوضہ ملے طے شدہ نہیں تھا۔ سال کے آخر میں کچھ گندم اور سردیوں میں تھوڑی سی کپاس مل جاتی تھی اور وہ بھی اس طرح جیسے آپکو بھیک دی جا رہی ہو۔ کسی گھر سے روکھی سوکھی مل جاتی تھی تو آپ خوشی سے کھا لیتے، دگر نہ سارا دن کام کرتے اور کھانا گھر جا کر کھاتے۔ ماما پیر بخش! شادی کے موقع پر لوگ آپ کو پیسے یوں دیتے تھے جیسے آپ کی عزت نفس خریدی جا رہی ہو اور آپ اونچی اونچی آواز میں ان کا نام لے کر کہتے تھے ”دورو پے دیتا ہے فلاں محترم صاحب رہنے والا مخدوم رشید کی نگری کا غریب نواز سلامت“ مجھے غریب نواز سلامت کے معنی نہیں آتے تھے اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ دورو پے دینے والا غریب نوازی کر رہا ہوتا تھا اور تم اُسکی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے۔ آج تم اس دنیا میں نہیں ہو، تمہارے بعد تمہارے دونوں بیٹوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا ایک ایک دروازے پر جانا، کام کرنا، خون پسینہ ایک کرنا اور اگر کوئی سال بعد اس کی مزدوری دے دے تو اس مزدوری کو پا کر خوش ہونا، مجھے یہ

سارے مناظر یاد ہیں۔

میں نے سنا ہے تمہارے دونوں بیٹے چند روز قبل فوت ہو گئے ہیں، وہ تو پہلے ہی مرے ہوئے تھے۔ انہوں نے کسی سکول کا منہ دیکھا نہ کبھی اپنے تن کو اچھی طرح ڈھانپ سکے، صبح سے شام تک تلاشِ معاش میں بھاگتے رہتے۔ بڑے زمیندار حجامت بنوانے کیلئے ان پر یوں احسان کرتے جیسے وہ تمہارے بیٹوں کا مقدر سنوار رہے ہوں۔ تمہارے پوتے پوتیاں تمہارے نواسے نواسیاں اسی طریقے سے لوگوں کے گھروں میں کام کر رہے ہیں جیسے تمہاری بہو، بیٹیاں، بیوی، بہنیں کیا کرتی تھیں۔

ماما پیر بخش! میں کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں کہ تمہارے بیٹے کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، کرکٹ کھیل رہے ہیں، کالج کی یونیفارم پہن کر اٹھکیلیاں کر رہے ہیں، کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر کے معاشرے کا مفید حصہ بن گئے ہیں۔ تمہارے گھر میں اُجالا ہی اُجالا دیکھتا ہوں۔ یہ ہنستے مسکراتے، صحت مند چہرے، اُن منہ بسورتے، روتے بچوں کی جگہ لے لیتے ہیں جو تمہارے گھر میں آج بھی ہیں۔ جن کی معصومیت چھن گئی ہے، جن پر جوان ہوئے بغیر جوانی کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ جب میں ان بچوں کو تمہارے آنگن میں اس حالت میں دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں مگر یہ تو ایسے خواب ہیں جو ابھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوئے۔

ماما پیر بخش! تمہارے درد کی کہانی اس پورے ملک کے درد کی کہانی ہے۔ تمہاری عورتوں کی کہانی بھی پورے ملک کی عورتوں کی کہانی ہے۔ جن کے سر پر دکھوں کے بوجھ کی گٹھڑی روز بروز بھاری ہوتی جا رہی ہے۔ کون کہتا ہے کہ آج کے زمانے میں لوگ اپنی بچیوں کو زندہ دفن نہیں کرتے، جس بیٹی کو آنکھیں کھولتے ہی دوسروں کے دروازیں پر کام کرنا پڑے، جو بیٹی علم کے تصور کو بھی نہ پاسکے، جو بیٹی ماں باپ کی طبقاتی نفرتوں کا بوجھ وراثت میں پائے، جو جہیز نہ لانے پر زندہ جلادی جائے جو اپنے خاوند کی خدمت کر کے بھی جسمانی تشدد کی حقدار گردانی جائے، وہ بیٹی کب زندہ ہوتی ہے؟ اس کا بیٹی ہونا ہی جرم ہے۔ تمہارے

تو بیٹوں کی زندگی کو بھی زندگی کہنا زندگی کی تو ہیں ہے۔ غربت میں پیدا ہونے والے بیٹے بیگار
 کیپ میں پیدا ہوتے ہیں، اُن کو اغوا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ پیدا ہوتے ہی
 یرغمال بن چکے ہوتے ہیں انہیں دُور کسی خرکار کیپ میں لے جانے کی کیا ضرورت؟ وہ
 جائے پیدائش کے خرکار کیپ میں جبر کے سائے میں اپنا خون نچوڑ کر خود پیش کر دیتے ہیں۔
 ماما پیر بخش یہ صرف تمہارے بیٹے بیٹیوں کا قصہ نہیں ہے، یہ صرف پاکستان کے غریب
 بچوں کی کہانی بھی نہیں ہے ہم سب بین الاقوامی خرکار کیپوں میں رہ رہے ہیں۔ ہم بڑی
 طاقتوں کے ادنیٰ کارکن ہیں جو غریب ملکوں کو بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اور کچھ چھپڑے
 پھینک دیتے ہیں۔ اور یہ مُلک نعرے لگاتے ہیں، "غریب نواز سلامت"

ماما پیر بخش! مجھے یاد ہے کہ سلطان ایوب قتال کے میلے پر تم ہمیں شیشہ دکھاتے تھے
 جس میں چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ سب اس شیشے کو اندھا شیشہ کہا کرتے تھے۔ لگتا ہے تم نے
 جان بوجھ کر ایسا آئینہ رکھا ہوا تھا۔ دراصل شیشہ اندھا نہیں ہوتا ہم ہی اپنا سامنا نہیں
 کرتے۔ ہمارے حکمران اور قوم کے محافظ بھی اندھے شیشے رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قوم کی
 آنکھیں روشنی کھو چکی ہیں لہذا وہ کھل کھلتے ہیں۔

ماما پیر بخش! ہم نے کبھی تمہیں شیشہ بدلنے کو کہا اور نہ آپ نے کبھی اندھے آئینے کو تبدیل
 کیا۔ آج مجھے اس اندھے آئینے کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی
 آئینے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا، میراجی تمہیں مبارکباد پیش کرنے کو چاہتا ہے، کہ تم نے ہمیں
 سچائی کا سامنا کرنے سے بچائے رکھا۔ اب تو تمہارے اندھے شیشے کی طلب بین الاقوامی سطح
 پر بڑھ گئی ہے۔ عظیم طاقتیں اس کی تلاش میں ہیں۔ لگتا ہے تمہاری آئیوالی نسلوں کے دن
 پھرنے والے ہیں۔ ساری دُنیا کے مُدبّر اس آئینے کو پا کر اپنا سامنا کرنے سے بچ جائینگے۔
 بصیرت سے وہ پہلے ہی محروم ہیں۔ اب بصارت کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اسی کو تو روشن خیالی
 کہتے ہیں۔ تمہاری طرح ہمارے حکمران بھی مغرب کی طرف منہ کر کے نعرہ لگاتے ہیں۔

غریب نواز سلامت!!

جاوید ہاشمی!

خدا حافظ! آپ کا مخلص!

تاریخ کانیا رخ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

چاچا خیرن "قصاب" صاحب!

السلام علیکم!

میں نے آپ کو چلتے پھرتے کم دیکھا آپ ہمارے گھر کھانا لینے آتے تھے کہ اچانک آپ کا آنا جانا بند ہو گیا فالج زدہ ہونے کے بعد آپ کی زندگی چار پائی تک محدود ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے آپ کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ دیکھی۔ آپ کی بیوی بوا بکھاں آپ کی خدمت کیلئے ہر وقت موجود رہتی تھی، جب تک آپ کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے، آپ نے بہت کوشش کی کہ اپنے پیشے کو تبدیل کر لیں، آپ نے کاشتکاری بھی کی، آپ میرے والد صاحب کے مزارعے بھی تھے، ان کی ملازمت بھی کی۔ لیکن پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوبارہ اپنے پیشے میں آگئے۔ آپ نے اپنے بیٹے غوث بخش کو دو تین جماعتیں تعلیم دلوائی۔ وہ جوان تھا، متحرک تھا، اُسے زندگی سے محبت تھی، وہ میرے بڑے بھائی کا بھائی بن گیا۔ اُسے جوانی میں موت نے آلیا، آپ کا پوتا رفیق، چوتھی جماعت تک میرے ساتھ تھا۔ میری اُس سے دوستی تھی۔ اُس نے بھی سکول سے منہ موڑ لیا۔ بوا بکھاں میری والدہ کی مشیر تھی، شادی بیاہ کی خریداری ہو یا ملتان سے کوئی اور خریداری، وہ ہر وقت میری والدہ کے ساتھ ہوتی۔ سارا شہر ان کو ماسی بکھاں کہتا تھا اور ہم اسے بوا بکھاں کہتے، وہ دانا عورت تھی، پے در پے مصیبتوں کا مقابلہ ہمت سے کرتی رہی، تقریبات کے موقع پر ہمارے گھر میں اُن کے پکائے ہوئے کھانوں کا اپنا مزہ ہوتا تھا، وہ صبح شام میری والدہ کی مصاحبت کیلئے موجود ہوتی تھیں، پھر آپ اس دُنیا سے چلے گئے، بہو نبھی بیوہ تھی، ساس بھی بیوہ ہو گئی۔ آج رفیق اُسی پیشے کو اپنائے ہوئے ہے، جس سے آپ نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ محنت مزدوری کرنے میں کوئی عار نہیں۔ حاجی رفیق بھی مزدوری کر رہا ہے۔

اب اللہ نے اس کا رزق فراخ کر دیا ہے اس کے ایک بیٹے نے سعودی عرب میں جا کر گوشت کے کاروبار سے اچھا خاصا پیسہ کمایا ہے سینٹھ حسین بخش اور رحیم اللہ کے بچوں نے بھی محنت سے اپنی معاشی حالت ٹھیک کر لی ہے مگر فیوڈل معاشرے میں انہیں وہ مقام مل سکتا ہے جو حق انہیں اسلام یا ترقی یافتہ معاشروں نے دیا ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ اس کی انفرادی ترقی کا فائدہ تو اس وقت ہوگا جب معاشرتی سوچ میں ترقی کا پہلو نمایاں ہوں گا۔

چاچا خیرن! مجھے ایک اور بزرگ چاچا خدا بخش یاد آ رہے ہیں جو آپ کی برادری سے تھے، مجھے وہ ہمیشہ باوقار لگے انہوں نے قصاب کا پیشہ اختیار نہ کیا، وہ ہمارے مزارعے تھے، ان کی بیٹوں کو ہم اپنا بھائی کہتے ہیں اور ان کے پوتے ہمیں اپنا چچا کہتے ہیں۔ ان کے پڑپوتے اور پڑپوتیاں مجھے جیل میں ملنے آئے تھے انہوں نے میری جدوجہد پر نظمیں لکھ کر خراج تحسین پیش کیا مجھے چھوٹے چھوٹے بچوں کی یہ کوشش اچھی لگی ملک خدا بخش کے بیٹے ملک دلدار نے بزرگوں کا پیشہ اپنایا پیر بخش اور محمد بخش نے چھوٹے موٹے کاروبار کیے ان کے پوتے ملک نواز نے کپڑے کی دکان کھول لی ان کے دیگر رشتہ دار غفور اور حاجی عبدالرحمان معمولی کاروبار کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں میں ان کی زندگیوں میں خوشحالی کے رنگ دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ معاشرہ ان کی محنت اور ہمت کو تسلیم کر کے ان کا احترام کرے مگر فیوڈل ڈھانچے میں یہ کیسے ممکن ہے؟

چاچا خیرن! تعلیمی اداروں کے بڑھ جانے کا کوئی فائدہ ہوانہ ہسپتالوں کا، صدیوں کی محنت مزدوری کو فیوڈل ڈھانچے نے صدیوں کی بھوک دی ہے۔ زمیندارہ نظام میں انسانیت کے احترام کا کوئی خانہ ہی نہیں ہے۔ یہاں سب کمی ہیں جو صرف ایک طبقے کی خدمت کیلئے پیدا ہوئے ہیں، یہ غلام بنانے کا مہذب طریقہ ہے۔ وہ غلامی جو افریقہ، امریکہ اور یورپ میں پہلے تھی، مشرق وسطیٰ میں آج بھی ہے وسطی ایشیاء ہندوستان میں اس طرح کی غلامی کا کوئی تصور نہیں رہا، یہاں تو انفرادی بجائے پورے ملک کو صدیوں تک غلام

بنا کے رکھا جاتا تھا۔ انفرادی آزادی کو جکڑنے کیلئے ذات پات کا نظام آج تک مسلط ہے۔ کئی نسلیں ہزاروں سال سے خدمت کیلئے پیدا ہو رہی ہیں اور کئی نسلیں ہزاروں سال سے کمزوروں سے خدمت کرا رہی ہیں دونوں طبقوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ وہ پیدائشی طور ہی ایسی قسمت لے کے آئے ہیں۔ اس ظالم نظام کی جڑیں بہت گہری ہیں ان جڑوں کو کھود کر باہر نکالنے کیلئے تیشہ فرہاد کی ضرورت ہے، تیشہ فرہاد ہی دودھ کی نہر بہا سکتا ہے، ایسی نہر جو صدیوں کے پیاسوں کی پیاس بجھا سکے یہ نہر کھودنے کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایسی نہر ہو جو پرویز کے محل تک جا کر ختم نہ ہو۔ اور نہر بہانے والے اپنے تیشے سے ہی اپنا سر نہ پھوڑ بیٹھیں۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے لیکن تاریخ رقم کرنے والے بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ تاریخ سیاہی سے لکھتے ہیں اور کچھ اپنے خون جگر سے۔ تاریخ لکھنے والوں کے نام بھی موجود رہتے ہیں اور تاریخ بنانے والوں کے بھی، اس مرتبہ تاریخ کو نیا رخ دینے کیلئے بالا و پست کا فرق مٹا کر دیکھیں اور دیکھیں کہ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟

خدا حافظ!

سچائی کے بیج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب غلام محمد "ایم گاما" صاحب!

السلام علیکم!

محترمہ فاطمہ جناح، نوابزادہ لیاقت علی خاں سے آپ کے جذبات عشق کی حدوں کو چھو رہے تھے اور جنرل اعظم خان بھی آپ کے پسندیدہ ترین شخصیت تھے۔ گاؤں والے ایک ناخواندہ فرد کی اس جسارت کو پاگل پن کہہ کر آپکا مذاق اڑاتے، جب بھی کسی اخبار میں محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خاں یا اعظم کا نام آتا تھا، آپ کو فوراً پتہ چل جاتا۔ آپ الف ب بھی نہیں پڑھ سکتے تھے، آپ یہ خبریں کیسے سونگھ لیتے تھے؟ کیا آپ کو محترمہ کے نام کے لفظوں میں خوشبو محسوس ہوتی تھی؟ جو بھی پڑھا لکھا شخص آپ کے ہاتھ لگ جاتا آپ اُس کے دروازے پر پہنچ جاتے اور اس تحریر کو اپنی کاپی میں درج کرا کر دم لیتے، کاپی اور پنسل کیلئے پیسے کہاں سے آتے تھے کیونکہ آپکا کوئی ذریعہ معاش تو تھا ہی نہیں اور پھر یہ بھی عجیب بات تھی کہ کوئی پانچ سال پرانا قصہ بھی پوچھتا تو آپ بڑے آرام سے کاپی کے اُسی صفحے پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے کہ یہاں دیکھئے یہیں کہیں درج تھا۔ آپکا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوتا، آپ کی ریکارڈ رکھنے کی عادت سے بہت لوگ تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ صبح سویرے اُن کے دروازے پر کھڑے ہوں اور بے معنی باتیں کاپی میں لکھنے کیلئے کہہ رہے ہوں۔ میں نے رضا کارانہ طور پر آپ کا منشی ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور آپ نے اس حق کو ہمیشہ وقت بے وقت خوب استعمال کیا۔ جب بھی آپ کو کسی اخبار کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا ملتا جس میں مادرِ ملت یا آپکی دیگر پسندیدہ شخصیات کا ذکر ہوتا۔ آپ صبح سویرے ڈیوڑھی پر آکر بیٹھ جاتے اور پیغام بھجواتے آکر اپنی ڈیوٹی ادا کریں۔

آپ کو اپنے بھائی فیض بخش اور بھتیجے فقیر محمد سے، جو میرا بھائی بنا ہوا ہے، سخت شکایت

تھی۔ کہ وہ آپکی شادی کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ آپکی عمر اس وقت پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی مگر آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے گھر میں بیوی ہو جو آپ کے لئے اور آپ کے مہمانوں کیلئے روٹی پکاتی نظر آئے۔ آپ نے شادی کیلئے سارا سامان جمع کر رکھا تھا۔ برتن، زیور وغیرہ ہر ایک کو گھر بلا کر دکھاتے تھے کہ میں نے یہ سارا اہتمام کیا ہوا ہے لیکن میرا بھائی دلچسپی لینے کو تیار نہیں۔ گاؤں والے آپ کو چھیڑ کر آپ سے لمبی داستا نہیں سنتے اور مزہ لیتے تھے۔ ایم گانماں صاحب آپکا یہ اصرار تھا کہ آپ کو ایم گاماں ہی کہا جائے اور میں آپکو ایم گاماں ہی لکھ رہا ہوں کیونکہ میں اب تک اپنے آپ کو آپ کا منشی سمجھتا ہوں۔ میں آپ کی وفات کے بعد بھی اس عہدے سے ریٹائر نہیں ہونا چاہتا کیونکہ ریٹائرمنٹ ہمارے قومی مزاج کے خلاف ہے۔ میری وفاداری دیکھیے کہ میں مر کر بھی یہ عہدہ نہیں چھوڑنا چاہتا میں ایم این اے بھی رہنا چاہتا ہوں اور منشی بھی میرے دونوں عہدے رکھنے سے کون سا آئین ٹوٹ جائے گا؟ اگر ملکہ برطانیہ کا دور ہوتا تو وہ میری وفاداری کی قدر کرتیں۔ انہوں نے اس دھرتی کے چپڑاسیوں، اردلیوں اور منشیوں کو اتنا نوازا کہ ان کی اولادیں آج تک ہم پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ آپ نے وہ گانا تو ضرور سنا ہوگا، جس میں محبت کی انتہا بیان کی گئی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مرنی جان تجھے چاہوں گا
میری بات کا یقین کریں، میں عہدے کی محبت میں ہرگز مبتلا نہیں ہوں
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یہ تو جملہ معترضہ تھا آپ یہ بتائیں کہ آپکے ذہن میں یہ بات کہاں سے گھس گئی کہ محترمہ فاطمہ جناح کی جنگ، جمہوریت کی جنگ تھی، پاکستان کو بچانے کی جنگ تھی، قائد اعظم کی بہن حق پر تھی اور ایوب خان غاصب اور ڈکٹیٹر تھے۔ آپکا کیا تعلق تھا ان چیزوں سے؟ آپ

ایک کچی کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ جسکی چھت معمولی بارش سے ٹپکتی رہتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آپ ایسی جگہ پر کیسے پیدا ہو گئے جہاں پر حکومتوں کیخلاف حرفِ اختلاف کی روایت ہی نہیں تھی۔ آپکی کاپی، آپکی پنسل کیا چیز تھی یہ؟ میں سوچ رہا ہوں، آپ کیوں ہر وقت محترمہ فاطمہ جناح کا ذکر کرتے تھے، نہ آپکا تعلق کتابوں سے تھا نہ شہر داروں سے..... پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کرتے رہتے تھے، آپ پر یہ کیا جنون طاری تھا؟ مادرِ ملت، مادرِ ملت، مادرِ ملت۔ آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوچ رہا ہوں کہ جتنی شدت سے آپ نے محترمہ فاطمہ جناح کا نام لیا تھا اس کی وجہ سے میرے اندر بھی مادرِ ملت سے انسیت پیدا ہوئی تھی، لگتا ہے آپکا یہ پاگل پن اب میرے اندر منتقل ہو گیا ہے۔

آخری عمر میں جب آپ بیماری میں گھرے ہوئے تھے ریگتے ہوئے دروازوں پر آ کر بیٹھتے تھے، آپ دوا کیلئے پیسے مانگنے کی بجائے کاپی نکالتے پنسل آگے کرتے اور چاہتے تھے کہ اُس دن کے ہر اہم واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ مجھے یاد ہے جب آپکے کانپتے ہاتھوں سے کاپی گر پڑی تو آپ نے میری طرف بے بسی سے دیکھا اور کہا! مخدوم صاحب شاید میری یہ آپ سے آخری ملاقات ہے اور اسکے بعد ایم گا ماں تم مر گئے۔ میں تو تمہارے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ آج بیٹھا ہوا تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں، تمہارا شکر گزار ہوں کہ اگر تمہارا جنون نہ ہوتا اور تم محترمہ فاطمہ جناح کا نام اس طرح نہ لیتے تو مجھے جمہوریت کے معنی سمجھنے میں مزید کئی سال لگتے۔ تم میرے گاؤں کے ایسے دانشور تھے جو حرف سے نا آشنا تھے۔ سچائیوں کے اظہار کیلئے لغت ہائے حجازی کا قارون ہونا ضروری تو نہیں۔ تمہیں جہاں سچائی ملتی۔ تم فوراً اسے تاریخ کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم سچائی کے محافظ تھے۔ تم ایک دن کیلئے بھی حکمرانوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ مجھے تو ایوب خان کے باپ اور دادا کا شجرہ بھی آپ نے بتایا تھا۔ ہر آدمی آپ کو بھولا سمجھتا تھا لیکن آپ کتنے دانا تھے۔ آپ بنیاد کو سمجھتے تھے، لوگ شاخوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ بنیادی کام آپ نے کر دیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی وہ تمکنیت، وہ وقار جو میں نے رانا عبدالوحید کی

بیٹھک کی تصویر میں دیکھا تھا تمہاری باتوں سے سمجھا تھا۔ گاؤں کے کسی بڑے زمیندار کے ہاں اس کا کوئی وجود نہ تھا، وہ تو ایوب خان کے گن گار ہے تھے، مفادات کی دنیا میں مگن تھے، تم ایسے درویش تھے جو معاشرے میں سچائی کے بیج بو کر اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے اس کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ سچائی کا بیج اب شجر سایہ دار بن چکا ہے اور اس سے تمہارے وجود کی خوش بو آرہی ہے۔ آپ جیسے لوگ مرجائیں تو معاشرے بانجھ ہو جاتے ہیں، آپ جیسے لوگ کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہتے ہیں، سچائی کی فصل تیار ہو چکی ہے۔

والسلام!

آپ کا مخلص!

جاوید ہاشمی!

نقارے پر چوٹ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادر م اللہ ڈیوایا "مراتی" صاحب!

السلام علیکم!

حالات کی دھندلی سی تصویر میرے ذہن میں موجود ہے کہ آپ کے والد اللہ بخش جب مرنے لگے تو انہوں نے میرے والد محترم سے ملنے کی خواہش کی، اُنکی آخری خواہش کے احترام میں میرے والد انہیں ملنے گئے تو آپ کے والد نے آپ کے بھائی فیض بخش اور آپکا ہاتھ انکے ہاتھ میں دے دیا، آپکی دونوں بہنیں بھی موجود تھیں۔ کہنے لگے کہ میں انہیں آپکے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے آخری ہچکی لی اور ملک عدم کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیشہ اختیار کیا اور اسی کو اپنا روزی روٹی کا ذریعہ بنایا، آپ ہر شادی غمی کا حصہ ہوتے، جب آپ ڈھول بجاتے تھے تو اس میں کوئی خاص ردھم نہیں ہوتا تھا، آپ نے نہ اسے کسی سے سیکھا نہ آپ کو بجانے کا سلیقہ آیا، اسے آپ گلے میں پڑا ہوا ڈھول سمجھ کر بجائے جا رہے تھے، توتی کی آواز سے لگتا جیسے آپ پر تشدد کیا جا رہا ہو مگر اس میں درد کی رمت موجود ہوتی تھی، تمہاری زندگی پھٹے ڈھول کی طرح تھی اور زندگی کا ساز بے آواز تھا۔ آپ کے بھائی فیض بخش نے گھوڑوں کو سدھانا شروع کیا، وہ سائس بن گیا اور فیض بخش سوار کہلانے لگا، اس نے ہمارے گھوڑوں کو دکی اور رقص کی تربیت دی۔ جب وہ سونے اور چاندی سے لدے پھندے پر گھوڑے پر کلف لگی پگڑی باندھ کر بیٹھتا تو توتی اور ڈھول کی تھاپ پر گھوڑوں کے رقص سے ایک سماں بندھ جاتا، فیض بخش کے فن کو داد دینے کے لئے نوٹوں کی بارش ہونے لگتی، فیض بخش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔ فیض بخش زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور اپنی بیوی بھراواں اور بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

آپکا اٹھنا بیٹھنا گاؤں کے اُن لوگوں کے ساتھ تھا جو گاؤں کے زمینداروں کی زیادتیوں

کے خلاف خفیہ میٹنگز کرتے، اسی لئے زمیندار طبقہ آپ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ماحول درباری تھا، مگر آپ کو ”درباری راگ“ نہیں آتا تھا، نہ ہی آپ ”راگ ایمن“ سے واقف تھے اور نہ ”مالکولس“ سے ”بہار اور ملہار“ گانا بھی آپ کے بس کی بات نہ تھی، ”بھیرویں اور راگ جوگ“ سے آپکا واسطہ نہ تھا، آپ میدان میں رہنے والے تھے۔ ”پہاڑی راگ اور تلنگ راگ“ سے آپکی جان پہچان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ”راگ جوگ“ البتہ آپ کے مزاج کے قریب تھا، لیکن اُس میں بھی آپ دسترس حاصل نہ کر سکے۔ البتہ ”راگ دکھشٹی، راگ جے جے ونٹی اور باگشیری“ میں آپ نکابازی کر لیتے تھے، آپ کی برادری کے لوگ آپ کا مذاق اُڑاتے تھے، ویسے بھی آپ ہر ایک کے مذاق کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ آپ کو بخوبی یاد ہوگا ملک کے مایہ ناز گلوکار شہنشاہ غزل مہدی حسن جب بھی مخدوم رشید میں اپنے سسرال والوں کے پاس آتے تو مجھے بھی اکثر ملنے آجاتے تھے۔ وہ شام تم بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے، جب مہدی حسن مجھے ملنے آئے ہوئے تھے۔ انہیں کراچی جانے کے لئے ملتان ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔ اتفاق سے میرا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ میں نے اپنے دوست چوہدری اقبال گجر سے درخواست کی کہ وہ مہدی حسن کو اپنی کار پر ملتان چھوڑ آئیں۔ تم اس واقعے کے چشم دید گواہ ہو، چوہدری صاحب نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ ایک زمیندار تمہاری برادری کے فرد کا ڈرائیور بنے۔ مہدی حسن کی پرواز چھوٹ جانے کا خطرہ تھا میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھنے لگا تو چوہدری صاحب کو اور بھی برا لگا۔ انہوں نے بادل نحواستہ خان صاحب کو کار میں بٹھالیا، وہ تو شکر ہے مہدی حسن کی ٹیکسی بروقت پہنچ گئی، ورنہ چوہدری صاحب نے ساری عمر مجھے کوستے رہنا تھا۔

اللہ ڈیوایا صاحب تم مہدی حسن تو کبھی نہیں بن سکتے بلکہ اس فن کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔ جس معاشرے میں ذات پات کی وجہ سے اس شخص کے لئے احترام نہیں جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے گلے میں بھگوان بولتا ہے تو تمہاری کیا حیثیت؟

مخدوم رشید کے غریبوں کی بغاوت کی تاریخ روس کے انقلاب اور کمیونزم کی آمد سے پرانی ہے۔ گاؤں کے ہندو اور کئی دونوں زمیندار طبقے کی رعایا سمجھے جاتے تھے، انہوں نے مل

کر 1906ء اور 1918ء کے درمیان عدالتوں میں اپنے حقوق کی جنگ لڑی، اس جنگ میں مذہبی تفریق نہیں تھی۔ اگرچہ زمینداروں کو بالادستی حاصل ہوئی مگر اس جنگ کی چنگاری دب نہ سکی بلکہ عرصہ دراز تک سلگتی رہی۔ رزق کی مار بہت سخت ہوتی ہے، آپ کو زندگی زمینداروں کے ٹکڑوں پر گزارنا تھی اور آپ کی اولاد کو بھی۔ میں آپ لوگوں کی جدوجہد کو دیکھتا رہتا تھا، میری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ تھیں۔

آپ کے رشتہ داروں میں سے قادر بخش اور میں میٹرک تک اکٹھے تھے۔ میں نے اُسے بھائی کا درجہ دیا ہوا تھا، قادر بخش اپنے رنگ اور اپنے ناک نقشے سے بالکل افریقہ کا رہنے والا لگتا ہے اور سچی بات یہی ہے کہ پاک و ہند کے اصل حکمران آپ لوگ ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ آپ بالکل اجنبی لگتے ہیں اور ہم باہر سے آئے ہوئے، اس سرزمین پاک و ہند کے مالک بن گئے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تخصیص نہیں، ہندوؤں میں بھی راجپوت ہوں یا براہمن، اکثریت باہر سے آئی اور آپ لوگوں کو اپنا غلام بنا کر اپنی خدمت کیلئے آپ کی درجہ بندی کر دی۔ آپ صدیوں سے اس درجہ بندی کی دیواروں میں قید ہیں، جن کو توڑنے کی آپ سر توڑ کوشش کرتے ہیں، مگر صدیوں کا بنا ہوا جال پھر آپ کو شکار کر لیتا ہے۔ اس جال کا ہر سوراخ مکر و فریب کی چالوں سے بنا گیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی پسماندگی کا سبب یہی ذات پات کا نظام ہے۔

آپ کے بیٹے محمد نواز نے میرے والد محترم کی آخری دنوں میں بہت خدمت کی اور یہ منظر بھی عجیب تھا کہ جب ہم ہیلی کاپٹر میں والد محترم کو اسلام آباد سے ملتان لارہے تھے، ان کی زندگی کی چند ساعتیں باقی تھیں، انہوں نے آپ کے بیٹے محمد نواز کا سر اپنے سینے پر رکھا اور اس کو بھرپور پیار کیا، کافی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ والد صاحب کے اندر کروٹ لینے کی سکت نہیں تھی، وہ آنکھوں سے نواز کی خدمات کی ستائش کر رہے تھے، ان کی آنکھوں میں ہمدردی اور تشکر کا جذبہ تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب آپ کے والد صاحب نے سفر آخرت کے وقت آپ کے تمام بھائیوں بہنوں کے ہاتھ میرے والد صاحب کے ہاتھ میں دے کر آنکھیں موند لیں تھیں۔ ایک نسل سے دوسری نسل کا سفر شروع ہو گیا،

جکڑ بند یوں کا جال اسی طریقے سے قائم ہے، تمہارے بچوں کے بچے اب ہمارے بچوں کے بچوں کی خدمت پر مامور ہو چکے ہیں۔ خلیج گہری ہوتی جا رہی ہے، ندی کے دو کنارے، دو انسانی طبقے، کبھی نہ ملنے کیلئے، ایک دوسرے کیساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ صدیوں کا سفر ہے، ایک طرف بالادستی ہے اور آسائشات ہیں، حکم دینے کی طاقت ہے، دوسری طرف بھوک کی آگ ہے، محکومیت کا طوق ہے اور محنت جسم و جان کا خون۔

اس دن تم کتنے خوش تھے جب تمہاری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا تھا، تمہاری اس خوشی کا تو میں ذکر کرنا ہی بھول گیا جب تمہارے بیٹے آصف نے ایم اے کر کے پورے گاؤں کو حیران کر دیا تھا تمہاری بیوی اور تمہاری بیٹی اس دن ہمارے گھر میں آ کر ہر ایک کو مبارک باد دے رہی تھیں ”سائیں! آپ کے غلام نے سولہ جماعتیں پاس کر لی ہیں“۔ سولہ جماعتیں آصف کی غلامی کی زنجیریں نہ کاٹ سکیں اس کی ماں، بھر جائی جنڈن اور بہن بخشتو اسی طرح ہمارے گھر کے کام میں جتی ہوئی ہیں بڑی مشکلوں سے آصف دیکسی نیٹر ہو گیا ہر وقت شرم و حیا میں ڈوبا رہتا ہے اس کی کمائی سے تمہارے بیٹے نواز کی کمائی زیادہ ہے حالانکہ وہ بھی ٹھمری اور دادرے کے علم سے بے بہرہ ہے کہتا ہے سائیں آصف کی پڑھائی کا کیا فائدہ اس سے تو میں اچھا ہوں۔

میں خط لکھنے بیٹھا تو مجھے معلوم نہ تھا آپ ہسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں، آج گاؤں سے آنیوالوں نے بتایا کہ موت نے یہ جنگ جیت لی ہے اور آپ کے کوچ کا نقارہ بج گیا ہے، میں ہنس دیا، موت بھی مرے ہوؤں کو مارنے میں عجلت دکھاتی ہے۔ اللہ ڈیوایا تم تو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے تمہارے مقدر میں بار بار مرنا کیوں لکھا گیا۔

اب یقیناً تمہارے بیٹوں نے دربار شریف کے دروازے پر نوبت بجانے کا کام سنبھال لیا ہوگا، جس کو سننے کے لئے میرے کان ترس رہے ہیں۔ جب تمہارے بیٹے نقارے پر چوٹ لگاتے ہوں گے تو کانوں میں امرت رس گھلتا ہوگا۔ تمہاری موت پر بھی میں اپنی محرومیوں کا ماتم کرنے لگا ہوں، تمہاری زندگی اور موت کا ذکر تو بس زیب داستان کے لئے تھا۔

خدا حافظ! آپ کا مخلص جاوید ہاشمی!

غلاموں سے بڑھ کر غلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادر محترم محمد رمضان رمضانی صاحب!

السلام علیکم!

تمہارے ساتھ دکھ سکھ بانٹنے کو جی چاہ رہا ہے۔ تم مجھ سے دو سال بڑے تھے، تم نے بطور یتیم زندگی کے سفر کا آغاز کیا اور یہ عجیب سفر محلہ "صدر اٹا" سے شروع ہوا، جہاں پر آپ اور آپ کے خاندان کے چند رہ بیس گھر تھے۔ ہمیں بتایا یہی گیا کہ آپ کے دادا پر دادا کے کنبے کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس لئے آپ کو مسلم شیخ کہا جانے لگا۔ آپ کا تعلق ہندوستان کی قدیمی نسلوں درادڑ اور بھیلوں سے تھا، جو ہندوستان کے اصل باشندے ہیں۔ یہ لوگ صدیوں تک اس سرزمین پر حکمران تھے، آہستہ آہستہ آئیوالوں نے انکا اقتدار چھینا، امریکہ میں (Red Indian) ریڈ انڈین موجود ہیں، آپ لوگ (Black Indian) بلیک انڈین کہلا سکتے ہیں۔ ہندوؤں نے آپ کو مذہبی درجہ بندی میں شودر کا مقام دے کر "آن ٹچ ایبل" (Un-Touchable) قرار دے دیا۔ آپ کسی ہندو کو ہاتھ لگاتے تو وہ پلید ہو جاتا، آپ کا سایہ کسی پر پڑ جاتا تو اس ہندو کو پاک ہونے کیلئے غسل کرنا پڑتا تھا۔ اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کی غلامی آپ پر لازم تھی، صدیوں کا یہی بوجھ آپ کے پیدا ہونے سے پہلے آپ کا منتظر تھا۔ آپ مسلمان ہو گئے تو بھی اس بیماری سے افاقہ نہ ہوا، یہ وہ گھڑی تھی جس میں تضحیک اور توہین (Insult) کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب تک آپ اور دوسرے مسلمان ایک برتن میں نہیں کھا سکتے۔ بچپن سے ہی آپ نے محنت مزدوری کا کام شروع کیا۔ ہماری گائیں، بھینسوں کی رکھوالی کے لئے آپ کو بھرتی کر لیا گیا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ آپ بھی انسان ہیں، ہم بھی انسان ہیں، پھر کیوں ہر بات پہ آپ کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے یہ اعلان کر دیا کہ میں نے رمضانی کو اپنا بھائی بنا لیا ہے۔ میرے اس

اعلان سے آپکی زندگی میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ اب تو آپ زندگی کے آخری حصے میں ہیں یہ دردناک سفر بھی ختم ہونے والا ہے۔ مگر آپ وہیں کھڑے ہیں جہاں سے یہ سفر شروع ہوا تھا۔ آپکا بھائی غلام سرور جو ہمارے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ اندھا ہو گیا تھا۔ آپ کے بھائی الہی بخش نے بھی ساری عمر ہمارے فارم پر کام کرتے گزار دی، آپ کا سب سے بڑا بھائی غلام رسول بھی محنت مزدوری کرتا رہا۔ آپ کی نو جوان نسلیں اور اولادیں بھی اسی طرح دھکے کھا رہی ہیں جس طرح عمر بھر تم نے دھکے کھائے۔ تمہارے بھتیجے قادر بخش نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا یہ تمہارے خاندان کے لئے اعزاز کی بات تھی بیس پچیس سال سے اسے کسی مسجد میں مستقل امامت کا اہل نہیں سمجھا گیا وہ کبھی ایک مسجد میں ہوتا ہے اور کبھی دوسری مسجد میں قصبے کے برہمن اس کے حفظ کو بھی وہ تکریم دینے کو تیار نہیں جو خدا اور خدا کا رسول کسی کو دیتے ہیں اسلام کی یہ درجہ بندی نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ جب ذات پات کی بات ہو تو ہم اسلام کو بھی اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ برصغیر میں غلاموں سے بڑھ کر غلاموں کا نظام اتنی شدت سے مسلط ہے کہ اسلام بھی اُسکے سامنے بے بس ہو گیا، تمہیں انسان تسلیم کرنے کا جو درس پیغمبر اسلام نے دیا تھا وہ بھی رد کر دیا گیا۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم سب سے بڑے مسلمان ہیں اور اسلام کا نظام ساری دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جو نظام ہم مخدوم رشید میں قائم کرنے کیلئے تیار نہیں وہ پوری دنیا میں کیسے قائم کریں گے؟ اسلام تو اپنے وقت کے غلاموں کو پیغمبر کے خاندان میں بطور رشتہ دار قبول کرتا ہے، غلاموں کو سپہ سالاری کا حق دے کر قبیلہ قریش کے سرداروں کو اُن کے زیر نگیں کر دیتا ہے۔ اسلام کا پیغام ابھی تک مخدوم رشید کیوں نہیں پہنچ سکا۔ یہی کہانی پوری قوم کی ہے، ہر شہر کی ہے۔ میں جو باتیں کر رہا ہوں روضی بھائی تم انہیں سمجھ سکتے ہو۔ تمہیں محترمہ فاطمہ جناح کا پورا نام بھی نہیں آتا تھا، تم کبھی انہیں فاطمہ جانا کہتے تھے کبھی فاطمہ جینا کہتے تھے مگر جب تم مجھ سے یہ سوال کرتے کہ قوم نے قائد اعظم کی بہن کو کیوں شکست دی تو میں لا جواب ہو جاتا تھا میں کہتا تمہیں یہ باتیں کرنی کہاں سے آگئی ہیں؟ تمہارے طبقوں کو پیدا

ہوتے ہی سیاسی معاملات سے لاطلق کر دیا جاتا ہے، تمہیں تو ریاستی معاملات کے بارے میں جاننے کا حق ہی نہیں، تمہارے کانوں میں اگر ایسی باتیں آئیں تو ان میں پگھلا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا کیونکہ رموزِ حکومت ”خسرواں دانند“ سچی بات یہ ہے کہ سیسہ ڈالنے کا یہ عمل آج بھی جارہی ہے مگر اب یہ کام کرنے کیلئے جدید طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔

تمہیں صرف اپنے پیٹ کی بھوک کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کو بھرنے کا ایندھن تلاش کرتے ہوئے پوری زندگی گزار دیتے ہو۔ تمہیں پیٹ کے دھندے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں دکھایا جاتا، تمہاری سوجوں کو پیدا ہوتے ہی مصلوب کر دیا جاتا ہے۔ میں تمہیں ایک دفعہ لاہور لے آیا تھا تاکہ تم مزدوری کر کے اپنے بچوں کیلئے کچھ بھیج سکو، میں نے کوشش کی تھی تمہیں اچھا کھانا ملے، اچھی رہائش ملے۔ مگر تمہیں ہر وقت اپنی بیوی بچوں کی یاد ستاتی تھی، وہی بچے جو اب بڑے ہو کر در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، بیماریوں میں جکڑے ہوئے ہیں، تمہاری محبت اُنکے کس کام کی؟ جب تک معاشرہ اپنے لئے ایسا نظام تشکیل نہیں دے دیتا، جس میں پیدا ہونے والے ہر بچے کیلئے معاشی تحفظ موجود ہو، محبت احترام اور یگانگت کے جذبات کی فراوانی ہو، حکومت کا مطلب خدمت ہو، اُس وقت تک اکیلے مرضی کی محبت نہ اپنے بچوں کو متوازن بنا سکتی ہے اور نہ معاشرے کو۔ گاؤں کی محبت نے تمہیں ترقی کیوں نہیں کرنے دی، یہ کیسی محبت ہے جو ترقی کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ اب میں بھی تمہاری طرح سوچنے لگا ہوں۔ مخدوم رشید مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے، میرے دماغ میں ترقی اور محبت، ترقی اور بھوک، ترقی اور جاہلیت سارے الفاظ گڈمڈ ہو رہے ہیں، میں خود کو مزید کنفیوژ (Confuse) نہیں کرنا چاہتا، نہ تمہیں کچھ سمجھانے کی پوزیشن میں ہوں۔

برادرِ مرضی صاحب اگلے روز میں ملاقات کے کمرے میں گیا تو بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا گاؤں والوں کے ساتھ آیا ہوا تھا وہ بالکل تمہارا ہمزاد لگ رہا تھا میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا وہ تمہارا نواسہ ہے۔ اس کی شکل اور لباس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ تمہارا بچپن لوٹ آیا ہے۔ میں نے اس سے تمہارے گھر کے حالات پوچھے اسے اپنے

ساتھ بٹھایا کچھ لوگ میرے لئے میکڈونلڈ سے برگر لائے تھے میں نے اسے بھی کھلائے وہ
 چپ تھا ایک لفظ بھی نہیں بولا گاؤں والوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ تم ہر وقت بولتے
 رہتے تھے شاید تمہارا انجام دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ بہر حال تمہیں
 اب خوش ہو جانا چاہیے کہ تم اب ”برگر“ فیملی بن گئے ہو کیا یہ ترقی کم ہے؟۔

خدا حافظ!

تمہارا بھائی!

جاوید ہاشمی!

بھٹی کا ایندھن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

محترم چاچا محمد حسین "لوہار" صاحب!

السلام علیکم!

میں تمہاری بھٹی پہ آکے بیٹھ گیا ہوں، چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ حضرت داؤدؑ بھی بھٹی پر بیٹھے زر ہیں اور تلواریں بنا رہے ہیں، وہ لوہا کوٹ رہے ہیں۔ اللہ نے انہیں نبوت عطا کی ہے اور لوہے کا علم بھی وڈیت فرمایا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اب وہ بھٹی سے اٹھ کر تختِ داؤد پر جا بیٹھے ہیں۔ علم سے انسانیت کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ایک اور لوہار اپنی دھونکنی پر کپڑا باندھ کر ایران کے بادشاہ ضحاک کے ظلم کیخلاف اعلانِ بغاوت کر رہا ہے یہی درفش کا ویانی انقلاب کی علامت بن گئی ہے۔

روس کے انقلابیوں نے بھی اپنے پرچم پر درانتی اور ہتھوڑے کو ایک عرصہ تک سجائے رکھا اور تازہ خبر یہ ہے کہ ایران میں ایک لوہار کے بیٹے نے صدر مملکت بن کر امریکہ کو لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کر دیا ہے۔

گرمیوں کی صبح ہے، جون کا مہینہ، سورج طلوع ہوتے ہی آگ برسا رہا ہے اور تم نے بھی آگ سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ تم بھٹی میں کونلے جھونکتے ہو۔ تمہارا ایک بیٹا نکلے کی ہتھی چلاتا ہے، تمہاری دھونکنی سے کونلوں کو ہوا لگتی ہے تو وہ دہکنے لگتے ہیں۔ کونلے انگارے بنتے ہیں تو تم ان انگاروں کے درمیان لوہے کا ایک ٹکڑا رکھ دیتے ہو اور کچھ دیر بعد وہ بھی انگارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، تم اسے اٹھا کر لوہے کے گدرد (ہتھوڑا) سے اس پر ضربیں لگانا شروع کر دیتے ہو۔ تمہارے سرخ و سپید چہرے سے پسینے کے شرارے چھوٹتے ہیں۔ ساتھ والی دکان پر تمہارا بھائی غلام نبی بھی یہی کام کر رہا ہے۔ اس کا رنگ قدرے سانولا ہے، اسکے چہرے پر بھی پسینہ تیزی سے بہ رہا ہے، تم دونوں نے اب اپنی داڑھیاں بھی بڑھالی

ہیں اور اللہ سے تعلق قائم کر لیا ہے۔ تمہارے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور تمہارے بھائی کے چہرے پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ تمہارے پاس لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور تمہارے بھائی کے پاس کوئی نہیں بیٹھتا۔ تم خندہ پیشانی سے اپنے کام میں جتے ہوئے ہو اور وہ پیشانی پر سلوٹیں لئے ہوئے ہے، دونوں رزق حلال کی تگ و دو میں ہو۔ اور پھر تمہارے بڑے بیٹے اللہ بخش نے بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر لوہا کو ثنا شروع کر دیا ہے۔

تمہارے لوہے سے کسانوں کیلئے درانگیاں بن رہی ہیں، کھرپے اور میخیں بن رہی ہیں، زمین کھودنے کیلئے کسپاں بن رہی ہیں، ہل چلانے کیلئے پھالے بنائے جا رہے ہیں، جو زمین کا سینہ چیر کر رزق اگانے کے کام آتے ہیں۔ تمہارا کام لوہے کو نرم کر کے موم بنانا ہے۔ اس سارے کام میں تمہارا خون شامل ہے، تمہاری پسلیاں گرم لوہے کی حدت سے پگھل گئی ہیں تمہاری کمر میں خم آ گیا ہے، تم نماز پڑھنے کیلئے جاتے ہو تو سیدھے ہو کر نہیں چل سکتے۔ اب تمہاری بلغم میں خون آنا شروع ہو گیا ہے، دمہ کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے، تمہارا چہرہ اب پیلا رہنے لگا ہے، تم صبح کی نماز میں موجود ہوتے تھے اور عشاء کی نماز میں بھی، جیل میں یہ خبر آ گئی ہے کہ تم اب اس دُنیا سے روانہ ہو گئے ہو۔ تمہارا بیٹا احمد بخش جو میرے ساتھ دو تین کلاسوں تک جاسکا، کبھی ریڑھی پر پھل بیچتا ہے اور کبھی تمہاری دکان پر جا کر کام شروع کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کے پاس اب کوئی گاہک نہیں ہے۔ ہل چلانے کا کام ٹریکٹروں نے سنبھال لیا ہے۔ تمہارے گاہک اب مشینوں کی ترقی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پہلے بھی تمہاری مزدوری طے شدہ نہیں تھی۔ سال کے بعد زمیندار اپنی مرضی سے جو کچھ تمہارے پلے میں ڈال دیتے تم خوشدلی سے لے لیتے۔

سنا ہے تمہارا بیٹا اللہ بخش اب شہر چلا گیا ہے۔ وہاں اسے کوئی خاص مزدوری نہیں ملی۔ احمد بخش تو زندگی کی چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ پُرس رہا ہے، اسکی آنکھیں بینائی سے محروم ہوتی جا رہی ہیں، تم انہیں وراثت میں غربت اور افلاس کے سوا کچھ دے کر بھی تو نہیں گئے، یہی وراثت تم نے اپنے والد سے پائی تھی۔ تمہارے بچے تعلیم سے کوسوں دور تھے۔ اب

تمہارے بچوں کے بچے بھی سکول سے نا آشنا ہیں اور معاشرے کی بھٹی کا ایندھن بننے کیلئے تیار ہو چکے ہیں۔ اُنکا جسم انگارے کی طرح جل اٹھا ہے اور یہ انگارہ بجھ کر راکھ بننا چاہتا ہے، اپنی دھرتی کی اسی راکھ کا حصہ جس نے اسے جنم دیا تھا۔ اس راکھ کو کریدنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں، مگر میں نہ جانے کیوں اس راکھ کو بار بار کرید رہا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میرے والد صاحب آپ کو بھی اپنا بھائی کہتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ غریب لوگوں سے پیار مجھے اپنی ماں کی طرف سے ملا۔ بندی خانہ میں بیٹھ کر سوچنا شروع کیا تو ہر فرد کے بارے میں عجیب انکشاف ہوا، کہ میرے والد محترم نے اُن تمام محنت کشوں کو جو اُن کی عمر کے تھے، اپنا بھائی کہا اور جو چھوٹی عمر کے تھے اُنہیں بیٹا بنا لیا۔ یہ سارا ورثہ میرے والد نے میرے لئے چھوڑا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ جب آپکے بال بچوں بیٹوں، پوتوں کو اسی حالت میں دیکھتا ہوں، جس حالت میں آپکے والد اور دادا تھے۔ تو مضطرب ہو جاتا ہوں۔ درد کی ٹیسس اُبھرتی ہیں۔ یہ بیماری ناقابل علاج نہیں اس کا علاج کیا جاسکتا۔ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی چارہ گرل جائے تو درد کی انجمن راحت کی محفل میں بدل سکتی ہے۔ اس چمن کے پھول مہک سکتے ہیں اور انگارے لوہے کو موم بنا سکتے ہیں! خدا حافظ!

آپکا مخلص

جاوید ہاشمی!

ہم سب بھٹہ مزدور
بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب خدا بخش " نک " صاحب!
اسلام علیکم!

آپ کو اس دُنیا سے رخصت ہوئے تیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا۔ آپ ماموں
ہدایت شاہ کے ملازم تھے اور ایک طاقتور مالک کی بھینسوں کی نگرانی کرنے کی وجہ سے آپ کا
ارد گرد کے غریبوں پر بہت رُعب اور دبدبہ تھا۔ آپ اس بات کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔
آپ کا اس طرح اترانا ایک حد تک بجا بھی تھا۔ آپ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ آپ کی بیوی اس
دُنیا سے جا چکی تھی۔ بیٹے کو آپ نے ماں کا پیار بھی دیا اور باپ کا بھی۔ آپ کا یہ لاڈلا اللہ
ڈیوایا جب بڑا ہوا تو اس نے اپنی آزاد دنیا پیدا کی۔ کسی ایک فرد کا ملازم ہونے کی بجائے
اس نے آزاد پیشے کا انتخاب کیا۔ ان دنوں لوگ کچی دیواریں بنواتے تھے، اُس نے اسی کو
اپنا کسب معاش بنایا۔ جب اُس کی ہڈیاں اس جان لیوا مشقت کو برداشت نہ کر سکیں تو اُس
نے اپنے پیشے کو بدل لیا اور اب مٹی کی کچی اینٹیں بنانے لگا۔ اُس نے قبرستان کے درمیان
اپنی کٹیا بنالی۔ یہ جھونپڑی شہر کے بڑے لوگوں کیلئے ناقابل برداشت تھی کیونکہ گاؤں کی
زمین پر تمہارا کوئی حق نہ تھا۔ اس جھونپڑی کو برقرار رکھنے کیلئے اُس نے رات دن ایک کر
دیا۔ وہ با اثر زمینداروں کے پاس پہنچ جاتا ان کے چھوٹے موٹے کام کرتا اور وہ اُس کی مدد
کرتے۔ اُسکی چھوٹی سی گستاخی جھونپڑی پر قہر بن کر گر سکتی تھی، اسلئے وہ تمام ڈیروں کے
طواف کرتا رہتا۔ کبھی بھولا بن کر، کبھی مسخرہ بن کر اس جھونپڑی کا تحفظ کرنے میں کامیاب
ہو جاتا۔ جب اُس کے بیٹے پیدا ہوئے تو اُس نے جھونپڑی کے گرد ایک کچی دیوار کھینچ لی
اور اس طرح قبروں کے درمیان ایک نئی قبر بن گئی۔ اُس کے بچے بڑے ہوئے تو انھوں نے
بھی کچی اینٹیں بنانا شروع کیں۔ لیکن اب کچی اینٹوں کا گاہک سوائے تازہ قبر بنانے والوں
کے کوئی نہ تھا۔ اللہ ڈیوایا کے دونوں بیٹے بھٹہ مزدور بن گئے، گویا انہوں نے ترقی کا ایک اور

زینہ طے کر لیا، (بھٹوں کو چلانے والوں میں میرے عزیز، رشتہ دار اور اقربا بھی ہیں)۔ ہمارے گاؤں کے ارد گرد پندرہ بیس پکی اینٹوں کے بھٹے ہیں جنکی چینیوں سے نکلنے والا دھواں پورے علاقے کی ہوا کو مسموم کر رہا ہے۔ وہاں پر کام کرنے والوں کی غلاموں کی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے، غلاموں کی طرح یہ سلسلہ کئی نسلوں تک چلتا ہے۔ بیشتر خاندان بھٹے پر پیدا ہوتے ہیں اور وہیں کام کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔ اس غلامی میں اُن کی بہنیں، بیویاں، بیٹیاں، مائیں، چچیاں، خالائیں سب ان کیساتھ شریک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اخراجات کیلئے بھٹے مالکان سے مزدوری پیشگی کے طور پر لیتے رہتے ہیں۔ پیٹ کی بھوک نہیں مرتی تو مزید پیشگی لے لیتے ہیں، مالکان کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ پیشگی لے لیں۔ جب وہ مقرض ہوں تو محکوم اور مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ان مزدوروں میں سے اگر کسی کے اندر آزادی کی تڑپ بیدار ہو جائے تو دوسرے بھٹے مالکان سے جا کر کہتا ہے کہ آپ میرے پیسے ادا کر دیں، میں پہلے مالک سے آزاد ہونے کیلئے تیار ہوں۔ دوسرا مالک اس بات کو قبول کر لیتا ہے اور ایک سے دوسرے آقا کی غلامی کا طوق گلے میں پڑ جاتا ہے۔ آقاؤں کے طور طریقے ایک جیسے ہیں۔ نئے مالک کے ہاں زیادہ کڑی شرائط پر کام کرنا پڑتا ہے، مزدور کی بہو، بیٹیاں بھی بھٹے مالکان کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں۔ جب کوئی بھٹے مزدور اس ملکیت پر اعتراض کرتا ہے تو اُسے تیسرے بھٹے مالک کی غلامی میں جانا پڑتا ہے اور یہ سفر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے طول و عرض میں جاری رہتا ہے۔ بہت سارے جھگڑے مقدمات جو میرے سامنے پیش کیے جاتے تھے، اُن میں ایسے واقعات سامنے آتے تھے، جنہیں سن کر دل دہل جاتا تھا۔ اگر بھٹے مزدور بھاگ کر کوئٹہ چلا جائے تو غلامی اس کا پیچھا کرتی ہے۔ کبھی کوئٹہ، کبھی راولپنڈی، کبھی ملتان سے لاہور، کراچی تک دُور دراز علاقوں میں اُن کے سودے ہوتے ہیں۔ بھٹے مالکان کے اصولوں کے مطابق نئے مالک کو بھٹے مزدور کے تمام واجبات سابقہ مالک کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ زندگی میں بارہا وہ نئے مالک کے نئے غلام ہوتے ہیں لیکن ہر نیا آقا پرانے آقا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اگر مزدور مر جائے تو اس کی اگلی نسل اس قرضے میں کام

کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ منڈیاں بچتی ہیں، غلام بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ انہیں ارد گرد کی دُنیا کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں ہوتا۔ جس طرح مقروض ملک اور مقروض قومیں امیر ملکوں کی ریغمال بنی ہوتی ہیں۔ ان کی کئی نسلیں قرضوں میں جکڑی ہوتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں، ہم بھی بھٹے مزدوروں کی طرح ورلڈ بینک کے قرضے میں جکڑے جاتے ہیں، ورلڈ بینک کے قرضوں سے بچتے ہیں تو ایشیائی بینک کے قرضوں میں جکڑے جاتے ہیں، ایشین بینک کے قرضوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں تو مقامی منڈیوں کے ساہوکاروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ ہم سب بھٹے مزدور ہیں، ہماری کوئی عزت نہیں، ہماری کوئی غیرت نہیں، ہمارے مالک ہمیں اس بات کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم اپنی مرضی کا راستہ اختیار کریں یا اپنی مرضی کی معیشت کھڑی کریں یا اپنی مرضی کا طرزِ زندگی اختیار کریں یا اپنی مرضی کے حاکم بن سکیں۔ ہمارے حاکموں کی پوزیشن بھٹے مالکان کے منشی جیسی ہوتی ہے جو بھٹے کے اندر مزدوروں پر بادشاہت کر رہا ہوتا ہے۔ چار آنے زیادہ مزدوری دے کر ان کو اپنا محکوم بناتا ہے۔ اُن میں سے کچھ لوگوں پر نظر عنایت کر کے اپنی پارٹی بناتا ہے جو بھاگنے والے مزدوروں کی مخبریاں کرتے ہیں اور انہیں پکڑوا دیتے ہیں وہ بیچارے بھٹے مالکان کی جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ جو منشیوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، منشی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور منشی کی خواہش پر اپنی تمام غیرت اور عزت قربان کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ وہ بھٹے کے اندر برسرِ اقتدار پارٹی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی منشی مالک کے ایک فون پر بھٹے مزدوروں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ بھٹے مزدور اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے نہ ان کی آواز کوئی سننے والا ہوتا ہے۔ ہم سب بھٹے مزدور کی زندگی گزار رہے ہیں، خدا بخش! ہمارے بھٹے مالکان سات سمندر پار بیٹھے ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

اگر ہم آقا کو بدلنے کی کوشش کریں تو پہلے سے سخت آقا آتا ہے۔ آقا کے بھیجے ہوئے منشی پہلے سے زیادہ سختی کرتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی کا منشی لگانے کا تصور نہیں کر سکتے۔ ہم چاہیں کہ منشی تبدیل کرالیں تو یہ دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھٹے مزدور یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں کیوں نہیں ہیں، وہ ترقی جو دوسرے ملکوں میں ہے اگر وہ ترقی

پاکستان میں ان بھٹے مزدوروں تک پہنچ پاتی تو مٹی کو پکی اینٹوں میں ڈھالنے کیلئے مشینیں ہو تیں، انسانوں کی توقیر ہوتی۔ اگر بھٹے مزدوروں کیلئے بھی معاش کے دوسرے طریقے موجود ہوتے تو وہ اس غلامی پر رضامند نہ ہوتے۔

جو تو میں آزادی کی لطافتوں اور برکتوں سے آشنا ہو چکی ہیں وہ آزادی برقرار رکھنے کیلئے جانیں قربان کرنے کیلئے بھی تیار ہیں۔ مگر جو تو میں ایک منشی کی جکڑ بندی میں کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پہ پٹی باندھ کر ایک ہی دائرے میں چلتی رہتی ہیں آزادی اُن کے قریب نہیں آتی۔ بھٹے مزدوری کوئی جرم نہیں ہے لیکن مزدوری کو غلامی اور بے حرمتی میں تبدیل کرنا جرم قرار دیا جانا چاہیے۔ اس منشی اور بھٹے مالک کو اٹھا کر پھینک دینا چاہئے جو اپنی جکڑ بندیوں سے بھٹے مزدور کی عزت نفس بھی چھین لیتا ہے اور اس کی خوشیوں کو کچلنا چاہتا ہے۔ میں اگر بھٹے مزدور بن کر اللہ ڈیوایا کے بیٹوں کیساتھ بیٹھ کر اینٹیں بناؤں تو اس سے میری انا کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچتی۔ اگر قانون میرا محافظ ہے، میرے بچوں کیلئے تعلیم کے مواقع موجود ہیں، ریاست اور حکومت میرے بچوں کے لئے میرے دروازے پر تعلیم کا پیغام لئے کھڑی ہے، تو مجھے بھٹے مزدور ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ صرف "تعلیم سب کیلئے" کا نعرہ لگا دینا کافی نہیں ہے۔ میرے بچوں کیلئے ایک ایسا ملک چاہئے جو صحیح معنوں میں مادر وطن ہو۔ ایسی ماں جو صبح سویرے اپنے بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجتی ہے، ایسی ماں جو بیمار بچے پر قربان ہو جاتی ہے، ایسی ماں جو اپنے بچوں کیلئے ناشتہ تیار کرتی ہے، ایسی ماں جو اپنے بچوں کا تن ڈھانپنے کیلئے اچھے سے اچھا کپڑا لاتی ہے، ایسی ماں کی ضرورت ہے۔ ہر وطن ماں ہوتا ہے۔

خدا بخش نک صاحب! آپ کو نک اس لئے کہتے تھے کہ آپ بہت نک چڑھے تھے، ہم تو نک چڑھے بھی نہ رہے۔ ہم تو تا بعد اقسام کے مزدور ہیں۔ ہم نئے عالمی نظام میں اپنی ملکی آزادی کو گروی رکھ چکے ہیں۔ تمہارے پوتے ہی بھٹے مزدور نہیں، ہم سب اس بین الاقوامی نظام میں بھٹے مزدور کی شکل میں کھڑے ہیں اور بھٹے کا منشی، کاتب تقدیر بن چکا ہے۔ وہ ہمارا مقدر لکھتا ہے اور ہم سر جھکا کر اسی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔

خدا بخش نک صاحب! اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ تمام کھیت مزدور بھی مزدور نہیں رہے بلکہ غلام بن رہے ہیں۔ ایک مالک سے دوسرا مالک انہیں خرید لیتا ہے اور ان کے مرنے پر ان کی نسلیں غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہن لیتی ہیں۔ (Market Economy) مارکیٹ اکانومی نے فیکٹری مزدوروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ ان کے حقوق غصب ہو چکے ہیں، جو حقوق انہیں پوری دنیا نے دے رکھے ہیں، پاکستان میں وہ اُس کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے اور اگر بھول کر مطالبہ کر بیٹھیں تو بیروزگاری کا اژدھا انہیں ہڑپ کر لیتا ہے اور وہ بھوک کے سامنے سر خم کر دیتے ہیں۔ اس آپادھاپی کے دور میں اُن کسانوں کی مراعات کی بات کرنیوالوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ معاشی غلامی سے آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہوتی جا رہی ہے اور سیاسی آزادی کا عدم وجود معاشی غلامی کا باعث بن رہا ہے۔ اس چکر میں گھومتے ہوئے زندگی گذر جاتی ہے اور نئی نسل اس طوق کو اٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے جو پرانی نسل کے مرنے پر ان کے گلے سے اتارا جاتا ہے۔ بہر حال خدا بخش نک صاحب آپ کو مبارک ہو کہ اب آپ کے پڑپوتے ننگے پاؤں چائے کے کھوکھے پر مزدوری کر رہے ہیں تم بھینسوں کی خدمت کرتے تھے وہ انسانوں کی خدمت کر رہے ہیں، یہ ترقی نہیں تو کیا ہے؟

اللہ کے حبیب ﷺ نے کہا:

”الکاسب حبیب اللہ“

(مزدور اللہ کا حبیب ہے)

اللہ کے حبیب ﷺ کی خوشنودی کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کے حبیب (مزدور) کی خوشنودی حاصل کریں۔ آخرت کی نجات کے لئے ہی سہی، مزدور کا نظام نافذ کرنا ہوگا، ورنہ نہ دین کے رہیں گے نہ دنیا کے!۔

خدا حافظ!

آپ کا مخلص!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

علامہ ابوالخیر اسدی صاحب!

السلام علیکم!

آپ کو دنیا چھوڑے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا ہے۔ آپ ہمارے خاندان کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ علم کے حصول کے لئے آپ نے ایران، عراق، شام، بیت المقدس، حجاز اور مصر کا طویل سفر کیا اور جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس گاؤں تشریف لے آئے۔

آپ نے ایک چھوٹی سی مسجد میں بیٹھ کر وعظ و نصیحت اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا پھر تصنیف اور تالیف کے ذریعے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ آپ نے مسلمانوں کے عقائد میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ آپ کا یہ قدم جرأت مندانہ تھا کیونکہ ہم میں سے اکثر اکابر پرستی کا شکار تھے اور اپنے بزرگوں کی نیک نامی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے اور ان کے نام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے تھے۔ آپ کے خیالات ”پیران حرم“ کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ آپ نے دین کا استحصال کرنے والے طبقہ کو ہر قدم پر لاکرا، آپ کے ارد گرد ایک جماعت کھڑی ہو گئی۔ غریب طبقات کو آپ کی انقلابی باتیں بہت پسند آئیں۔ مسجد کے ارد گرد کی عمارتیں خرید کر مسجد کو وسیع کر دیا گیا۔ آپ نے اس میں بچوں کے ساتھ بچیوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کرایا۔ میری بیٹی میمونہ بھی اسی درس کے اساتذہ کی محنت سے گھر میں بیٹھ کر قرآن حکیم کی حافظہ بن سکیں۔ یہ سعادت ہمیں آپ کے طفیل نصیب ہوئی۔

آپ کی لائبریری کی شہرت دور دور تک تھی۔ آپ نے زندگی عمرت اور تنگدستی میں گزاری۔ آپ کا کھانا بہت سادہ ہوتا تھا۔ آپ کے عقیدت مند آپ کی بہت خدمت کرتے مگر جب تک آپ ان پیسوں کو خرچ نہیں کر لیتے آپ کو آرام نہ آتا۔ آپ یا تو

کتابیں خریدتے یا ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر دیتے۔ آپ کے بچوں نے بھی بہت مشکل وقت گزارا۔ آپ نے ان کے مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ آپ کا بیٹا ابو بکر شروع سے میری سیاسی معادنت میں پیش پیش رہا ہے، اب وہ پرائمری کا استاد ہے، اور آپ کا پوتا چھوٹا سائیکینشن۔ آپ کی دوسری اولاد بھی چھوٹے موٹے کام کر کے گزر بسر کر رہی ہے۔ آپ کا کردار ہم سب کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ آپ نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں مگر مجھے آپ سے گلہ ہے کہ آپ نے اسلام کا محدود تصور پیش کیا۔

چھوٹی موٹی معاشرتی برائیوں پر آپ نے ہزاروں تقریریں کر ڈالیں مگر جو معاشرتی حل اسلام پیش کرتا ہے، آپ نے اس کے بارے میں کوئی تصور لوگوں کے ذہن میں جا گزیر نہ کیا۔ آپ کی اور مولانا نور احمد فریدی کی تقریروں سے تصادم کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ سارا گاؤں عقائد کی بنیاد پر ایک دوسرے کو ہیچ سمجھتا تھا ایسے لگتا تھا کہ دونوں فرقوں میں سے ایک ضرور گمراہ ہو چکا ہے۔ حالانکہ آپ دونوں فقہ حنیفہ کے پیروکار تھے۔ آپ کی تقریروں سے محسوس ہوتا تھا کہ دونوں میں سے ایک فرقہ ضرور جہنم میں جائے گا۔ ایسا کیوں تھا؟

میں نے گذشتہ نصف صدی میں بارہا آپ کی امامت میں نماز پڑھی ہے۔ اور آپ کی تقریروں سے رہنمائی حاصل کی ہے، پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کے عمل سے، جو اسلام سامنے آتا ہے، معاشرہ کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کا نام ہے، انسان کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے، وہ انصاف فراہم کرتا ہے اور امن کے ساتھ زندگی گزارنے کا ڈھانچہ بنا کر دیتا ہے۔ کمزور طبقات کو بالا دست کرنے کا ہنر بتاتا ہے۔ انسانی تفریق و تقسیم کے خاتمے پر زور دیتا ہے، انسان کی تکریم اور تعظیم کرتا ہے، اسلام انسان کو معراج پر پہنچانے کیلئے زمان و مکان کی پابندیوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور انسانی معاشرے کو پستیوں سے نکال کر بلندی پر لے جاتا ہے۔ سارے نظام کے تانے بانے فرد کی آزادی کیلئے اور انسانی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے بنتا ہے، وہ کہتا ہے بھوک کفر کے قریب لیجاتی ہے اور پھر بھوک ختم کرنے کا حل بتاتا ہے۔ اپنے آپ کو ایک محدود حلقے کے اندر قید کر لینے کا تصور مجھے اسلام

میں کہیں نظر نہیں آیا میں نے آپ کو کبھی کسی مفصلی یا کم درجے کی ذات والوں کے ساتھ بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ کاش آپ زندہ ہوتے اور اس بات کا جواب دیتے، شاید میں ماحول کی وجہ سے سوال کرنیکی جسارت ہی نہ کرتا، کیوں؟ آخر کیوں؟ پیغمبر ﷺ سے سوال کیا جاسکتا ہے، صحابہ کرامؓ سے سوال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن آج کے عالم دین سے سوال کرنے کی جرأت میرے جیسے آدمی کے اندر بھی نہیں ہے، میں آپ کے سامنے سوال نہیں کر سکتا تو کون کرے گا۔ آپ سے سوال؟ مگر اسلام اور قرآن تو بار بار کہتا ہے کہ پوچھئے! صرف موسیٰ کو خضر نے پابند کیا تھا کہ سوال مت کرو۔ ہمارا ہر عالم دین خود کو خضرِ راہ بنا کر پیش کرتا ہے مگر دوسروں کو موسیٰ جتنی آزادی نہیں دیتا ایسا کیوں ہے؟۔

والسلام!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

حضرت مولانا نور احمد فریدی صاحب! السلام علیکم!

جناب والا! میں آج کچھ گذارشات کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اُمید ہے آپ مجھے اس گستاخی پر معاف فرمائیں گے۔ جناب والا میں نے جب ہوش سنبھالا تو جامعہ مسجد کو ویران پایا۔ فرش اکھڑا ہوا تھا، وضو کرنے کی جگہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، ابا بیلوں نے ڈیرے جمار کھے تھے، نمازی اپنے امام کی طرز زندگی کے شاکی تھے۔ اس دوران آپ کو اس وسیع و عریض پانچ گنبد والی مسجد میں امامت کا فریضہ سونپا گیا۔ اہل شہر نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ آپ کے آتے ہی مسجد میں رونق ہو گئی۔ آپ نے مدرسہ قائم کیا، میں نے بھی قرآن حکیم آپ سے پڑھا، پھر لاؤڈ سپیکر آ گیا، اس میں اذان کہنے اور اللہ کا پیغام آگے پہنچانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آپ کے خطبات میں جوش اور ولولہ ہوتا تھا، آپ کی علیست کا رعب لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ میں نے آپکی تقاریر کے ذریعے مثنوی مولانا روم سنی، عبدالرحمن جامی کا کلام سنا، سعدی شیرازی کی نصیحتیں سنیں، آپکی تقاریر کے ذریعے صحاح ستہ کو سمجھنے کا موقع ملا۔ عموماً آپکا موضوع مقام مصطفیٰ ﷺ رہا۔ اس موضوع پر آپ نے بہت محنت کی اور حضور ﷺ سے محبت کی خوشبو کو چار سو پھیلا یا۔

مجھے جب بھی موقع ملا جمعہ کی نماز آپ کی امامت میں ادا کی۔ آپکے اندر دولت جمع کرنے کی خواہش نہ تھی۔ آپ شمع رسالت ﷺ کے ایسے پروانے تھے جو جل مرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ آپکے بچوں میں ایک بیٹا پرائمری سکول کا ٹیچر ہے، دوسرا بیٹا انوار الحق میرے پاس ڈرائیور کے طور پر کام کرتا ہے۔ دنیاوی طور پر آپ نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا یا۔ آپکے کئی ایسے شاگرد موجود ہیں جو پاکستان ٹیلی ویژن پر پورے ملک کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے روشناس کراتے رہتے ہیں۔ اس سب کے باوجود مجھے قید خانے کے اندر کچھ سوالات کرنے کی جرأت ہو رہی ہے۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ میں نے آپ کو اسلام کی معاشرتی زندگی کو عملی طور پر پیش کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ میں نے ابوالخیر اسدی (شاہد صاحب) کی طرح آپ کو بھی کسی غریب مصلیٰ کے ساتھ ہم مجلس ہوتے نہیں دیکھا، اسلام انسان کو مساوات کا سبق دیتا ہے، اسلام کہتا ہے کہ صفائی آدھا ایمان ہے، آپ کو صفائی کے اوپر تقرر کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔ اسلام کہتا ہے کہ لوگوں کی، یتیموں کی، بیواؤں کی مدد کی جائے، اس کیلئے میں نے آپ میں عملی طور پر کوئی تنظیم بنانے کی تحریک نہیں دیکھی۔ اسلام یتیموں، بیواؤں کے علاوہ کام کرنے والے مزدوروں کیلئے فلاحی ادارے بنانے کا حکم دیتا ہے، میں نے کبھی آپ کو گاؤں میں یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کا مقام اور آپ کا ادب اپنی جگہ لیکن مجھے ایک عالم دین، ایک پنڈت یا ایک پادری کی زندگی میں فرق نظر آنا چاہیے۔ ذاتی زندگی میں میں نے دیکھا ہے کہ ایک پادری کے کردار پر بھی انگلی نہیں اٹھائی جاتی، میں نے ایسے پنڈت بھی دیکھے ہیں، جن کا ذاتی کردار بھی بہت بلند ہوتا ہے۔ تقریر میں بھی وہ انسان کی عزت اور عظمت کی بات کرتے ہیں، اللہ کی وحدانیت کیلئے لوگوں کو تیار بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ مذہب کو نظریہ حیات کے طرز پر پیش نہیں کرتے۔ جبکہ اسلام تو آیا ہی مکمل زندگی کا نمونہ پیش کرنے کیلئے ہے۔ آپ کے ہاں مسجد میں بیٹھ کر اسلامی طرز معاشرت کیلئے کوئی پیغام سنائی نہیں دیتا۔ ایک روایتی انداز سے عبادات کو عملی زندگی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ روزمرہ کے معاملات میں آپ کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ آپ خود کو الگ تھلگ رکھ کر صرف واعظ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ میں نے فلسفیانہ موشگافیوں پر آپ کی سینکڑوں تقریریں سنی ہیں جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ لوگوں کو یہ نہیں بتاتے کہ قرآن دنیا میں چلنے پھرنے کی تلقین کرتا ہے اور بار بار کہتا ہے!

”افلا تدبرون افلا يتفكرون“

(وہ غور فکر کیوں نہیں کرتے)

پھر کہتا ہے:

”سیرو فی الارض فی نظر و کیف کان عاقبت الذین من قبل کم“

(زمین میں چلو پھرو تا کہ پہلے والوں کی عاقبت دیکھ سکو)

آپ کی تقریر کے دوران کوئی بھی کھڑا ہو کر سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور سارے لوگ، وسیع جائیدادوں کے مالک، وزراء، آئیٹمز آپ کے سامنے دوزانوں ہو کر زمین پر بیٹھے ہوتے ہیں، آپ کا یہ مقام آپ سے بہت ساری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ گونگے ہو کر بیٹھ جائیں اور صرف آپ کی باتیں سنیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبے میں بار بار مداخلت ہو سکتی ہے تو آپ سے سوال کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام تو عمل کی دنیا کا مذہب ہے، عقیدے پر زور دیتا ہے اور عمل کیلئے تیار کرتا ہے، دنیا کیلئے بھی اور آخرت کیلئے بھی۔

ہمارے علماء معاشرے سے کٹے ہوئے افراد ہیں حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

لا رہبانیۃ فی الاسلام

”اسلام میں رہبانیت نہیں“

دعا بھی سکھائی ہے کہ

”ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة“

(اے رب میری دنیا بھی بہتر بنا اور آخرت بھی)

عیسائی مشنری انسان کو بنیاد بنا کر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے عیسائیت کے عقائد لوگوں کے اندر اگرچہ اتنے گہرے نہیں گئے، لیکن عیسائیت کا نام پوری دنیا میں پہنچا ہوا ہے۔ عیسائیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اس کے باوجود کہ عیسائیت میں رہبانیت کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ ہمارے منبر و محراب پر رہنے والے لوگوں نے رہبانیت کا اثر زیادہ لے لیا ہے، وہ گندگی صاف کرنے کیلئے خود گندگی میں اتر کر اپنے کپڑوں کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے، تو پھر گندگی صاف کون کرے گا؟ گندا آدمی۔ دین کا فہم ابھی تک نظریے سے گزارا جا رہا ہے، تجربے کی لیبارٹری سے نہیں گزارا جاتا۔ مولانا صاحب! میں نے آپ کی

تقاریر چالیس پینتالیس سال سنیں، عمل اور نظریے میں فاصلہ ہے۔ نظریہ دو قدم آگے بڑھ کر عمل میں کیوں نہیں ڈھلتا، مجھ پر گستاخ ہونے کا فتویٰ نہ لگا دیجئے گا اور نہ ہی مجھے بد عقیدہ کہنے کا عمل شروع کر دیجئے گا، میں آپ کے مقتدیوں سے بہت ڈرتا ہوں، میں نے تو ان سے ووٹ لینے ہیں، اگر آپ نے مجھے ان کی نظر میں بد عقیدہ قرار دے دیا تو میرے لئے مشکلات کا دور شروع ہو جائیگا مگر میں کیا کروں میں چپ نہیں رہ سکتا، پوچھنا چاہتا ہوں کہ کب ہمارا عالم دین نظریہ سے عمل کی تجربہ گاہ میں داخل ہوگا۔ جب یہ نظریہ تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے تو کربلا برپا ہو جاتی ہے یہ کربلا آئیوالی صدیوں کے خدو خال ذہن میں واضح کر دیتی ہے، اس ایک عمل سے اتنی روشنی پھوٹتی ہے کہ دور صدیوں تک پڑی ہوئی چیزوں سے گرد ہٹ جاتی ہے، آنکھ رکھنے والا ہزاروں سال تک کے واقعات کو دیکھ سکتا ہے۔ صدیوں سے آگے تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر پڑے ہوئے پردے آنکھوں سے ہٹا دیئے جاتے ہیں لیکن یہ عمل کی بھٹی بہت سخت بھٹی ہے۔ ابو جہل کو اس میں کچھ نظر نہیں آتا حالانکہ وہ حکمت کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ مگر بلال کو ایران اور روم کی مٹی ہوئی سلطنتیں بھی نظر آ جاتی ہیں شاید اقبال نے اسی لئے کہا تھا:

ملا کی ازاں اور ہے مجاہد کی ازاں اور

والسلام!

آپ کا نیاز مند

جاوید ہاشمی

گیلی لکڑی کے آنسو

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

محترمہ زینب "دانی" صاحبہ! السلام علیکم!

مجھے بتایا گیا کہ میرے پیدا ہونے کے بعد آپ نے بطور دانی اماں مجھے پالا پوسا، ایک دن تمہارے گھر میں داخل ہوا تو ایک میت چار پائی پر پڑی تھی اور تم زور زور سے رو رہی تھیں۔ تمہارے نالہ و فریاد اور آہ و شیون نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا، پتہ چلا کہ تم بیوہ ہو گئی ہو۔ یہ میت تمہارے خاوند کی ہے۔

خدا بخش تمہیں شہر سے بیاہ لایا تھا۔ اس کی اور تمہاری عمر میں بہت فرق تھا۔ تم بمشکل آٹھ نو سال سہاگن رہی تھیں۔ اس دوران تمہاری چار بیٹیاں اور دو بیٹے ذوالفقار اور عبد اللہ پیدا ہوئے۔ خاوند کی موت کے بعد تمہارے سر پر چھ بچوں کا بوجھ تھا۔ گاؤں میں تمہارا کوئی رشتہ دار نہ تھا، تمہارے خاوند کے کنبے نے خدا بخش کے مرتے ہی تم سے منہ موڑ لیا۔ تم نے والدہ محترمہ کے ہاں پناہ لی اور ہمارے گھر کو میکہ بنا لیا۔ تمہارے شہر کے رشتہ داروں نے بھی کبھی پلٹ کر تمہاری خبر نہ لی۔

تمہاری بیٹیوں نے ہمارے گھر کام کرنا شروع کیا۔ وہ وہاں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ شام کو وہ اپنے گھر جاتیں تو اپنا اور تمہارا کھانا ساتھ لے جاتیں۔ تم نے تنور بنا لیا اور اپنے ہاتھوں سے کما کر بچوں کو کھلانے لگیں۔ گرمیوں میں گاؤں کی عورتیں تمہارے تندور سے روٹی پکوا لیتیں تو تمہاری اور تمہارے بچوں کی گزر بسر ہو جاتی۔ سردیاں آتے ہی جہاں تمہارا تندور سرد ہو جاتا تمہارے گھر کا چولہا بھی سرد ہو جاتا۔ جب تک خدا بخش زندہ رہا تمہارے بچوں کو روکھی سوکھی ملتی رہی۔ وہ زمینداروں کے ہاں کام کرتا، ان کی شادی غمی کا بوجھ بانٹتا، شادیوں پر دیگوں کے لئے سزا سارا دن کلہاڑے سے لکڑیاں پھاڑتا۔ شادی کے مہمانوں کو کھانا کھلاتا، موت کی رسومات سرانجام دینے کے لئے ایک ایک دروازے پر

جا کر اطلاع کرتا۔ تم بھی کپاس، مرچوں اور سبزیوں کی چنائی کی مزدوری سے اس کا ہاتھ بٹاتیں۔ گاؤں کے بے شمار بچے تمہارے ہاتھوں میں پیدا ہوئے، وہاں سے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ جو کام دونوں مل کر رہے تھے وہ سارا بوجھ اب تمہیں تنہا اٹھانا تھا۔

تمہاری دونوں بڑی بیٹیاں ہمارے گھر میں مل کر جوان ہوئیں۔ اب ان کی شادیوں کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس فکر مندی میں تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے۔ ان کی شادیاں ہو گئیں مگر بد قسمتی ابھی راہ تک رہی تھی۔ تمہاری بڑی بیٹی کے میاں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور شموں کو پہاڑ جیسی زندگی تنہا گزارنے کے لئے چھوڑ کر قبر میں جا سویا۔ اس واقعے کے بعد تمہارے چہرے پر ہر وقت رہنے والی اداسی نے وحشت کا روپ دھار لیا۔ تم تندور پر روٹی پکوانے والیوں سے الجھنے لگیں۔ میں نے کئی بار یہ منظر دیکھا۔ تم میری والدہ کے کندھے پر سر رکھ کر زار زار رونے لگتیں۔ میری والدہ تمہیں دلا سہ دیتیں مگر ان کی آنکھیں بھی بھیگ جاتیں۔

اماں زینب تمہارے دونوں بیٹے اب اپنے والد کے جانشین ہیں، وہ شادیوں پر لکڑیاں چیرتے ہیں۔ گاؤں میں سوئی گیس آگئی ہے، اس کے باوجود دیگوں میں کھانا پکانے کے لئے لکڑی ہی سستی پڑتی ہے۔ تمہارے بچے سکول کا منہ نہیں دیکھ سکے۔

اب ان کے بچوں کی عمریں بھی سکول جانے کے لائق ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیج سکیں گے کیونکہ ابھی تک یہ ہونہیں سکا کہ داپوں کہہاروں، لوہاروں اور مصلیوں کے بچوں پر تعلیم کے دروازے کھولے جائیں۔ عبداللہ اور ذوالفقار کے بچے کوئی الگ مخلوق تو ہیں نہیں۔

میں بچپن میں تمہارے خاوند خدا بخش کو دیگوں کے نیچے ایندھن جھونکتے دیکھتا رہتا تھا۔ لکڑیاں اگر گیلی ہوتیں تو جلتے ہوئے ان میں سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا تھا۔ دھوئیں سے خدا بخش کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے، میں سوچتا تھا کہ گیلی لکڑی سے نکلنے والا پانی دراصل لکڑی کے آنسو ہیں، جو جلانے جانے پر وہ بہا رہی ہے۔ اب سوچتا ہوں تمہاری زندگی بھی

گیلی لکڑی کی طرح تھی جو جلتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ عبد اللہ، ذوالفقار کے بچوں کی زندگی بھی اسی طرح چولہوں میں آگ جھونکتے گزرے گی۔ اس بات کا تصور ہولناک ہے لیکن یہ تصور نہیں تلخ حقیقت ہے، مگر نہ جانے میں کیوں اس حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ سنا ہے اب ذوالفقار نے ٹریکٹر چلانا سیکھ لیا ہے اور وہ رات دن زمینداروں کے ٹریکٹر چلا کر اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ اماں زینب! اتنی شاندار ترقی پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول ہو!!۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

بھیا نک تصویر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادر محمد اقبال "درزی" صاحب

السلام علیکم!

آج آمنہ نے بتایا کہ آپکی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی لیکن اُس کے جہیز کا ابھی تک بندوبست نہیں ہو سکا اور نہ ہی جو قرض تم چھوڑ کر گئے ہو اُسکی قسطیں ادا ہو رہی ہیں۔ آمنہ کوشش میں لگی ہوئی ہے، خدا کوئی نہ کوئی انتظام کر دیگا۔

برادر محمد اقبال صاحب! آپ مجھ سے ایک جماعت پیچھے تھے، آپکے والد ماسٹر غلام رسول اور اُنکے دوسرے بھائی ہندوستان سے آکر مخدوم رشید میں آباد ہو گئے، انہوں نے مل کر درزی خانہ بنایا۔ میرے ماموں نے انہیں اپنی دکانوں میں سے ایک پر بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ جب تک آپ کے والد کی آنکھوں میں بینائی موجود رہی وہ راتوں کو جاگ کر بھی محنت مزدوری کرتے رہے۔ آپکے چچا شیر محمد ڈاک لیکر روزانہ دس بارہ میل کا سفر پیدل کرتے اور نواحی بستیوں تک ڈاک پہنچاتے، انہیں اسکا حقیر معاوضہ ملتا مگر وہ اسی پر مطمئن تھے۔ تمہیں تعلیم کا شوق تھا، تمہارے والد تمہیں نکھٹو اور محنت سے جی چرانے والا کہتے تھے، کیونکہ تم انہیں کچھ کما کر نہیں دیتے تھے۔ تمہیں ساری عمر والد سے جھاڑیں پڑیں مگر تم انتہائی فرمانبرداری سے سب کچھ برداشت کرتے رہے، مگر تعلیم سے مُنہ نہیں موڑا۔ آپ ہر وقت خوف میں مبتلا رہتے تھے کہ آپ کے والد کسی وقت بھی تعلیم کے حصول سے منع کر دیں گے۔

آپکے والد نے آپکا نام محمد اقبال رکھا۔ علامہ محمد اقبال کے والد نور محمد بھی درزی تھے۔ علامہ صاحب کے والد محترم شیخ نور محمد ولی کامل تھے اور آپ کے والد کو بھی میں نے ہمیشہ قناعت پسند پایا، آپکو میں نے شروع سے بھائی بنا لیا تھا، آپ شام کو میرے ساتھ لمبی سیر کیا

کرتے تھے، آپ کو اپنی شکل و صورت واجبی ہونے کا بھی شدید احساس تھا مگر آپ میں حس مزاح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، آپ کے والد تو آپ کو تعلیم حاصل کرنے سے نہ روک سکے مگر آپ مالی حالات کی وجہ سے اسے جاری نہ رکھ سکے اور قریبی پرائمری سکول میں پڑھانے لگے۔ آپ نے پرائیویٹ امتحان دیکر M-A کر لیا۔ آپ اپنی محنت اور ذہانت کی وجہ سے ریڈیو پاکستان ملتان میں پریسنگ ہو گئے۔ یہ آپ کی ترقی کی معراج تھی۔ آپ نے اپنی بیوی کو خود تعلیم دی اور وہ بھی سکول ٹیچر ہو گئیں۔

آپ نے مجھے خوشخبری سنائی کہ آپ نے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لی ہے۔ مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی۔ ایک دن یہ جانکاہ خبر ملی کہ ڈبل پھانک ملتان سے گذرتے ہوئے ایک فوجی ٹرک سے ٹکرا کر آپ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ میں آپ کی تجہیز و تدفین میں شریک تھا، میں آپ کے بھولے بیٹے اور بیٹیوں کے بارے میں کافی پریشان رہا۔ کچھ عرصہ پہلے اس خبر نے ہلا کر رکھ دیا کہ آپ کی اہلیہ بھی چل بسیں، پہلے آپ کی بچیاں شفقت پوری سے ہی محروم تھیں جو اب والدہ کے بغیر بالکل بے سہارا ہو گئیں۔

زندگی اور موت کا سلسلہ تو جاری و ساری ہے لیکن طبقاتی حوالوں سے آپ اور آپ کے بچے جن مشکلات کا سامنا کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں وہ معاشی مسائل سے زیادہ تکلیف دہ ہیں، معاشی مسائل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئیگا، لیکن معاشرتی مسئلے کی بھیانک تصویر آپ کے بچوں کے چہروں پر چسپاں رہے گی، اس کا حل خدائے دیر گیر کیوں نہیں نکالتا؟۔

فقط، آپ کا بھائی!

جاوید ہاشمی!

یہ ایک صدی کا قصہ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

عزیزم فیض محمد صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

فیض محمد، تمہاری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی، گذشتہ چوبیس سال سے تم ہمارے ہاں ملازمت کر رہے ہو، تمہارا چھوٹا بھائی ممتاز بھی 18 سال سے ہمارے گاؤں والے ڈیرہ پر ملازم ہے۔ تمہاری والدہ زنان خانے میں کام کرتی ہے اور تمہارا والد محمد نواز، جب تک چلنے پھرنے کے قابل تھا، ہماری ملازمت میں رہا، وہ اور تمہارا دادا ملک محمد حیات ملکر ہمارے اونٹوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے، تمہاری دادی گانمن بی بی اور تمہارے دادا کی بہن سلامت مائی بھی، ہمارے ہمارے گھروں میں کام کرتی رہیں، تمہارے پردادا ملک گہنہ تک تو میں جانتا ہوں جو ہمارے گھر سے وابستہ رہے۔

تمہارا والد اور اور پھوپھا میرے والد محترم سے دست بیعت تھے۔ وہ اپنے مرشد کی خدمت کو اعزاز سمجھتے تھے، تمہاری پانچ نسلیں ہماری خدمت پر مامور رہیں۔ اس ایک صدی میں تمہارے خاندان کا کوئی فرد کسی جرم میں ملوث نہیں رہا۔ آپکا کنبہ نیک لوگوں پر مشتمل ہے، تم نے بھی، بطور میرے ذاتی ملازم، میری بہت خدمت کی ہے۔ تم مہمانوں کی خدمت بھی بہت دلجمعی سے کرتے ہو۔ مجھے تم نے کبھی، سوائے اس کے، کوئی شکایت کا موقعہ نہیں دیا کہ جو نہی میں ملتان میں اپنی خواہگاہ میں جاتا ہوں تم بغیر بتائے رات اپنی بیوی بچوں کے پاس گزارنے کے لئے بیس میل کے فاصلے پر گاؤں چلے جاتے ہو اور اگلے دن میرے باہر آنے سے پہلے موجود ہوتے ہو۔ ڈیرے کی صفائی کر چکے ہوتے ہو اور کرسیوں کو ترتیب سے رکھ چکے ہوتے ہو۔ بسا اوقات علی الصبح آنے والے مہمانوں کو چائے بھی پلا چکے ہوتے

فیض محمد تمہارے دادا کے بھائی ملک سردار محمد کو میں نے کونسلر منتخب کرایا۔ انہوں نے پیر ریاض حسین شاہ ایم پی اے کو ہرایا، جو میرے قریبی رشتہ دار تھے۔ شاہ صاحب ہر الیکشن میں اپنی گاڑی پر رات دن میری کامیابی کے لئے کام کرتے۔ انہیں مجھ سے یہ توقع نہیں تھی کہ میں ان کے مقابلہ میں ایک ملازم کا ساتھ دوں گا۔ انہوں نے اس کے بعد ساری زندگی میری بھرپور مخالفت کی، جس کا مجھے کوئی گلہ نہیں۔ ملک سردار محمد کے دو بیٹیاں اور چھ بیٹے تھے قادر بخش، محمد رمضان، واحد بخش، اللہ بخش، غلام حسین اور گہنہ سب نے کافی عرصے تک ہماری ملازمت کی۔ قادر بخش کی ڈیوٹی مجھے سکول چھوڑنے اور لانے پر لگی ہوئی تھی اور اس نے اپنی ڈیوٹی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تمہارے دادا کے تیسرے بھائی حاجی اللہ دتہ نے اونٹوں پر بار برداری کا کام چھوڑ کر دکان کھول لی۔ اس کے بچوں کا گزارہ بہتر ہو گیا۔ مگر اب ان کی مالی حالت خاصی کمزور ہے۔

فیض محمد! آپ کے خاندان سے ہمارا تعلق مالک اور ملازم کا نہیں بلکہ آپ کے خاندان کے تمام افراد کو ہم اپنا عزیز سمجھتے ہیں اور آپ کی عورتوں کا احترام اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی طرح کرتے ہیں۔ آپ کے والد، آپ کے پھوپھا، آپ کی پھوپھی سرور اور دیگر افراد نے میرے والد محترم کے ہاتھوں پر بیعت کی ہوئی ہے۔ یہ تعلق مرشد زادگان اور مریدین کا بھی ہے۔

میں رات کے ساڑھے تین بجے اپنے اور تمہارے خاندانی تعلقات کے تانوں بانوں کے بارے میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے خود احتسابی کے عمل کا سامنا ہے۔ اتنے بندھنوں اور ایک سو سالہ خدمات کے باوجود آپ وہیں کھڑے ہیں جہاں سو سال پہلے تھے، نہ مرید ہونے سے آپ کو روشنی کا راستہ ملا اور نہ مزارع یا ملازم ہونے سے ہماری نظر آپ کی بہتری کے لئے اٹھی۔ باہمی احترام کا رشتہ بھی ہمارے لئے نفع کا سودا تھا اور تمہارے خاندان کے لئے نقصان کا۔

آپ کے خاندان کے کچھ لوگوں نے لکڑی کے کھوکھے لگا کر چائے خانے قائم کیے اور کسی نے لسی اور سوڈا اور کی چھوٹی چھوٹی دکانیں بنا کر انہیں پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنایا۔ ان

میں سے کچھ کو بیماریوں نے گھیر لیا اور یہ خوشحالی کے دن خواب ہو گئے۔ بہر حال ہمارے اونٹ اور بھیڑ بکریاں چرانے سے یہ زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ تھا جو اختیار کیا گیا۔

میں اس وقت جو شب بیداری کر رہا ہوں وہ اس لئے ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں آپ میں سے کسی نے بھی سکول کا منہ نہیں دیکھا، اور اگر ایک آدھ نے کوشش بھی کی تو دوسری تیسری جماعت سے آگے نہیں چل سکا، یہی المیہ میری آنکھوں کی نیند چرانے کے لئے کافی تھا، مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ میرا ضمیر میرے سامنے کھڑا ہے، اور پوچھ رہا ہے کہ اگر تم ایسے لوگوں کی زندگی میں تبدیلی نہیں لاسکتے، جن مردوں اور عورتوں نے تمہاری بے پناہ خدمت کی ہے، تو تمہارے ملک اور قوم کی تقدیر بدلنے کے دعوے پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ میری بے خوابی بے قراری میں تبدیل ہو رہی ہے۔ میں جیل کی دیواروں سے گفتگو کی کوشش کرتا ہوں۔ اندھی گوئی اور بہری دیواریں میرا مذاق اڑاتی ہیں، مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہوں کہ تم نے لوگوں کو صدیوں سے اسے غلام بنایا ہوا ہے، تم نے جان بوجھ کر لوگوں کو اندھا گونگا اور بہرہ رکھا ہوا ہے، تم پیری مریدی کے نام پر انہیں بولنے کے قابل نہیں رہنے دیتے۔ رزق کی مار دے کر ان کو عقل و خرد سے محروم کر دیتے ہو اور احترام کے حوالے سے لچھے دار گفتگو کر کے انہیں الفاظ کے جال میں پھنساتے ہو۔

میں ان دیواروں سے ڈرنے لگا ہوں صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں، ظلمت شب سیماب پا ہو رہی ہے، اجالا اندھیرے کے تعاقب میں ہے۔ میں نے روشنی کی لیکر پر چلنے کا عہد کر لیا ہے، اس اجالا کو گاؤں بستی بستی شہر شہر پہنچانے کا عہد، اے اللہ! مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق دے!!۔ آمین۔ مؤذن کہہ رہا ہے الصلوٰۃ خیرا من النوم، نماز نیند سے بہتر ہے، یقیناً یہ خواب غفلت سے جاگنے کا پیغام ہے۔

والسلام

خیر اندیش، جاوید ہاشمی

تو شاہ ہم گدا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب قادر بخش قادو مجاور صاحب!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ تم مجھے یاد آ رہے ہو۔ تمہارے پورے کنبہ کی گذر بسر ہمارے جد امجد حضرت مخدوم عبدالرشید حقانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی رکھوالی کے عوض ملنے والے نذرانوں پر تھی۔ صدیوں کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

میں نے تمہیں مخدوم رشید کی گلیوں میں اکثر بھیک مانگتے دیکھا، تمہارے ہاتھ میں کالے رنگ کا کشلول ہوتا تھا، جس میں کچھ سکے پڑے ہوتے تھے۔ تمہارے سبز لمبے پُخنے پر رنگ برنگی کپڑے کی دھجیاں ڈور سے نظر آتی تھیں، تمہاری ٹوپی پر بھی اسی کپڑے کی رنگ رنگ پٹیاں تمہاری ہیئت کذائی کو نمایاں کرتی تھیں، تمہارے گلے میں کئی رنگوں کے مسکے جھول رہے ہوتے تھے، تمہارے ہاتھوں میں لوہے کے کڑے ہوتے تھے، تمہارا قد چھوٹا تھا اور ایک آنکھ بینائی سے محروم تھی، تمہارا رنگ سانولا تھا اور چہرے پر خشکی داڑھی تھی۔

قادر بخش، میں نے بارہا دیکھا کہ تم نشے میں مدہوش ہوتے تھے، تمہیں چرس پینے کی لت تھی، تم چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے اور بات کرتے ہوئے تمہارے الفاظ تمہارا ساتھ نہ دیتے، تمہاری گفتگو دعائیہ رنگ لئے ہوتی تھی جس میں نہ کسی کا گلہ ہوتا اور نہ کسی کی غیبت.... تم دربار شریف کے دروازہ پر بیٹھے رہتے جب نیند کا غلبہ ہوتا تو زمین پر ہی سو جاتے، بچے کبھی کبھی تمہارے کشلول سے پیے اٹھا کر کر بھاگ جاتے، لیکن کبھی تم نے اُن کا پیچھا نہ کیا۔

آج سے نو سال پہلے میں ہنگری کے دار الحکومت "بوڈاپسٹ" سے کراچی پہنچا تو تمہاری موت کی اطلاع ملی۔ میں ملتان اپنے بچوں سے ملے بغیر سیدھا تمہارے گھر پہنچا۔

میرے بچے ملتان میں مجھ سے ملنے کے منتظر تھے لیکن تمہارے رشتہ دار اور تمہارے اہل و عیال میرا انتظار کر رہے تھے میں اُن کے غم میں شریک تھا۔ اگرچہ فاتحہ خوانی سے یقیناً تمہاری روح کو ثواب پہنچا ہوگا، مگر سچی بات یہ ہے کہ اگر مجھے تمہارے کنبے کے چالیس دوٹوں کا لالچ نہ ہوتا تو ضروری نہیں تھا کہ میں اپنے بچوں سے پہلے تمہارے بچوں کی خبر گیری کرتا۔ میرے بھائی اور کنبے کے افراد پہلے ہی تعزیت کیلئے تمہارے گھر جا چکے تھے، میں بھی ضروری امور کی انجام دہی کے بعد جا سکتا تھا۔

جب ایک وفاقی وزیر اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ تمہارے بچوں کیساتھ زمین پر بیٹھ کر دکھ درد بانٹ رہا تھا تو انہیں اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ معاشرے کا محروم طبقہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اہم سمجھ رہے تھے۔ مجھ سے پہلے علاقے کی سیاست میں حصہ لینے والے میرے مخالفین کی لمبی لمبی گاڑیاں بھی تمہارے بچوں کے ہاں حاضری دے چکیں تھیں۔

تمہارے بچے جن گاڑیوں کو محرومی کے احساس سے پھر مار کر بھاگ جاتے تھے، انہیں وہ گاڑیاں بھی اپنی لگ رہی تھیں۔ ایک متوازن معاشرے کیلئے سوچ کا دھارا تبدیل ہو رہا تھا۔ اجنبیت کی دیواریں گر رہی تھیں۔ تم بھیک مانگنے والے تھے، مگر جمہوری عمل کے دھارے نے تمہاری اہمیت تسلیم کر لی تھی۔ تمہارے بچے اور تمہارے کنبے کے افراد بھی اس اہمیت سے بے خبر نہ تھے۔ جمہوریت تو بھیک مانگنے والے سے بھی بھیک مانگتی ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ چند شرارتی بچے تمہیں دینے کی بجائے تمہاری مانگی ہوئی بھیک تم سے چھین لیتے ہیں، کبھی طاقت کے زور پر کبھی ہتھیاروں کے زور پر!۔

مگر جمہوریت ہمیں پھر تمہارے دروازے پر سوالی بنا کر لے آتی ہے۔ تم شاہ بنتے ہو اور ہم سب بھکاری.....

خدا حافظ! تمہارا مخلص

جاوید ہاشمی!

مہاجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 جولائی 2006ء

برادر محمد شریف ماڑو ولد علم دین ماڑو صاحب

السلام علیکم! اطلاع ملی ہے کہ آپ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے ہیں۔ آپ کی سبزی والی ریڑھی کو ایک ٹرک نے ٹکر ماری اور بیچ میں آپ کچلے گئے۔ آپ کے نام کے ساتھ لفظ ماڑو کا مطلب ہی کمزور ہونا ہے۔ کمزور کا کچلا جانا تو فطری امر تھا۔ آپ کے والد صاحب نے آپ کو یہ نام ورثہ میں دیا۔ ان کے اصل نام علم دین سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ تمہیں بھی ہمیشہ ماڑو کے نام سے پکارا گیا۔ آپ دوسری جماعت تک میرے ساتھ پڑھتے رہے، پھر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آپ اپنی سبزی کی دکان پر بیٹھ گئے۔ دوران تعلیم میں نے آپ کو اپنا بھائی بنایا اور یہ رشتہ اب تک قائم ہے۔

جب آپ کے والد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے تو آپ کی والدہ راستے میں کہیں کھو گئیں۔ آپ کو آپ کے والد نے پالا پوسا گاؤں میں آپ کا کوئی رشتہ دار تھا اور نہ کوئی جاننے والا۔ سارے علاقے میں کوئی آپ کا ہم زبان نہ تھا جس زبان میں آپ گفتگو کرتے نہ وہ اردو تھی نہ پنجالی نہ روہتکی بلکہ وہ ان تمام زبانوں کا ایسا ملغوبہ تھا جو آسانی سے سمجھ نہیں آتا تھا۔ آپ کے والد کو بازار کے اندر ایک قبر نما جگہ الاٹ ہوئی جہاں انہوں نے ساری زندگی بتادی۔ آپ کا یہ کھڈا بازار کے بیچ میں تھا ارد گرد امرتسریوں کی دکانیں تھیں اس لئے آپ کا کوئی محلے دار بھی نہ تھا رات کو بازار بند ہو جاتا صرف آپ کی کٹیہا آباد نظر آتی جہاں آپ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی ہوتے۔ اپنے کھڈے کے سامنے والے تھڑے پر آپ کے والد نے چند روپے کی سبزیاں رکھ کر بیچنا شروع کر دیں، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ تمہارے قبر نما کمرے میں بمشکل ایک چارپائی آتی تھی کمرے کی پشت پر چولہا رکھنے کی جگہ تھی۔ آپ کے والد آپ کو سکول کے لیے خود تیار کرتے۔ میں سکول جاتے

ہوئے وہاں رکنا تو وہ مجھے بھی چائے کی پیش کش کرتے۔ آپ سکول میں ہر ایک کے مذاق کا نشانہ بنتے، اساتذہ بھی آپ کو دوسروں کی نسبت زیادہ سزا دیتے۔ پھر آپ نے سکول جانا بند کر دیا، مگر ہماری دوستی قائم رہی۔

آپ کے والد کی آنکھوں میں پیلاہٹ اتر آئی تو معلوم ہوا کہ انہیں یرقان ہو چکا ہے۔ انہوں نے پیروں فقیروں سے جھاڑ پھونک کرائی اور ٹونے ٹونے بھی کیے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ اسی بیماری نے آخراں کی جان لے لی۔

علم دین ماڑو کے مرنے کے بعد آپ بالکل تنہا ہو گئے۔ گاؤں سے ستر میل دور رہنے والے رشتے داروں نے آپ پر ترس کھایا اور آپ کی شادی ہو گئی۔ آپ کی بیوی بھی اسی کھڈے میں آگئی، جہاں آپ کے والد نے دم دیا تھا۔ پھر اللہ نے تمہیں بیٹوں سے نوازا اور وہ بچے بھی اب جوان ہو چکے ہیں اور اسی جگہ پر رہ رہے ہیں۔

محمد شریف ماڑو صاحب! آپ کی وفات کا سن کر میں ماضی میں کھو گیا۔ آپ بچپن سے پنج وقتہ نمازی تھے ہر ایک سے مسکرا کر ایسے بات کرتے تھے جس میں لجاجت کا پہلو نمایاں ہوتا بچپن سے آپ پر خوف خدا طاری تھا۔ بچے آپ کو آخرت سے ڈرا کر آپ سے کھانے پینے کی چھوٹی موٹی چیزیں اڑالے جاتے۔ بچے آپ سے کہتے کہ اگلے جہان میں پل صراط سے گزرنے کے لئے ہماری سفارش کی ضرورت ہوگی کیونکہ ہم پیر زادے اور مخدوم زادے ہیں۔ اگر ہم نے مدد نہ کی تو تم اس دنیا کی مشکلوں سے تو نجات پا لو گے مگر آخرت میں کیا کرو گے۔ وہاں پر بھی ہماری سرداری چلے گی۔ تم آخرت کے خوف سے انہیں کچھ نہ کچھ دے کر سمجھتے کہ جب اس دنیا کے دکھ درد سے نجات مل جائے گی تو آنے والی زندگی آرام سے گزرے گی۔

میں نے گاؤں سے ملاقات کے لئے آنے والوں سے پوچھا کہ اب تمہارے بچوں کی گزر بسر کیسے ہو رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جو ٹھیلا تم نے ورثے میں چھوڑا تھا تمہارے بچوں نے اس پر سبزیاں بیچنا شروع کر دیں ہیں۔ اب وہ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہی قاتل سڑکوں پر، جہاں ایک ٹرک نے تمہیں مار ڈالا تھا، بچوں کو ہر گزرتے ہوئے ٹرک سے یقیناً خوف آتا ہوگا۔ انہیں اپنے والد کی خون سے لتھڑی ہوئی لاش بھی سامنے

پڑی ہوئی نظر آتی ہوگی، مگر ان کے پاس اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے کہ وہ گاہک اور موت کا انتظار کریں اور انہی اندھے راستوں پر چلتے رہیں، جنہوں نے آج تک کسی کو منزل پر نہیں پہنچایا۔ تمہارا خاندان پاکستان کو محفوظ گھر سمجھ کر یہاں آیا تھا۔ شروع میں لوگ آپ کو مہاجر کی بجائے پناہ گیر کہتے تھے، یعنی اب تم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے ہو جہاں تمہیں پناہ مل گئی ہے۔

پاکستان کے بارے میں تمہارے بڑوں نے جو خواب دیکھے تھے، وہ خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ اس کی ذمہ داری اس سر زمین پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس ذمہ داری کا بوجھ میرے ضمیر پر ہے۔ اگر ناخدا کشتی بیچ بھنور کے چھوڑ کر کناروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں تو مسافروں کا ڈوب جانا یقینی ہوتا ہے۔ ہم چونکہ کردار کے غازی نہیں، گفتار کے غازی ہیں۔ اس لئے تمہارے تصور سے باتیں کر کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ بوجھ ہلکا کرنے کا محفوظ ترین طریقہ جیل کی زندگی ہے کہ اب تم مجھ سے بحث کر سکتے ہو اور نہ ہی میری گرفت کر سکتے ہو۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کا کیسا راستہ اختیار کیا ہے۔ میری اس چالاکی کی داد کیوں نہیں دیتے۔ تم میری ذہانت کی داد دینے کی بجائے میری توجہ اپنے بچوں کی طرف کیوں مبذول کر رہے ہو۔ تم تو شرافت سے میری ہر بات پر ایمان لاتے تھے۔ اب تمہاری آنکھوں میں مایوسی اور بے یقینی کے سائے کیوں ہیں؟ کیا تم بھی اب عام آدمی کی طرح سوچنے لگے ہو۔ میں تمہاری خستگیوں کی تاب نہیں لاسکتا۔ ہاں ایک بات تمہیں بتانا بھول گیا۔ کہ میں اپنی بھانجی کے جنازے کو کندھا دینے، پچھلے دنوں، مخدوم رشید گیا تو تمہارے بیٹوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پانچ بھائی ہیں۔ جن میں سے دو شادی شدہ ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ اسی قبر نما کمرے میں رہتے ہیں جہاں ان کے باپ اور دادا رہتے تھے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ وہ وہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ تم ہی بتاؤ کہیں اس مسکراہٹ میں طنز تو نہیں تھا؟

خدا حافظ، خیر اندیش، جاوید ہاشمی

روشنی کے مینار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

25 جون 2006ء

محترم حاجی خدا بخش صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج آپ بہت یاد آئے میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ کو خراج تحسین پیش کروں کیونکہ آپ کی زندگی ایک کامیاب شخص کی زندگی ہے آپ نے محنت اور ہمت سے اپنی دنیا خود بنائی۔

میں نے جب ہوش سنبھالا آپ کو رزق حلال کی تگ و دو میں مصروف پایا۔ آپ صبح سویرے اپنے اوزار لے کر نکلتے اور رات گئے گھر لوٹتے آپ نے اپنی زندگی انتہائی نیک نیت شخص کے طور پر گزاری عموماً آپ کے بھائی ملک اللہ بخش بھی آپ کے ساتھ ہوتے تھے گاؤں کی اکثر عمارتوں کی بنیادوں میں آپ کا خون پسینہ شامل ہے۔ مساجد کی تعمیر اور ترمیم میں تو آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ مسجدوں کی تعمیر کے وقت آپ اپنا خون جگر بھی اس میں شامل کر دیتے آپ کی چند ایکڑ زمین تھی لیکن آپ کی گزر اوقات راج مزدوری پر تھی۔ آپ نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی آپ کے بڑے بیٹے ملک محمد نواز میرے استاد ہیں جو بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائرڈ ہو گئے۔ چھوٹے بیٹے غلام مرتضیٰ میرے ہم جماعت تھے وہ بھی سکول میں استاد ہیں۔ آپ کے کردار کی وجہ سے گاؤں کے لوگ آپ کا دل سے احترام کرتے تھے۔ اپنے گھر کے ساتھ مائی والی مسجد کے انتظام و انصرام میں بھی آپ کی خصوصی دلچسپی تھی۔

آپ کے بیٹے ملک محمد نواز نے زیادہ تر مخدوم رشید ہائی سکول میں سروس کی، ان کی شہرت ایک محنتی دیانتدار اور مخلص شخص کی ہے، وہ خوش شکل اور خوش لباس شخصیت کے حامل ہیں، وہ ایک اچھے منتظم کے طور پر جانے جاتے ہیں، طالب علمی کے دور میں بھی وہ انتہائی

مختی اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ملک محمد نواز نے اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے ایک بیٹے نے فوج میں کمیشن لیا اور اب بطور میجر قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ملک محمد نواز اور غلام مرتضیٰ سے جب آپ کی تعزیت کے لئے گیا تو وہ آپ کی جدائی کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے اپنی اولاد کو رزق حلال کا نوالا کھلایا۔ اللہ نے آپ کو اس کے بدلے میں سعادت مند اولاد سے نوازا آپ نے کبھی احساس محرومی کا رونا نہیں رویا میں نے آپ کے چہرے پر ہمیشہ سکون کی کیفیت دیکھی۔ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھلتی رہتی تھی۔ جفاکشی کی وجہ سے آپ کے چہرے پر کبھی ملال نہ تھا اور نہ ہی آپ کبھی کسی کے خلاف شکوہ سنج ہوئے بلکہ آپ کی زندگی ایک شکر گزار بندے کی طرح تھی جو ہر حال میں خدا کی ذات پر راضی رہتا ہے آپ نے ساری زندگی قناعت پسندی اپنائے رکھی۔

علم کی دولت کی وجہ سے میں نے آپ کے دروازے پر گاؤں کے بڑے سے بڑے لوگوں کو دستک دیتے دیکھا ہے اور آپ کے بچوں نے بھی اس دولت کو تقسیم کرنے میں کنجوسی نہیں برتی۔ آپ کے بھتیجے فیض بخش اور ماسٹر گل محمد نے بھی زندگی تعلیم و تدریس میں گزار دی۔ ان کے پاس علم کی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ بڑے زمینداروں سے بھی زیادہ اہم ہیں معاشرے میں ان کے مقام سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جناب ملک خدا بخش صاحب! میں رات کے تین بجے آپ سے اس لئے مخاطب ہوں کہ آپ لوگوں نے خون جگر دے کر جو صلے اور ہمت کی داستان کو رنگین بنایا ہے آپ کی یہ کامیابی معمولی نہیں ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں سراٹھا کر چلنے کی رسم نہیں آپ نے اس معاشرے کو اپنا دست نگر بنایا یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے آپ لوگ میرے ہیرو ہیں۔ مولانا محمد رمضان انصاری ڈاکخانہ کا کام بھی چلاتے تھے اور سارا دن سلائی مشین پر لوگوں کے کپڑے سیٹے تھے، ان کا صاحبزادہ حبیب انصاری گاؤں کا پہلا فرد تھا جس نے ایم اے کیا اور پھر ایل ایل بی کر کے وکالت کی۔ ان کے دوسرے بیٹے سعید انصاری نے بطور سکول ٹیچر لوگوں تک علم کی روشنی پہنچائی۔ اب مولانا کے پوتے ڈاکٹر ہیں وکیل ہیں، سپیشلسٹ ہیں

اور اعلیٰ عدالتوں میں کام کرتے ہیں۔

قاضی حق نواز کی شخصیت میرے سامنے ہے جو علمی مباحثوں میں حصہ لیتے رہے سید عطاء اللہ کی تقاریر سے متاثر ہو کر نو جوانی میں فرنگی راج کے خلاف ہو گئے وہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہیں مانتے انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی ان کے صاحبزادے طارق عزیز نے اسلام آباد یونیورسٹی سے جرنلزم میں ایم اے کیا ان کی صاحبزادیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہیں۔ وہ ساری ساری رات کپڑوں پر کشیدہ کاری کرتے دن کو بھی آرام نہ کرتے میں ان کی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا؟ اور رانا فخر علی نے انتہائی مشکل حالات سے گزر کر بچوں کو پڑھایا ان کے تین بیٹوں میں سے ایک پولیس کے اعلیٰ عہدیدار ہیں دوسرے پی آئی میں ہیں اور تیسرے بھی سرکاری ملازمت کرتے ہیں، ملک محمد بخش جو میرے استاد تھے ان کے بچے بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں اسی طرح ان کے عزیز ماسٹر عبدالملک اور حاجی حق نواز کا صاحبزادہ رب نواز جو باصلاحیت نو جوان ہے وہ بھی علم کی روشنی بانٹ رہا ہے۔ استاد محمد شریف عرفی کے والد جو زندگی بھر درخت کاٹنے کی مزدوری پر گزارا کرتے رہے اور ان کی والدہ نے لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بچوں کو تعلیم دلوائی۔ ملک اللہ بخش نے محنت مزدوری کر کے اپنے بیٹے ڈاکٹر محمد ظفر کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد عالمی بینک کے مشیر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ حافظ بشر احمد ایک اور ایسی مثال ہیں جن کے والد خواجہ محمد بخش نے انہیں تنگ حالات کے باوجود تعلیم دلوائی وہ سکول ٹیچر ہیں اب ان کی بیٹی نے جرنلزم میں ایم اے کیا ہے۔

میں دیانتداری سے سمجھتا ہوں آپ لوگ روشنی کے مینار ہیں جن نامساعد حالات سے گزر کر آپ نے کامیابیاں حاصل کیں یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس معاشرے میں غریب آدمی کا کوئی نام نہیں اس معاشرے میں دولت کے پجاریوں کو اپنا دست نگر بنا لینا ایک لائق تحسین عمل ہے یقیناً مخدوم رشید اور اردگرد کی بستیوں کے چھوٹے زمینداروں کے بچے بھی پڑھ لکھ کر ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور مثبت سوچ کو آگے بڑھا رہے ہیں لیکن جو ہمت آپ کے طبقے کے لوگوں نے کی ہے وہ ایک انقلاب کے درجے کے برابر ہے

آپ انقلابی لوگ ہیں اور جس معاشرے میں یہ انقلابی روح پیدا ہو جائے وہ معاشرہ کبھی
تہی دامن نہیں رہ سکتا بلکہ ایسا معاشرہ ہی ترقی اور خوشحالی کی بلندی تک پہنچتا ہے۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

ذہن کی غلاظت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم تاج مسیح صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

کئی روز سے آپ اور آپ کی بیوی اللہ رکھی مجھے بہت یاد آ رہے ہیں، حالانکہ آپ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس پچیس سال ہو گئے ہیں۔

آپ ایک انتہائی محنتی شخص تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ آپ میں صبر اور تحمل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، یہی اوصاف آپ کی بیوی اللہ رکھی میں بھی تھے۔

آپ کے بھائی باری اور بھابھی زینت نے بھی وہی پیشہ اختیار کر رکھا تھا جو آپ کا تھا، لیکن زینت کام کرتے ہوئے بڑ بڑاتی رہتی، وہ اور اس کا خاوند تند خو تھے جب کہ آپ ان سے بالکل مختلف۔

آپ کا خاندان کہیں سے آ کر مخدوم رشید کے ہسپتال کے عملہ صفائی میں بھرتی ہو گیا اور پھر ہمیشہ کے لئے یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب تو آپ کی قبریں بھی اسی دھرتی میں ہیں۔ آپ کے سات بیٹے تھے۔ جن میں سے برکت مسیح پہلی، دوسری جماعت تک میرے ساتھ پڑھتا رہا، پھر اس نے تعلیم سے منہ موڑ لیا اور چھوٹی عمر میں ہسپتال کی صفائی والے عملے میں بھرتی ہو گیا۔

تاج مسیح صاحب اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے آپ نے گاؤں کے چند گھروں سے گندگی صاف کرنے کا کام شروع کر دیا۔ آپ جب سر پر گندگی کی ٹوکری اٹھا کر گزرتے تو لوگ منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ آپ نے اپنے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ رکھا ہوتا تھا تا کہ بدبو سے بچ سکیں۔ ڈاکو بھی چہرہ اسی طرح ڈھانپتے ہیں اور معاشرے میں خوف کی علامت بن جاتے ہیں۔ لوگ ڈاکوؤں سے خونزدہ بھی ہوتے ہیں اور ان سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ آپ مجھے ہمیشہ اچھے لگتے تھے جب آپ ہمارے گھر میں صفائی کے لئے

آتے، میں آپ کے ہاتھ دھلاتا، آپ کے لئے کھانا لاتا، آپ کو اس دوران کچھ آرام بھی مل جاتا اور پھر آپ اپنے کام پر روانہ ہو جاتے۔ بڑھاپے کے باوجود میں نے آپ کو کبھی کام سے جی پُراتے نہیں دیکھا۔

آپ کی بیوی رکھی بہت نیک دل عورت تھی۔ وہ ہر جمعہ کو ہمارے گھر سے آٹا لینے آتی تو میری والدہ سے دکھ سکھ بانٹتی۔ میری والدہ اس سے عزت و احترام سے پیش آتیں۔ ایک مرتبہ آپ بیمار تھے، والد محترم ہمیں ساتھ لے کر آپ کی بیمار پرسی کے لئے آپ کے کوارٹر پر گئے آپ کی بیوی نے بہت دعائیں دیں۔ آپ ہوش میں نہیں تھے معلوم نہیں آپ کو کیا بیماری تھی آپ کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔ آپ نے کچھ روز بعد اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی، میں آپ کی تجہیز و تدفین میں شامل تھا۔

آپ کی وفات کے بعد رکھی بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہی۔ علاقے میں نئے ہسپتالوں کا جال بچھا تو آپ کے بچوں کو درجہ چہارم کی نوکریاں مل گئیں اور وہ بہتر زندگی گزارنے لگے انہوں نے گھروں میں صفائی کا کام بند کر دیا بعد میں تمہارے دو پوتے محمود اور لیاقت مسیح کونسلر منتخب ہو گئے..... یونین کونسلوں میں ان کے آگے پیچھے پھرنا پڑتا۔ جمہوریت کی طاقت رنگ لارہی تھی۔ جو لوگ ان کو قریب کھڑا نہیں ہونے دیتے تھے، اپنی مجلس میں شامل کرتے، کھانا پینا اکٹھے ہو گیا، شادی غمی میں بھی برابر کے شریک رہنے لگے۔ تم بھلے مانس تھے۔ اللہ نے تمہاری اگلی نسل کو تمہاری نیک نیتی کا صلہ دیا۔ آپ کے پوتے لیاقت مسیح نے 1990ء کے انتخاب کے اقلیتی نشست پر ایم پی اے کا انتخاب لڑا۔ میں نے اس کی بھرپور مدد کی۔ چونکہ پورا صوبہ اس کا حلقہ انتخاب تھا۔ میں نے جھنگ، رحیم یار خان اور لاہور سے اسے ووٹ دلوائے لیکن وہ چند ووٹوں سے یہ الیکشن ہار گیا۔ اگر وہ جیت جاتا تو میری طرح اسمبلی کا ممبر ہوتا۔ تمہارا پوتا محمود اب بھی ہمارے پیٹیل سے کونسلر منتخب ہو کر علاقے کی خدمت کر رہا ہے۔ شاید میں ماضی کا ذکر نہ کرتا مگر میں آپ کے کام کو عار نہیں سمجھتا، اس لئے اس کام کے ذکر میں بھی کوئی عار نہیں۔

ہندوستان کے شہر دہلی میں صفائی کا عملہ زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دبئی، ابو ظہبی اور سعودی عرب میں صفائی کا زیادہ تر کام پاکستانی، بنگالی اور ہندوستانی مسلمان کرتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ میں تو اس کام کو عبادت سمجھ کر بھی کیا جاتا ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے مخدوم رشید میں ہندویہ کام کرتے تھے اور ملتان شہر میں تو سارا کام بالہمیکی ہندوؤں کے سپرد ہے۔ دنیا بھر میں اقلیتوں سے اس طرح کے کام کرائے جاتے ہیں۔ فلاش سسٹم آنے کے بعد اور نکاسی آب کے منصوبوں کی کامیابی نے بہت سارے انسانوں کو اس اذیت ناک کام سے نجات دلا دی ہے۔ اگر نظام بنا لیا جائے تو انسان کی تذلیل کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ پانچ سو سال پہلے نکاسی آب کا نظام بنانے والے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پاکستان کی مسیحی برادری اور دوسری اقلیتوں نے پاکستان کی بہت خدمت کی ہے۔ کرنل ٹریسلر، کرنل ہربرٹ بلوچ جیسے انسانوں نے پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ جے سالک اور مشتاق وکٹر تو میرے قریبی ساتھی بھی رہے ہیں۔

کاش سارے پاکستانی پاکستان سے اتنی محبت کر سکیں۔ جتنی ہمارے ان ساتھیوں نے کی ہے۔ مگر تاج مسیح صاحب میں آپ کی محنت اور ذہانت کو ان وزراء کی پاکستانیت سے کم نہیں سمجھتا۔

جے سالک نے اپنی کتاب کے لئے مجھے کچھ لکھنے کو کہا میں اس تحریر کو اس خط کا حصہ بنا رہا ہوں۔

جے سالک اور میں کئی مرتبہ قومی اسمبلی میں قوم کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی جماعتوں کی نمائندگی کرتے رہے۔ وفاقی وزیر بھی رہے۔ جے سالک نے جماعتی وابستگی سے بالاتر ہو کر قوم کی خدمت کی ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں توبالغہ نہ ہوگا کہ وہ مذہبی وابستگیوں سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت اور عظمت کے لئے کام کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں مٹھاس ہوتی ہے اور جذبوں میں اخلاص، وہ شعلہ بھی ہیں اور شبنم بھی۔

اپنے موقف کے اظہار کے لئے وہ مختلف انداز اختیار کرتے ہیں۔ کبھی وہ جوگی بن کر درد کی جوت جگاتے ہیں، اور کبھی زندہ مصلوب بن جاتے ہیں، کبھی بوریا نشین ہوتے ہیں

اور کبھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ماتم کناں۔ قوم پر جب کوئی مصیبت آئے وہ درد کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتے ہیں انہوں نے کبھی مذہبی منافرت کو اپنی سیاست کی بنیاد نہیں بنایا، مگر اقلیتوں پر ظلم کے خلاف وہ شعلہ جوالہ ہوتے ہیں۔ جب یورپ، امریکہ یا بوسنیا میں مسلمان اقلیتوں پر ظلم ہو تو بے سالک مسلمانوں کی حمایت میں سب سے توانا آواز ہوتے ہیں۔ اہل علم نے اپنے اپنے انداز سے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ان پر لکھی گئی تحریروں کو کتابی صورت میں چھاپا جا رہا ہے۔

اہل قلم نے ہمیشہ انہیں اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ بے سالک کو توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کا جوفن آتا ہے وہ کسی اور کو نہیں آسکتا۔

تاج مسیح صاحب خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے! جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جو نوکری اٹھانے والے کے پوتے کو اس ملک کے بالادست اداروں تک پہنچاتا ہے ووٹ کی طاقت بندوں کی گولی کی طاقت سے کتنی زیادہ ہے۔ اسلام اور مسیحیت نے انسان کو مساوات کی تلقین کی ہے دنیا کا کوئی مذہب انسانی تفریق میں یقین نہیں رکھتا صرف اچھے کام کی وجہ سے کوئی بڑا بنتا ہے مذاہب انسان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ جمہوریت نہ ہی مذہب اور نہ ہی کمیونزم کی طرح کوئی نظریہ ہے مگر جمہوریت ایک ایسے طرز زندگی کو اختیار کرنے کا حق دیتی ہے جہاں انسان کو مساوات اور عظمت آدم کے خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے۔ اس میں نوکری اٹھانے والے اور دنیا کے دولت مند ترین انسان کو ایک دوسرے کی عزت اور احترام کا سبق ملتا ہے۔ معاشی مساوات کے چشمے بھی اسی احتسابی عمل سے پھوٹتے ہیں۔

تاج مسیح صاحب میں آپ سے باتیں کرتے ہوئے ہسپانیہ کے دار الحکومت میڈرڈ کو تصور میں لے آیا، جہاں میں آخری مرتبہ 1998ء میں گیا تھا۔ مجھے اپنے سفارت خانے کی صفائی کرنے والی میریم (مریم) سے ملا یا گیا جو نہ صرف کمروں کی صفائی کرتی تھی بلکہ تمام غسل خانوں کے فلش اور کموڈ بھی چمکاتی تھی۔ اس کے والد سپین کی اسمبلی کے ممبر تھے۔ میں اس سے انٹرویو کرتا رہا، وہ کہنے لگی، ہم نے پہلے اپنے ذہن کی غلاظت کو صاف کیا ہے۔

میرے والد اپنے فرائض سرانجام دیتے اور میں اپنے ہم نے ایک ایسا نظام ذہنی طور پر قبول کیا جس میں میرے بچے بھی اس بات پر شرمندہ نہیں ہونگے کہ ان کی ماں کسی سفارت خانے کے کموڈ چمکاتی تھی۔ اس نے کہا میرا ایک بیٹا ہے، وہ اعلیٰ اداروں میں تعلیم حاصل کر رہا ہے، کہتا ہے میں نے سیاست میں جانا ہے جبکہ مجھے سیاست بالکل پسند نہیں ہے۔ اگر کل کو وہ سپین کا وزیر اعظم بن جائے تو وہ فخر سے کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی ماں کا بیٹا ہے جس نے رات دن محنت مزدوری کر کے انسانیت کی خدمت کی۔

تاج مسیح صاحب مجھے میریم میں آپ کی بیوی اللہ رکھی نظر آنے لگی جو مجھے ہمیشہ باوقار لگتی تھی۔ آپ دونوں کی جوڑی صابر اور قناعت کرنے والوں کی جوڑی تھی، اللہ رکھی جب کونسلر بنی اسے دوسرے فریق نے ووٹ کے لئے دولت کی پیش کش کی۔ اس نے کہا تم دنیا جہاں کے خزانے لا کر بھی میرا ضمیر نہیں خرید سکتے۔ میریم اور اللہ رکھی کے کردار مجھے بہت تقویت دیتے ہیں۔ میں انسان کے اس روپ کے سائے میں کڑی دھوپ میں ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں۔

خدا حافظ تاج مسیح صاحب

والسلام

آپ کا خیر اندیش

جاوید ہاشمی

حدیثِ دل

10

11

12

13

14

15

16

17

18

19

20

21

22

23

24

یومِ پاکستان اور بھٹکے ہوئے راہی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

23 مارچ 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

کمرہ ملاقات میں احباب جمع تھے، وہ پاکستان کے حالات سے دلبرداشتہ نظر آئے۔ انکی تسلی کیلئے میں نے کہا کہ میں نے گذشتہ چالیس سالوں میں شاہی قلعہ لاہور C.I.A سٹاف ملتان، چوہنگ، چونا منڈی اور لاہور کے اکثر ٹارچریلوں میں جسمانی تشدد کا سامنا کیا ہے، ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کی ہیں، مگر ایک لمحے کیلئے بھی پاکستان کے مستقبل سے ہایوس نہیں ہوا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ پاکستان ہی اس خطے میں ایسا ملک ہے، جو علاقے کے دیگر ممالک کی راہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس ملک کا بلوچ، ایران کے بلوچوں میں جا کر آباد ہونے کا تصور نہیں کر سکتا، حالانکہ نسل اور تہذیب کے اعتبار سے ایرانی بلوچ اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان کے بلوچ کو قومی دھارے میں جو مقام حاصل ہے وہ ایران کے بلوچ کو وہاں کبھی حاصل نہیں رہا۔ اسی طرح کابل کا پٹھان پاکستان کے پٹھانوں کو برابری کا مقام دینے کو تیار نہیں۔ پاکستان کا پٹھان بھی کابل پٹھان کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ زبان، نسل، تہذیب اور مذہب کے اعتبار سے وہ ایک ہیں۔ ایران کا بلوچ اور افغانستان کا پختون، آپ کو کراچی میں ہر جگہ نظر آئیگا مگر پاکستانی بلوچ اور پٹھان نہ کابل قندھار میں ملے گا اور نہ بندرعباس اور تہران میں۔ ایران سے پاکستان آکر بسنے والے بلوچوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ افغانستان سے پاکستان آئے ہوئے افغانیوں کو پاکستان کے کسی بھی حصے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کے سندھی نے تمام صوبوں سے پہلے بمبئی ریجنسی سے آزادی کی جنگ لڑی۔

یہاں کا پنجابی ہندوستانی پنجاب میں جا کر آبا ہونے کا ڈراؤنا خواب دیکھنے کو تیار نہیں۔ نہ ہی وہ جالندھر، ہوشیار پور یا کسی اور شہر میں جا کر گھر بسانا چاہتا ہے۔ اُردو بولنے والے اگر یہاں ایک کروڑ ہیں تو ہندوستان میں آج بھی پندرہ بیس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان موجود ہیں۔ فرض کریں اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا پاکستان آنے والے دو کروڑ مہاجرین کا حال ان بیس کروڑ مسلمانوں سے زیادہ مختلف ہوتا جن کا وجود اب بھی ہندوستان میں ناقابل برداشت ہے؟۔ گجرات کے فسادات، مقبوضہ کشمیر میں ظلم و ستم اور بابرہ مسجد کے واقعات کی وجہ سے آج پاکستان بنانا پڑتا تو نصف صدی کی تاخیر کا جوابدہ کون ہوتا؟۔

تقسیم سے پہلے پنجاب، سندھ اور سرحد کے وزرائے اعلیٰ مسلمان تھے۔ بلوچستان کو صوبہ کا درجہ 1970ء میں ملا۔ اسی طرح بنگال اور آسام کے علاقے جو بعد میں پاکستان کہلائے، وہاں بھی وزرائے اعلیٰ مسلمان تھے۔ مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع پر مشتمل مشرقی پاکستان 1971ء میں بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ علاقے مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے اپنی الگ شناخت رکھتے تھے، مگر معاشی طور پر ان علاقوں کے مسلمان ہندوؤں کے دست نگر تھے۔ انارکلی لاہور میں مسلمانوں کی صرف تین دکانیں تھیں۔ موجودہ شمال مشرقی پنجاب کے بڑے زمیندار، ایک دو مسلمان گھرانوں کے علاوہ تمام سکھ تھے۔ موجودہ جنوب مغربی پنجاب کے بڑے زمیندار مسلمان تھے مگر وہ انگریز کے گماشتے اور ہندو کے مقروض تھے۔ وہاں کا عام مسلمان دوہری کی بجائے تہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا تجارت میں یہی حال راوہل پنڈی، ملتان، پشاور، کراچی، حیدرآباد اور کوئٹہ کا تھا۔ موجودہ پاکستان کے تمام شہروں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی ہندوؤں کی تعداد کم نہ تھی۔ مسلمان زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتے تھے۔ موجودہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لئے وہ مذہبی اور سماجی طور بھی بالادست تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے چند خاندان وہاں کے علاقوں میں بااثر بھی تھے اور مالی طور پر مضبوط بھی تھے۔ وہاں کے مالدار مسلمان بھی زیادہ تر انگریز کے وفادار تھے۔ صرف متوسط طبقہ پاکستان کا حامی تھا۔

اب یہاں سے ایک بھی اُردو بولنے والا دہلی جا کر ایسے حالات میں نہیں رہنا چاہتا جیسے حالات میں وہاں کے بیس کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ یہاں کا کشمیری ہندوؤں کے قبضے والے کشمیر سے بہتر زندگی گزار رہا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ سرحد کا پختون ریڈیو کابل کے گیتوں کو روح کی غذا سمجھتا ہے، پنجابی امرتسرٹی وی دیکھنا چاہتا ہے، اُردو بولنے والا بھی ہندوستان کے اُردو گیتوں کو خوش ہو کر سنتا ہے، بلوچوں کو ایران سے موسیقی کا تحفہ بھی نہیں ملتا، اسی طرح سندھی ثقافت کو بھی پاکستان میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ حضرت لطیف بھٹائی اور سچل سرمست کی شیرینی صرف پاکستان میں ہے، ہندوستان اس سے محروم ہے۔ یہ جنت ارضی ہے۔ لیکن ہر پاکستانی شکوہ گزار بھی ہے۔ جب تک پاکستان کے معاملات کو چلانے کے لئے برابری کی سطح کی سوچ پر پہرے بٹھا کر کسی ایک صوبے کی بالادستی کا سلسلہ اپنایا جائے گا، جنت فردوس کو چھوڑ کر آنے والا انسان اس جنت ارضی میں کیسے خوش رہ سکے گا؟۔

1857ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں

مایوس ہو گئے تھے۔ ہندوؤں کیلئے یہ واقعہ محض (Change of Masters) آقاؤں کی تبدیلی سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے کوئی ایسا مثالی نظام قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، (نہ تو اسلام کا نظام عدل ہندوستان میں متعارف کرایا گیا اور نہ ہی معاشی مساوات کیلئے کوئی کام ہوا)۔ مسلمان حکمرانوں نے وہی طرز حکمرانی اختیار کیا جو شہنشاہیت کے دور کا حصہ تھا بلاشبہ مسلمان حکمرانوں کا طرز حکومت ہندوستان کی تاریخ کے ماضی کے حملہ آوروں سے کہیں بہتر تھا، مگر وہ کوئی مثالی طرز حکومت کہلانے کا حقدار نہیں۔ جب تبدیلی آئی تو آہستہ آہستہ ہندو اکثریت انگریز کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی۔ انگریز نے، چونکہ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی لہذا اس کے مظالم کا نشانہ بھی مسلمان بنے۔ اُن کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اِکا دکا مزاحمتی تحریکیں چلانے کی کوشش نے انگریزوں کو مسلمانوں کیخلاف مواد مہیا کر دیا تو سرسید

جیسے مصلحین نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی اور مسلمانوں کو جدید حالات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔ اس جدیدیت پر انہیں کفر کے فتوؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وقت نے اُنکے منصوبوں کی حقانیت واضح کر دی اور علی گڑھ کی تحریک نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی۔

1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا بانی ایک انگریز تھا جس کا نام ڈگلس ہیوم تھا کانگریس نے آہستہ آہستہ جی حضور کی سیاست ترک کر کے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور اُس کے راہنماؤں نے قربانیوں کی عظیم مثالیں قائم کیں۔ کانگریس نے 1905ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ہندو موقف کی حمایت کرتے ہوئے اس کی تینخ کا مطالبہ کیا چنانچہ مسلمانوں نے انگریز کی سرپرستی میں قائم ہونے والی اس جماعت کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

30 دسمبر 1906ء کو ڈھا کہ میں نواب سلیم اللہ کے گھر میں محمدن ایجوکیشن کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی، جس کے ذریعے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سر آغا خان کو اُس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ مسلم لیگ کے مخالفین آج تک مسلم لیگ اور پاکستان کے قیام کو انگریز کی سازش کہتے ہیں۔ انہیں اگر یہ کہا جائے کہ کانگریس کا تو قیام ہی ایک انگریز کا مرہون منت ہے تو چُپ ہو جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کے قیام کو ایک سو سال ہو گئے ہیں۔ آج 23 مارچ ہے۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ جس مقام پر آج کے دن مسلمانان ہندو پاک نے ایک قرارداد کے ذریعے علیحدہ وطن حاصل کرنے کا اعلان کیا تھا، اُسی مقام پر اس ملک کا کمانڈر انچیف قائد اعظم کے فرمان کے خلاف، آئین کے تحت اُٹھائے ہوئے حلف کی دھجیاں اُڑا رہا ہے۔ کیا پاکستان اسی مقصد کیلئے حاصل کیا گیا تھا؟ ہم مسلم لیگ کا جشن صد سالہ منا رہے ہیں۔ آئین کے بجائے بندوق ہم پر حکومت کر رہی ہے، کہیں ہم بھٹکے ہوئے راہی تو نہیں جن کی منزل انہیں ایک سو سال سے تلاش کر رہی ہے۔

قیام پاکستان سے ذرا پہلے قائد اعظمؒ نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے متبادل تجاویز قبول کر لیں، مگر ہندو قیادت مسلمانوں کو داخلی آزادی دینے کو بھی تیار نہ تھی۔ ساٹھ سال ضائع کرنے کے بعد ہندوستانی قیادت وہیں کھڑی ہے۔ وہ کشمیر میں قبضے کو طول دینے کے لئے پرارہوں کھربوں خرچ کر رہی ہے، اپنے تمام ہمسایوں پر دھونس جمانے کیلئے دفاعی اخراجات میں اضافہ کرتی ہے جس کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں آگے نہیں جاسکی، جس کی توقع اُس سے کی جاسکتی تھی۔ ہندو کو ایک ہزار سال بعد آزادی نصیب ہوئی۔ اسے دنیا میں خود کو ایک عظیم قوم کے طور پر منوانے کا موقع ملا مگر اس کی قیادت کے غیر ذمہ دارانہ رویوں سے یہ موقع کھویا گیا ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا بانی ڈگلس ہیوم (DUGLUS HUME) انگریز تھا، جبکہ مسلم لیگ نواب سلیم اللہ خان، آغا خان اور دیگر مسلم اکابرین نے قائم کی۔ اسی طرح جب پاکستان بن رہا تھا، نہرو، ٹیل اور دوسرے کانگریسی راہنماؤں نے سنجیدہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے بار بار بیانات دیئے کہ پاکستان بننے دو، انہیں ایک دو سال کے اندر سمجھ آ جائیگی، پھر یہ ہندوستان میں شمولیت کیلئے بھاگتے ہوئے آئیں گے۔ اس وقت ہم انہیں قبول نہیں کریں گے، قائد اعظمؒ نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ پاکستان آج ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے۔ مگر ہندو قیادت نئے دور کے چیلنج کا سامنا نہیں کر سکی۔

والسلام!

تمہارا والد!

سرخ اور کالے گلاب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

8 جنوری 2006ء

بُشی جی!

السلام علیکم!

کیا حال ہے تمہارا؟ میں آج بہت خوش ہوں، ابوالقاسم کافی دنوں کے بعد ملنے آیا تھا۔ یکم دسمبر کو وہ پانچ سال کا ہو گیا مگر باتیں بوزھوں کی طرح کرتا ہے۔ کچھلی مرتبہ آیا تو پوچھ رہا تھا کہ جیل پولیس والے مارتے تو نہیں؟ آج کہہ رہا تھا میں جیل میں رہنے کیلئے آیا ہوں۔ آمنہ نے بتایا ملتان سے آتے ہوئے سارا راستہ یہی کہتا رہا کہ میں اب جیل میں بابا سائیس کے پاس رہوں گا۔ کہنے لگی، میں نے اسے کہا! میزے والد نے ساری زندگی اسی طرح گزار دی، اب تمہارے ارادے بھی اچھے نہیں لگتے۔ میں نے آمنہ سے کہا! میں خوش ہوں کہ جس مقصد کیلئے میں نے جدوجہد کی اس کے جراثیم آئیوالی نسلوں میں سرایت کر گئے ہیں۔

دوسری خوشی اس بات کی ہے کہ آج میمونہ کو گاڑی مل گئی۔ گذشتہ 6 سال میمونہ نے بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے گزارے۔ تمہاری والدہ بیماری کی حالت میں سردیوں اور گرمیوں میں ملتان سے طویل سفر کر کے راولپنڈی اور لاہور کی جیلوں میں ملاقات کیلئے پہنچتی رہی۔ خود تمہیں اور تمہاری بہنوں کو بھی انہی مشکلات کا سامنا تھا۔ مجھے آپ سب کا بس پر آنا کبھی ناگوار نہیں گذرا۔ لیکن مجھے اعتراف کرنے دو کہ گاڑی کا انتظام ہونے پر میں بہت خوش ہوں۔

ممتاز خالد صاحب اکثر میری ملاقات کیلئے جیل آتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے! جدہ اور مکہ مکرمہ میں ہمارا کاروبار ہے، میں اگر کسی کام آسکوں تو حاضر ہوں۔ میں نے انھیں میاں نواز شریف کے نام خط دیا کہ یہ جماعت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ میاں صاحب

سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ واپس آ کر انہوں نے مجھ سے ملنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ایک موقع پر کہنے لگے، آپ جیل میں بیٹھے ہیں، میں جماعت کے علاوہ آپ کی خدمت کیلئے بھی حاضر ہوں۔ میں نے ان کا شکر یہ ادا کیا، مگر ان کا اصرار کئی مہینے جاری رہا۔ انہوں نے میری ضرورتوں کا خیال رکھا، جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ میں نے جب میمونہ سے کہا کہ تمہارے لئے گاڑی کا انتظام ہو گیا ہے تو وہ کہنے لگی، اب تو ہم بسوں پر سفر کے عادی ہو گئے ہیں، ہمارے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ میں اُسکی کم گوئی کا فائدہ اٹھا کر اس سے مذاق کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ باقی تو سب ٹھیک ہو گیا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ وہ بس کمپنی کہیں خسارے میں نہ چلی جائے جس پر تم سب نے سفر کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ملتان سے لاہور، لاہور سے ملتان پھر ملتان سے اسلام آباد اور اسلام آباد سے لاہور کا سفر زمین گول ہونے کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔ عدالتوں کی پیشیاں، جیل کی ملاقاتیں، میری رہائی کے جلسوں میں حاضری، اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کا فریضہ، پارٹی اجلاسوں میں حاضری اور جماعتی سرگرمیوں کو ہر حالت میں جاری رکھا۔ معلوم نہیں نسبتاً آرام دہ سفر اسکی صحت پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ میمونہ میرے استدلال سے محظوظ ہوتی رہی۔ ہاں میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں نے قاسم کو پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر دیا۔ اس میں تمام پھول شامل تھے، جو میں نے گذشتہ دس ماہ میں جیل میں اگائے۔ اس میں نیلے، پیلے، اودے، سفید، سرخ، اور کالے گلاب بھی تھے۔

والسلام!

تمہارا والد!

زلزلہ زدگان اور درد کے رشتے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

11 جنوری 2006ء

بُشی جی !

السلام علیکم !

یہ عید بھی آپ سے ملے بغیر گزر گئی۔ گذشتہ چھ سال میں شاید ہی ہم نے کبھی کوئی عید اکٹھے منائی ہو۔ پچھلی عید میمونہ نے راولا کوٹ اور بالا کوٹ کے زلزلہ زدگان کے ساتھ گذاری۔ اب کے مومنہ اور جویریہ کو سردیوں کی چھٹیاں ہونے لگیں تو کہا میں انھیں زلزلہ زدہ علاقوں میں لے جاؤنگی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ خوشی عید سے کم نہیں کہ میرے بچوں کے دل اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ آج میری طبیعت پر سخت بوجھ تھا۔ عید کے دن شمالی وزیرستان اور بلوچستان میں چلنے والی گولیوں کی گونج نے میرے دل کو دہلا دیا۔ تڑپتی لاشوں نے مجھے بہت رُلا یا۔ یہ کس کا خون بہہ رہا ہے، کس کی عاقبت نااندیشی نے بھائی کو بھائی کے سامنے لاکھڑا کیا، میرے سامنے پڑے ہوئے گلدستے سے ایک پھول مر جھا کر گرا تو پورے گلدستے کے رنگ پھیکے لگنے لگے۔ میں اٹھ کر باغیچے میں چلا گیا۔ ایسے لگا جیسے پھولوں سے خون ٹپک رہا ہو۔ مجھے اپنی ساری تکلیفیں بھول گئیں۔ سچ تو یہ ہے میں تمہیں بھی بھول گیا۔ تم لوگ آج کیسے عید مناؤ گے، مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے ان پانچ سالوں میں نماز عید پڑھنے کی کبھی بھی اجازت نہیں ملی لیکن عید کے روز جیل کے چند قیدی احباب کو میرے پاس آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس سے زہر تنہائی کم کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں چاہ رہا تھا آج کوئی میرے پاس نہ آئے۔ میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ میں لان میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ میرے برداشتی نے مجھے یاد دلایا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں نے پیالی پر نظر ڈالی مجھے اس میں خون نظر آیا، بے دلی سے غسل خانے میں جا گھسا۔ اپنے اوپر پانی ڈالا تو محسوس ہوا جیسے کسی مردے کو نہلا یا جا رہا ہے۔ کپڑے بدلے تو کفن میں ملبوس ہونے

کا احساس ہونے لگا۔ خوشبود کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کافور کی خوشبو کے بھبھکے سے میرے نٹھوں میں گھسنے لگے۔ میں اپنے آپ کو ایک لاش سمجھ رہا تھا۔ آزاد کشمیر اور ہزارہ کے زلزلہ کے بلبے تلے دبی ہوئی۔ یاسرحد اور بلوچستان کے پہاڑوں پر ٹپتی ہوئی لاش۔

میں جانتا ہوں تمہیں میری کمی محسوس ہوئی ہوگی، مگر آپ سب کو اس بات کا علم ہے کہ میں آزاد ہوتا تو بھی ان حالات میں آپ کے ساتھ مل کر عید نہ مناتا۔ میں زلزلہ زدگان کے ساتھ ہوتا، یا بلوچستان اور سرحد کی آگ بجھانے کیلئے اپنی چونچ میں پانی کے چند قطرے لے کر وہاں کی اڑان بھر رہا ہوتا۔ میں اولاد ابراہیم ہوں، میں آل اسماعیل ہوں، میں قافلہ جاز میں خُسییت کے پرچم کا علمبردار ہوں، ہماری ہر عید قربانی کے لازوال اثاثے سے جنم لیتی ہے۔ میری قید کے مرثیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج کی خوشی کو غم میں بدلنے کے بجائے، غم کو قربانی اور ایثار کے جذبے میں ڈھالنا ہوگا، جو اس مقام پر پہنچ جائے، عید منانے کا حق صرف اُس کو ہے۔ اس عید سے مسرت اور خوشی کے لازوال چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس کیلئے ہم سب کا صرف ایک جگہ ہونا ضروری نہیں۔

لندن سے راجہ جاوید نے بتایا! کچھ لوگوں نے کل عید منائی اور کچھ آج منا رہے ہیں۔ میرے لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ میں نے زمینی حقائق کی قوت کا بارہا مشاہدہ کیا ہے۔ پاکستانی لندن میں بیٹھ کر کعبہ سے جاری ہونے والے حکم کی تعمیل کیلئے تیار نہیں۔ وہ اپنے ملک کے اعلان عید پر عمل کرتے ہیں۔ مردان، چارسدہ کے لوگ انگریز کی حکومت میں رہتے ہوئے بھی کابل کے آزاد اسلامی ملک کے اعلان کے مطابق عید منانے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسلام نے حج اور عیدین کے وہی رسوم و رواج رہنے دیئے جو پہلے سے موجود تھے۔ فقط جہاں فرد کی حیثیت مذہب سے بالاتر ہو جاتی۔ وہاں سے فرد کو ہٹا کر وقت کو اہمیت دے کر اجتماعیت پیدا کر دی گئی۔ مناسک حج میں طواف زیارت کے بعد احرام اتارنے کی اجازت موجود تھی مگر دور جاہلیت میں احرام اتارنے کی اجازت ایک قریشی سردار دیتا تھا اس طرح ہر موقع کا الگ الگ سردار تھا۔ وہ اکثر اپنی اہمیت جتلانے کیلئے حجاج کو زیچ کرتے، اسلام نے ان افراد کی اجارہ داری ختم کر دی اور حکم دیا کہ طواف زیارت

کے بعد شام سے پہلے اجرام اتارنے کی اجازت عام ہوگی۔ اسلام نے ان رسموں کی فضولیات ختم کر دیں اور رسموں کو بامقصد بنا دیا۔ مگر مناسک حج کو رسوم و رواج سے متصادم ہونے کی فضا سے احتراز کیا۔ صوفیاء نے بھی وحدانیت کے فلسفے کو قائم رکھتے ہوئے مقامی رسوم و رواج کے ٹکراؤ سے بچاؤ کا راستہ اختیار کیا جسکی وجہ سے اسلام میں عالمگیریت پیدا ہوئی۔

گاؤں جاؤ تو میری ماں کی قبر پر ضرور جانا اور کہنا کہ ماں! تیرا بیٹا کئی سالوں سے حاضری نہیں دے سکا، تیرے پاس نہ پہنچنے کا اُسے دکھ ہے، وہ تیری آغوش کی گرمی کو ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں بھولا، تو جس مٹی میں آسودہ خاک ہے اُس نے اُسی مٹی کا قرض چکانے کیلئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ کہنا ماں! تو نے وطن کے ہر ذرے کو کشمیر سمجھ کر اس سے محبت کا درس دیا، خود تکلیف میں رہ کر دوسروں کی تکلیفیں دُور کیں۔ اپنی ضرورتوں کو محدود کر کے غریبوں اور حاجتمندوں کی دیکھ بھال کی۔ تو نے اپنے ہونے کو نہ ہونے میں ڈھال دیا۔ اپنے وجود کی نفی پر تم کتنی خوش تھیں۔ ایسے لمحات میں تمہارے چہرے پر ایک ملکوئی تبسم ہوا کرتا تھا، جو چار سو خوشیاں بکھیرتا تھا۔ ماں سے پوچھنا: کیا میں وہی کچھ نہیں کر رہا جس کا اس نے درس دیا تھا۔ وہ میری کوتاہیوں کو ضرور معاف کر دے گی۔ مجھے یہاں بیٹھے اسکی قبر کی مٹی کی خوشبو محسوس ہونے لگی ہے۔ گویا آغوشِ مادر میں ہوں۔

عمران اور سعدیہ نے حج کر لیا۔ اب اپنے بچوں سے ملنے کیلئے بے تاب ہیں، ماہ نورِ فاطمہ اور محمد بھی ان کے بغیر بہت اُداس ہیں۔ بچوں کے بغیر ان کی یہ عید زندگی کی سب سے خوبصورت عید ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری عید بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ البتہ ایک بات ہم سب میں مشترک ہے، بغیر والدین کے بچوں کی عید اور بغیر بچوں کے والدین کی عید! کیا یہی بات آزاد کشمیر، ہزارہ، شمالی وزیرستان اور بلوچستان کے بچوں اور ان کے والدین اور ہمارے درمیان مشترک نہیں۔ درد کے رشتے بھی کتنے مضبوط ہوتے ہیں، نہ جانے میں کیوں روزِ عید کو شامِ غریباں میں بدلنے پر تلا ہوا ہوں۔ خدا کرے یہ عید ہم سب کیلئے باعثِ مسرت ہو!!!۔

شوقِ شہادت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

14 جنوری 2006ء

بُشی جی!

السلام علیکم!

چودہ جنوری کا دن میری زندگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ چالیس سال پہلے ایوب خان کی آمریت کے خلاف پہلی مرتبہ میں جیل یا تراکی۔ آج چالیس سال کے بعد بھی وہیں ہوں۔ عوام کی زندگی کو جیل کی زندگی سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے جیل میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ تاکہ مجھے بڑی جیل میں رہنے کا سلیقہ آجائے۔ میری اصلاح نہ ہو سکی تو لازم ہو گیا کہ مجھے بار بار اس عمل سے گزارا جائے۔ حکمران اس نکتے کو کیوں نہیں سمجھتے کہ جب تک پوری قوم کی ”اصلاح“ نہ ہو میں خود کو کیسے بدل سکتا ہوں؟

حسب معمول میں آج پھانسی گھر کے سامنے سے گذر رہا تھا، دروازہ کھلا دیکھ کر اندر چلا گیا، عملہ صفائی کر رہا تھا۔ شاید کسی کو منطقی انجام سے ہمکنار کرنا مقصود تھا۔ میں تختہ دار کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس رسی نے کتنے جابروں اور شہ زوروں کی گردنوں کو مایا ہے۔ ان میں گھروں اور بستوں کو اجاڑنے والے بھی تھے اور وہ بھی جن کے جانے سے کئی گھرا جڑ گئے۔ کئی لوگ ذاتی انتقام کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پھر مجھے وہ لوگ یاد آنے لگے جنہیں نظریات کے اختلاف نے اس پھندے تک پہنچایا، حضرت عیسیٰ کی پھانسی کا منظر میرے سامنے تھا، منصور کے انا الحق کی آواز بھی سنائی دینے لگی، سقراط زہر کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا تھا، غازی علم دین شہید بھی ناموس رسالت کا پرچم ہاتھ میں لیے کھڑا تھا، بھگت سنگھ کے شور سے جیل کا نظام تہہ و بالا ہور ہا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو تو میرے سیل سے یہاں آئے تھے۔ میں سوچنے لگا موت سے ہم آغوش ہو کر یہ لوگ آج تک زندہ کیوں

ہیں؟ جواب بہت آسان تھا، ذاتی منفعت یا ذاتی انتقام کیلئے جان دینے والوں کے مقاصد محدود تھے، جبکہ، اپنی سوچ پر قائم رہنے والے افراد اپنی ذات سے بالاتر ہو گئے تھے۔ ان کے جسم کو فنا کر دیا گیا، مگر ان کے نظریات کو نئی زندگی مل گئی۔ پھانسی گھر ساری جیل میں خوف کی علامت ہے۔ ہمسائیگی کی وجہ سے مجھے اس جگہ سے اتنا ڈر نہیں لگا۔

تم خود بتاؤ انسانی زندگی میں جسم کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا ڈاکٹر اس بات کی گارنٹی تو دے نہیں سکتا کہ میں اگلے ایک منٹ تک ضرور زندہ رہوں گا۔ میں نے سینکڑوں لوگوں کو دیکھا ہے، جو خاندانی رنجشوں کی وجہ سے سزائے موت پا چکے ہیں۔ کئی بے گناہ افراد بھی پھانسی کے تختے پر جھول گئے، کئی عدالتی نظام کی خرابی کی وجہ سے سالہا سال سے جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں، میں انہی افراد میں سے ایک ہو سکتا تھا، یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میرا جسم کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر کسی ہسپتال کے بستر پر پڑا ہوتا، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری زندگی میں مقصدیت کا عنصر داخل کر دیا۔ جیل میں آ کر اپنے تندرست والد سے ملاقات تمہیں بہتر لگتی ہے یا ہسپتال کے بستر پر درد سے کراہتے ہوئے اور ایک ایک سانس گن گن کر زندہ رہنے والے لاشے سے۔ خدا کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ جن کی زندگی صرف اپنے لئے ہو، اس سے وہ موت کئی درجے بہتر ہے جو دوسروں کی بہتری کیلئے آجائے۔ میں اپنی موت کو دیکھ سکتا ہوں، اسکا سامنا کر سکتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کسی مقصد کیلئے مرنے والا مر ہی نہیں سکتا۔ میں روز اپنے باغیچے کے پھولوں کو کھلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ جب پوری طرح کھل جاتے ہیں تو موت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ مرجھاتے ہیں اور پھر اسی مٹی کا رزق بن جاتے ہیں، جس مٹی سے نکلے تھے مگر وہ حُسن جو پھول کو پھول بناتا ہے، کبھی نہیں مرتا۔ اگر پھول کا رشتہ مرتے دم تک ٹہنی سے قائم رہے تو اس کی مرجھائی پتیوں کے نیچے بننے والا بیج نئی زندگی میں ڈھل جاتا ہے۔

میں لالہ صحرا نہیں، مگر صحرائی ہونے کی وجہ سے فطرت نے میری حنا بندی ضرور کی ہے۔ میں نے کب تصور کیا تھا کہ چالیس سال کی صحرا نو زدی کرونگا۔ میں بنی اسرائیل بھی

نہیں ہوں۔ اسلئے اس جدوجہد کو چالیس سالہ سزا نہیں مانتا۔ مجھے سنگلاخ زمین پر چلتے ہوئے اپنوں کی سنگ زنی کا شکوہ بھی نہیں ہے۔ مجھے شاید بنایا ہی ایسا گیا تھا۔ میرے لئے روحانی خوشی کا خزانہ اسی سفر میں دریافت ہونا تھا۔ میں ہر حالت میں خدا کی مرضی پر صابر و شاکر ہوں۔ احباب سے اعزاز کے ساتھ دفنائے جانے کی خواہش بھی نہیں۔ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرا سر اللہ کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔ میری زندگی میں مشکلات آئیں مگر میری ناکامیوں نے ہمیشہ کامیابیوں کا دروازہ کھولا۔ مجھے قدم قدم پر نعمتوں سے نوازا گیا۔ میں نے اتنی محنت نہیں کی جتنا پھل ملا۔ میں خلوص نیت کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ دوسروں کے بارے میں جتنا بہتر سوچیں گے اور ان کی مشکلات دور کرنے کیلئے محنت کریں گے، اتنا ہی آپکی ذاتی زندگی خوبصورت ہوتی جائیگی، مجھے یقین ہے کہ دوسروں کے بارے میں مثبت سوچ آپکی ذہنی اور جسمانی بیماریاں دور کر دیتی ہے۔ میں نے مشکل پسندی میں زندگی کا راز پایا ہے۔ اپنے لئے اور اپنے آئیوالے ادوار کیلئے مشکل فیصلے کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہئے۔ اکثر مشکلات کامیابی کا پیغام لاتی ہیں اور موت زندگی کا! اصل چیز انسان کا کردار ہے، انسان کے جسم سے اسکا کردار زیادہ دیر تک زندہ رہتا ہے۔ جسم قربان کر کے کردار بچانا ہی شہادت ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

چاچا منگتو خان رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

خبر ملی ہے کہ چاچا منگتو خان (رحمۃ اللہ علیہ) اس دنیا میں نہیں رہے، یقیناً تم نہیں جانتی کہ منگتو خان کون ہے؟ یہ میرا بھی چاچا ہے اور تمہارا بھی۔ اسے آخر دم تک میرا نام پورا نہیں آتا تھا، وہ مجھے ”ہاسی جوائنڈ“ کہہ کے پکارا کرتے تھے۔ میں 1985ء کے الیکشن میں چالیس کلومیٹر کا سفر کر کے حلقہ انتخاب کے آخری گاؤں میں پہنچا تو ہمراہیوں کے چہرے پہچاننا مشکل تھا۔ راستہ کچا ہونے کی وجہ سے ہم دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کے شیشے میں جھانکا تو اپنے آپ کو اجنبی لگا، چہرہ مٹی کے غازے کی تہہ میں دبا ہوا تھا۔ گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے تو لوگ ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ ایک چھوٹے سے جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا، میں نے لوگوں سے کہا کہ اگر منتخب ہو گیا تو آپ کے گاؤں کیلئے پختہ سڑک بنوادونگا۔ مجمع سے ایک درمیانے قد کا اُدھیڑ عمر کا آدمی، جس کی داڑھی میں سفید بال تھے اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا! ہمیں آپ کی باتوں میں سچائی کی بو آئی ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ ہمیں ہائی سکول بنوادیں گے۔ یہ میرا چاچا منگتو خان سے پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا اور میری کامیابی کے بعد ان کے گاؤں میں سکول قائم ہو گیا۔

میں نے اپنے حلقہ انتخاب میں ایک سو سے زائد ہائی سکول اور کئی تعلیمی ادارے کھلوائے۔ لیکن جتنا خوش میں نے مومن آباد کے چاچا منگتو کو دیکھا اور کسی کو نہیں دیکھا۔ میں 1996ء تک اسی حلقے سے انتخاب میں حصہ لیتا رہا، جب بھی اس گاؤں میں جاتا چاچا

منگتو میرے استقبال کرنے میں پیش پیش ہوتا۔ میں اس کے گھر جاتا تو وہ مجھے گلو کی چائے زبردستی پلاتا۔

چاچا منگتو گاؤں کی ڈاک بھی تقسیم کرتا تھا۔ جونہی میں گاؤں میں داخل ہوتا، وہ تمام کام چھوڑ دیتا، اپنی لائٹی اٹھا کر سب سے آگے چلنا شروع کر دیتا اور میری انتخابی مہم کا ہراول دستہ بن جاتا۔ اُس کی چال سے لگتا کہ وہ لائٹی کا سہارا نہیں لے رہا بلکہ لائٹی کا پیچھا کر رہا ہے، ہر دروازے پر دستک دیتا اور میرے لئے ووٹ مانگتا۔ آخری الیکشن میں وہ بیمار تھا، اس کے باوجود چلتے ہوئے ہمیں پیچھے چھوڑ جاتا، میں منع کرتا تو کہتا! آپ نے اس دُور دراز علاقہ کے لوگوں کو جو تحفہ دیا ہے، ہم اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ آپ ہزاروں میل دور ہوں تو میری نگاہیں آپ کو دیکھ سکتی ہیں، پھر کہتا یہ نگاہیں مرتے دم تک کسی اور طرف نہیں دیکھیں گی۔ 2002ء کے انتخاب میں حکومت نے میرے حلقہ انتخاب کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ میرا وہ حلقہ، جہاں میں نے 20 سال تک ہر دروازہ کھٹکھٹایا، میرے پاس نہ رہنے دیا گیا۔ وہاں کے انسان تو ایک طرف، جانوروں اور درختوں سے بھی میری شناسائی تھی۔ چاچا منگتو کا گاؤں اب میرے حلقہ انتخاب میں نہیں ہے۔ چاچا منگتو نے کہلا بھیجا، میں مرنے والا ہوں، یاد رکھنا جب میں مروں گا تو میری آنکھیں تمہیں دیکھتی ہوگی، کیونکہ تم نے ہمارے علاقہ کے لوگوں کو علم کا نور دیا۔ میں چشم تصور سے چاچا منگتو کے جسدِ خاکی کو دیکھ رہا ہوں، اسکے چہرے کی مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح موجود ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے وہ اب بھی میری طرف دیکھ رہا ہے۔

میں تمہیں خط لکھ رہا تھا تو اعلان ہوا کہ کویت کے حکمران جناب جابر الاحمد الجابر الصباح کا انتقال ہو گیا، میں انکی تدفین کا منظر دیکھتا رہا۔ قوم کیلئے اُنکی 23 سالہ خدمات کا تذکرہ خاصا طویل تھا، جس درد مندی کیساتھ انہوں نے فلسطین، افریقہ اور ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی خدمت کی اسکا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا یقیناً یہ بہت بڑے آدمی کی موت تھی۔ ٹیلی ویژن کے اناؤنسر نے کویت کے امیر کا نام ادب سے لینا شروع کیا اور آخر میں

اُس نے شیخ جابر الاحمد الجابر الصباح رحمۃ اللہ علیہ کہا۔

منگتو خاں ایک غریب آدمی تھا۔ اس نے ایک سکول ملنے کی خوشی تمام عمر منائی، اگر اس کے پاس امیر کویت جیسے وسائل ہوتے تو یقیناً انہیں تعلیم پر خرچ کر دیتا۔ میں چاچا منگتو کو چاچا منگتو خاں رحمۃ اللہ علیہ لکھ کر خراج تحسین پیش کر رہا ہوں۔ تم بھی اسے آج سے اسے چاچا منگتو خاں رحمۃ اللہ علیہ کہنا۔

والسلام!

تمہارا والد!

پانچ ہزار بچے! بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

13 جنوری 2006ء

بشی جی!

السلام علیکم!

آج میمونہ سے گپ شپ ہوتی رہی، اس نے جویریہ اور مومنہ کو انکے کالج میں چھوڑا اور مجھے ملنے کیلئے آگئی۔ وہ میری چالیس سالہ جدوجہد کے سلسلے میں ہونیوالے جلسہ میں شرکت کرے گی۔ میمونہ 6 سال میں پہلی مرتبہ کار میں لاہور آئی، مومنہ اور جویریہ بھی ہمیشہ بس سے اتر کر رکشہ میں کالج جاتی تھیں، وہ بھی آج اپنی کار پر کالج کے دروازے پر پہنچیں۔ میں نے اس فرق پر خیالی فیچر بنا کر تمہاری بہنوں کو سنایا، وہ بہت محظوظ ہوئیں۔ میں نے کہانی یوں شروع کی کہ میمونہ کار پر لاہور آ رہی ہے، قریب سے اس کمپنی کی بس گذری جس پر وہ چھ برس سے سفر کرتی رہی ہے۔ اُس کو تعجب ہوا کہ لوگ اتنا لمبا سفر بسوں پر کیسے کر لیتے ہیں؟ پھر اُسے اس بات پر غصہ آیا کہ محکمہ ماحولیات والے کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ ڈیزل چھوڑتی بسوں کو بند کیوں نہیں کر دیتے، پھر اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، اُسے بس میں سفر کرنیوالے مسافر بھی غریب غرباء قسم کے نظر آنے لگے، اُسے بس کے حجم پر بھی اعتراض تھا جو ٹریفک میں رکاوٹ کا باعث بن گیا، پھر یہ بھی بہت بڑی خامی تھی کہ بس نہ کالج کے دروازے تک جاتی ہے اور نہ قومی اسمبلی کے استقبالیہ تک۔ جب وہ لاہور سے واپس ملتان پہنچی تو اپنے آپکو چاند سے اترنے والے خلا نوردوں کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ میمونہ میری باتوں پر مسکراتی رہی پھر سنجیدگی سے کہنے لگی، اگر یہ بس کمپنی نہ ہوتی تو شاید آپ سے ملاقات کیلئے آنا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں نے اسے کہا! مجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے، اگر یہ بسیں نہ ہوتیں تو وہ ہوائی جہاز پر سفر کا انتظام کر دیتا۔ ہماری سوچیں محدود ہیں، دینے والے

کی عطا کی وسعتوں کا احاطہ ہمارا محدود علم کیسے کر سکتا ہے۔ دورانِ گفتگو مجھے یہ جان کر بے حد خوش ہوئی کہ میسونہ کی تنظیم کے زیرِ اہتمام تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہو گئی ہے۔ آمنہ نے بتایا کہ میسونہ کی سیاسی سرگرمیوں اور میرے مقدمہ کی مصروفیت کی وجہ سے اب ان اداروں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اب اُسکے پاس ہے وہ قانون کے آخری سال کے امتحان کی تیاری بھی کر رہی ہے۔ M.B.A کے بعد L.L.B کرنے سے آمنہ کے ویژن (VISION) میں مزید وسعت آئیگی۔ یہ ذاتی اور اجتماعی میدان کی کامیابیاں غریب بچوں کے کام آنی چاہئیں۔ پانچ ہزار بچوں کی تعلیم سے دیہاتی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔ میں یہ جان کر اور بھی خوش ہو گیا کہ بیواؤں کیلئے بیت المال کا کام میسونہ نے تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ امید ہے کہ تم اس کارِ خیر کو دل لگا کر کرو گی۔ ذمہ داریوں کے بوجھ سے انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ تمہاری جو تربیت مجھ سے نہ ہو سکی، میسونہ انتہائی دانشمندی سے اس کمی کو پورا کر رہی ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

انتقالِ اقتدار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

16 جنوری 2006ء

میسونہ بی بی!

السلام علیکم!

آج شدید سردی کی وجہ سے۔ بستر سے چمٹا رہا۔ مشقتی کافی بنا کر لایا، چند گھونٹ پیئے تو کسٹل مندی سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ گرم چادر لپیٹے باہر آیا تو دیکھا کہ آج پرندے کم ہیں۔ میں نے انہیں دانہ ڈالا، مالی نے خوبصورت گل دستہ بنا کر پیش کیا، اخبارات کے مطالعہ سے فارغ ہوا تو قاری صاحب قرأت سکھانے کیلئے تشریف لائے۔ رحمت شاہ آفریدی صاحب اور میں نے مل کر سبق سنایا اور پھر دیر تک مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب وارڈر نے اطلاع دی کہ ملاقاتی آئے ہوئے ہیں۔ میں کمرہ ملاقات میں پہنچا تو شہر کے کچھ سیاسی کارکن منتظر تھے۔ وہ سیاسی جماعتوں اور سیاسی راہنماؤں کے رویے سے مایوس تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جن ممالک میں جمہوریت کا بول بالا ہے۔ وہاں بھی ابتدائی مراحل میں اسی صورت حال کا سامنا تھا، جماعتیں تبدیل کرنا روز کا معمول تھا۔ چرچل (CHURCHILL) جیسا سیاستدان وفاداریاں تبدیل کرنے میں بدنام تھا۔ جسے ہماری زبان میں لوٹا کہتے ہیں، چرچل اس کی زندہ تصویر تھا۔ فرانس (FRANCE) میں 1944ء سے 1956ء تک اکیس حکومتیں بنیں۔ سپین (SPAIN) اور جرمنی میں کئی مرتبہ پارلیمنٹ کی عمارت کو جلا یا گیا۔ جمہوریت اتنی کمزور تھی کہ اس کی کوکھ سے (HITLER) ہٹلر کی آمریت نے جنم لیا۔ اٹلی (ITALY) میں گذشتہ 37 سال میں 76 حکومتیں بنائی اور گرائی گئیں۔ جن ملکوں کے سیاستدانوں کی لوٹ مار اور محلاتی سازشوں کی وجہ سے دنیا کو کئی مرتبہ جنگ کی ہولناکیوں کا سامنا کرنا

پڑا، اب ان ملکوں میں جمہوریت کے پودے کی جڑیں گہرائی میں جا چکی ہیں۔ اگرچہ ہر ملک کا نظام جمہوریت دوسرے ملک سے مختلف ہے مگر بنیادی اصول وہی ہے، کہ تمام انسانوں کو برابری کی سطح پر مواقع مہیا کئے جائیں۔ مذہب رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر تعلیم کے دروازے سب کیلئے کھلے ہوں، عدالتی نظام میں انصاف کو یقینی بنایا گیا ہو، زمینی حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نظام حکومت کی تشکیل کی گئی ہو۔ برطانیہ کا پارلیمانی نظام، جسے جمہوریت کی روح کہا جاتا ہے، فرانس میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہاں صدارتی نظام ہی کامیاب حکومت فراہم کرتا ہے۔ فرانس کا صدارتی نظام اہل جرمنی کو قبول نہیں۔ انہوں نے اپنے حالات کے مطابق چانسلر اور پارلیمنٹ کے اختیارات کا تعین کیا ہے۔ جرمنی کے لئے کامیابی کا مشردہ سنانے والا یہ نظام سویٹزر لینڈ (Switzer Land) میں اجنٹی بن جاتا ہے، وہاں اجتماعی قیادت کے تحت ایک کونسل امور حکومت چلاتی ہے اور باہمی مشاورت سے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ سویٹزر لینڈ کو دنیا کا امیر ترین ملک بنانے والا یہ نظام اٹلی میں فیل ہو جاتا ہے، وہاں مخلوط نظام حکومت کامیاب ہے۔ یہی قصہ (AUSTRIA) آسٹریا اور دیگر ممالک کا ہے۔ امریکہ (USA) نے جو سیاسی نظام اپنایا ہے اور جسکی وجہ سے وہ دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے اسکا یہ نظام شاید ہی کسی دوسری قوم نے قبول کیا ہو۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سیاسی نظام وہی قبول ہوتا ہے جسکی حیثیت عوام نے طویل عرصہ کے عمل سے گزرنے کے بعد قبول کر لی ہو۔ اگر کوئی نظام اوپر سے مسلط کیا جائے تو وہ ناکام ہو جاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اہل برطانیہ نے اپنے غلاموں کو آزادی کے مراحل سے گزارتے ہوئے انتقال اقتدار کا جو نقشہ تیار کیا تھا اس میں پارلیمانی نظام کو وقعت حاصل تھی، اور عوام بھی اس نظام کو ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے۔ اس لئے پاکستان میں صدارتی نظام کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

ہمارے ملک میں فوجی حکمرانوں نے صدارتی نظام کو اولیت دی لیکن عوام کو جب بھی موقع ملا انہوں نے پارلیمانی نظام کو ترجیح دی۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی صدر رہنا چاہتے تھے مگر

انہیں بھی عوام کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا۔ یورپ اور امریکہ میں عرصہ دراز سے سیاستدانوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان ملکوں کے آئین میں سیاسی کارکن بنانے کیلئے اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں کو مضبوط کرنے کیلئے حکومت کی طرف سے قومی بجٹ میں فنڈز مہیا کئے گئے۔ سیاسی جماعتوں کے کارکنان کی تربیت کیلئے سرکاری سطح پر ادارے قائم کئے گئے۔

فرانس میں بار بار حکومتیں تبدیل ہوئیں، اس طوائف السلوک کی کے دور میں نہ سول بیورو کرہی نے مداخلت کی اور نہ فوجی بیورو کرہی نے۔ انہوں نے کہا، یہ سیاستدانوں کا معاملہ ہے، ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ اسی لئے فرانس کی بیورو کرہی کو فرانس کی جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے۔ جرمنی میں نئی اور پرانی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کو بڑھانے کیلئے فنڈز کی فراہمی کی ذمہ داری حکومت کے کندھوں پر ہے۔ سیاستدانوں کے وجود کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کر لیا گیا بلکہ ان کی بالادستی کو بھی دل سے تسلیم کیا گیا۔ انتقال اقتدار کا صاف شفاف نظام قائم ہونے سے ان ملکوں کی تقدیر بدل گئی اور انہیں ساری توجہ عوام کی بہتری پر مرکوز کرنے کا موقع مل گیا۔ ہمیں روز نئے تجربات سے گذرنا پڑتا ہے جسکی وجہ سے ملک میں استحکام پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ عدم استحکام ملکی معیشت کی تباہی کا باعث بن گیا ہے اور ہم ابھی تک غربت جہالت اور بیماریوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

جن قوموں نے پُر امن انتقال اقتدار کا نظام بنا لیا ہے اور اس نظام پر سختی سے کار بند ہیں وہی قومیں ترقی یافتہ کہلاتی ہیں۔ جمہوریت کا یہ کارنامہ باقی تمام کارناموں سے بڑا ہے کہ اقتدار کے حریفوں کے ہاتھ سے تلوار لیکر انہیں الفاظ کے ذریعے حصول اقتدار کیلئے ایک بہت بڑے ہال میں بٹھا دیا جاتا ہے، جسے پارلیمنٹ ہاؤس (Parliament House) کہتے ہیں۔ انہیں آئینی طور پر یہ حق بھی دے دیا جاتا ہے کہ حکومتوں کو گرانے کیلئے انکی کارکردگی پر بھرپور تنقید کریں، اور عوام کو دلائل سے قائل کریں کہ اگر موجودہ حکومت کی بجائے انہیں موقع دیا جائے تو وہ عوام کی زیادہ خدمت کریں گے۔ ان بحثوں میں تلخیاں بھی

ہوتی ہیں اور غصے کا اظہار بھی، عوام بطور جج ذونوں کی کارکردگی پر نظر رکھتے ہیں اور جب چار
یا پانچ سال بعد فیصلہ انکی عدالت میں آتا ہے تو جسے وہ چاہیں اُسکے سر پر اعتماد کا تاج رکھ
دیتے ہیں۔ آمریت میں انتقالِ اقتدار طاقت کے ذریعے ہوتا ہے اور جمہوریت میں
انتخابات کے ذریعے۔

والسلام!

تمہارا والد!

زیتون کی شاخ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

18 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

کیسی ہو تم؟ میں تو آج بہت تھک گیا۔ کئی برسوں سے عدالتوں کے دھکے کھا رہا ہوں۔ آج بھی صبح سویرے تیار ہو کر باہر نکلا، درختوں پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے زیتون کے پودے یاد آنے لگے، سنا ہے کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ تمہاری والدہ نے زیتون کے دانے بوتل میں بند کر کے بھیجے۔ میں نے جب اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے زیتون کھائے تو بہت اچھا لگا۔ میں دل میں فاطمہ زہرہ کا شکریہ ادا کرتا رہا، جس نے مراکش سے خاص اہتمام کیساتھ ان پودوں کو بھجوا یا تھا۔ زیتون کے پودوں کی یاد آتے ہی مجھے یاسر عرفات کی یاد آئی جس نے اقوام متحدہ میں داخلے کے وقت ایک ہاتھ میں زیتون کی شاخ اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں پستول۔ اُس نے کہا زیتون کی شاخ امن کی علامت ہے، اگر آپ نے اسے قبول نہ کیا تو پھر اپنی حفاظت کیلئے ہتھیاروں کا سہارا لینا پڑیگا۔ اسرائیلیوں اور اُس کے سرپرستوں نے اس شاخ کو جھٹک دیا، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

پانچ تالے کھلنے کے بعد مجھے پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اسکے آگے دو گاڑیاں تھیں اور پیچھے مزید چھ سات گاڑیاں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈی ایس پی (DSP) نے بتایا 70 پولیس والوں کی زیر نگرانی آپ کا یہ قافلہ عدالت جائیگا۔ ہم عدالت پہنچے تو انصاف کے دروازے کو بند پایا۔ خود دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ عدالت سنان پڑی تھی۔ عدالت کے ریڈر نے 3 فروری کی پیشی ڈال دی۔ میرے وکیل کے پہنچنے سے پہلے ہی کارروائی مکمل تھی اور ہم واپس جیل جانے کیلئے تیار۔ باہر نکلے تو مسلم لیگ کے بے شمار

کارکن سردی میں ٹھہرتے ہوئے سڑک پر کھڑے تھے۔ میں نے فتح کا نشان بنایا تو وہ دور تک گاڑی کیساتھ بھاگتے رہے، پولیس انہیں پیچھے دھکیلنے لگی، مگر وہ رکنے والے کہاں تھے۔ فوٹو گرافر تمام مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں بند کرتے رہے۔ ہماری گاڑی آگے نکل گئی۔ کارکن پیچھے رہ گئے۔ میں واپس اپنے بیت الحزن میں پہنچ گیا۔ پھر وہی دشت تنہائی تھا اور وہی خار مغیلاں تھے۔ ہاں یہ بات بتانا بھول ہی گیا کہ جب میں عدالت کے برآمدے میں کھڑا تھا کچھ اخبارات کے نمائندے چھپتے چھپاتے مجھ تک پہنچ گئے اور باجوڑ پر امریکی حملے کے بارے میں میرے خیالات جاننا چاہے۔ آج اخبارات میں امریکی جہازوں کی پاکستانی علاقے باجوڑ پر میزائل داغنے کی وجہ سے اٹھارہ بے گناہ افراد کی شہادت کی خبر نمایاں تھی۔ امریکیوں نے اپنے اس عمل پر نہ صرف معذرت کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اعلان کیا کہ وہ اس طرح کی مزید کارروائیاں کریں گے۔ انہوں نے یہ انکشاف کر کے حکمرانوں کے چہرے سے نقاب سُرکا دیا وہ کہہ رہے تھے اس کارروائی کی تمام تفصیلات سے پاکستانی حکام کو پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ کچھ اخبارات نے یہاں تک لکھا کہ امریکی حکام کا دعویٰ ہے کہ اس کارروائی میں پاکستانی حکام براہ راست شریک تھے۔ تصویر اتنی واضح تھی کہ اس پر مزید تبصرے کی گنجائش نہ تھی۔

میں کئی مرتبہ اس بات کو برملا لکھ چکا ہوں کہ امریکہ اس خطے میں موجود پٹرول اور گیس کے وسیع ذخائر پر اپنا کنٹرول چاہتا ہے۔ وہ مختلف جیلوں بہانوں سے خون کی ہولی کھیلتا رہتا ہے۔ تازہ ترین حکمت عملی یہ ہے کہ ایران پر حملے کی راہ ہموار کی جائے۔ اس مقصد کیلئے پاکستانی حکمرانوں کو ڈرا دھمکا کر پاکستان کی سرزمین کو اسی طرح استعمال کیا جائے جیسے افغانستان پر حملے کیلئے کیا گیا تھا۔ صدر بش کے والد اور جان کیری (JOHN KERRY) سمیت دیگر امریکی اعلیٰ قیادت کا اسلام آباد میں ایک ہی وقت جمع ہونا محض اتفاق نہیں ہے۔ پاکستانی فوجی حکمران امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں مگر ایران کے خلاف امریکی عزائم کو پورا کرنا ان کے بس میں نہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو امریکہ

نے عراق، ایران جنگ کے دوران ایران کے خلاف استعمال کرنا چاہا۔ ضیاء الحق کے انکار سے نہ صرف اُنکے اقتدار کا خاتمہ ہوا بلکہ انہیں اس دنیا سے بھی جانا پڑا۔

اگر پرویز مشرف نے ایران کے معاملے میں کوئی ایسا قدم اٹھایا تو عین ممکن ہے پاکستان کی فوج اندرونی دباؤ کا شکار ہو جائے۔ فوجی قیادت اپنی اس کمزوری کی وجہ سے امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے سے قاصر ہے۔ ورنہ ایک فون ہی کا رآمد ہو سکتا تھا۔ امریکی قیادت کو اتنا طویل سفر کر کے پاکستان آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔ امریکہ حسب توقع فوجی حکمرانوں پر دباؤ بڑھا رہا ہے۔ میں ٹیلی ویژن پر حکمرانوں کی بدحواسیاں دیکھ کر محفوظ ہوتا رہتا ہوں۔ امریکی حکمرانوں کا لہجہ تحکمانہ ہے اور ہمیں اپنی رعایا سمجھنے والے جنرل امریکیوں سے گھگھیا گھگھیا کر باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بندگلی میں پہنچ چکے ہیں جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

والسلام!

تمہارا والد!

ماریہ سے بشرنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

22 جنوری 2006ء

بشی جی !

السلام علیکم !

مجھے کچھ معلوم نہیں آج کیا لکھونگا؟ لگتا ہے میری تنہائی کے صحرا نے محفل آرائی کے ذریعے اپنے درد کی کتھا بیان کرنی ہے۔ شاید بھٹکا ہوا راہی حدی خوانی کے ذریعے قافلے والوں کو اپنے ہونے کا پتہ دے رہا ہے۔

رات کا ایک بج ہے، ہجوم یاس نے گھیرا ہوا ہے، درد کی انجمن سچ چکی ہے، احباب جمع ہیں، اہل وطن کی خوشبو چار سو رچی بسی ہے، اہل دانش نے بھی درد کی سوغات بھیجی ہے، میں نے آنکھیں بند کیں تو دل کا دریچہ وا ہو گیا۔ میں خزاں میں بہاروں کے رنگ دیکھنے اور دل کے دیرانے میں مجلس آرائی کے فن کا ماہر ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے کھیتوں سے زمین کا سینہ چیر کر سر اٹھانے والی کوئٹلیں نظر آنے لگی ہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو مجھے زمین کاشت کرنے کا شوق حد سے زیادہ ہے۔ زمین مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، مجھے اپنی آغوش میں چھپالینا چاہتی ہے۔ لیکن میں نے ابھی کئی قرض اُتارنے ہیں، میرا گوشت پوست میری ہڈیاں اسی کا رزق ہیں۔ میں اپنی ہر سانس کو اس پر نچھاور کر رہا ہوں۔ اسے ابھی مزید چند روز میرا انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے اس کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کا درد اپنا درد سمجھا ہے۔ اس درد کی چارہ گری سے جو نہی فرصت ملے گی، میں اپنی آسودگی اس کی آغوش میں تلاش کرونگا۔ ابھی کوئٹلوں نے شجر سایہ دار کا روپ دھارنا ہے اور درختوں نے برگ و بار لانا ہے۔

میں 1978ء میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقد ہونیوالی کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں ارجنٹائن (ARGENTINA) میں تھا۔ وہاں ہمارے سفارتخانے نے لاطینی

سے انگریزی میں گفتگو کیلئے ایک خاتون ماریہ ہوزے (MARIA JOSE) کو بطور مترجم رکھا ہوا تھا، وہ میری معاونت کر رہی تھی۔ سفارتخانے کے عملے نے بتایا کہ اس کا والد ارب پتی ہے اور وہ اس کی اکلوتی اولاد ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ وہ معمولی تنخواہ کیلئے اتنی محنت کیوں کر رہی ہے؟ کہنے لگی، میری والدہ بھی ارب پتی ہے، مگر مجھے والدین کی دولت سے کوئی سروکار نہیں۔ انسانیت کی سماجی ترقی میں ہر ایک نے حصہ ڈالا ہے۔ کسی نے بجلی دریافت کی، کسی نے سکولوں کا نظام بنایا، کسی نے ریل اور جہاز بنایا، کسی نے اناج کے بیجوں کو ترقی دے کر کروڑوں انسانوں کی بھوک کا مداوا کیا۔ میں سوچتی ہوں میری اپنی ایک شخصیت ہے۔ میں ساری عمر دوسروں کی محنت کا پھل کھاتی رہی ہوں۔ کوئی میری محنت کا پھل کھانیوالا ہونا چاہیے۔ اپنی محنت سے کما کر دنیا کی کسی پیداواری سرگرمی میں اضافہ کر سکوں تو مجھے احساس ہوگا کہ میں نے کچھ قرض چکا دیا ہے۔ اگر میں صرف دوسروں کی پیداواری صلاحیتوں کو اپنے والدین کی محنت کی وجہ سے استعمال میں لا کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو میرا اس دنیا میں آنا بے مقصد ہوگا۔ ماریہ ہوزے کہنے لگی، میرے والدین کی دولت اگر انسانی فلاح کے کسی ادارے کے کام آسکے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں اپنی دنیا خود پیدا کرنا چاہتی ہوں، اس مقصد کیلئے میں محنت کرتی ہوں۔ اس محنت مزدوری سے مجھے جو راحت ملتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

ماریہ ہوزے کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جب تم پیدا ہوئیں میں نے تمہارا نام ماریہ رکھ دیا۔ تمہاری ماں نے کہا تمہارا نام بشری ہونا چاہیے، بشری اچھی خبر کی بشارت لاتی ہے۔ تمہاری ذمہ داری سوا ہو گئی ہے، تم نے ماریہ کی طرح انسانیت کی خدمت کیلئے محنت کو شعار بنانا ہے اور اچھی خبر کی بشارت بھی لانی ہے۔ بس تم سے گپ شپ کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے اس موقع کو بھی نصیحت کیلئے استعمال کر لیا۔ نیند کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں اچھا خدا حافظ۔

والسلام!

تمہارا والد!

یقین زندگی کا پیغام ہے

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

23 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

کبھی سوچتا ہوں کہ میں خیال پرست ہونے کیساتھ رجعت پسند بھی ہوں۔ اسے رجعت پسندی کہیں یا ماضی پرستی، میں خود کو اپنے ماضی سے جدا کرتے ہوئے گھبرا جاتا ہوں۔ جب میرا چالان اڈیالہ جیل راولپنڈی سے بطور سزا کوٹ لکھپت جیل لایا گیا، تو ایسا لگا کہ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے، حالانکہ کوٹ لکھپت جیل میں پینتیس (35) سال سے آنا جانا ہے۔ میں نے اس جیل کے عقوبت خانوں (تصوری چکی) میں بھی شب و روز گزارے ہیں۔ بارہا درجہ سوم کا قیدی رہا ہوں۔ اس جیل کے موجودہ سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) سے تیس سال کا واسطہ ہے۔ 1976ء میں پہلی مرتبہ اُس وقت ملاقات ہوئی جب وہ اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے اور میں قیدی تھا، پھر بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ ہمارا آئنا سامنا رہا اب وہ سینئر سپرنٹنڈنٹ ہیں اور میں تیس سال بعد اسی طرح قیدی کا قیدی۔ یہاں کا دوسرا عملہ بھی کئی بار کی آمد و رفت کی وجہ سے میری عادات و اطوار سے خوب واقف ہے۔ وہ جیلر کا کردار ادا کرنے سے باز نہیں آئے اور میں بھی اپنے رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکا۔

میں بات کر رہا تھا کہ ایک سال قبل جب اس جیل میں داخل ہوا تو مجھے اڈیالہ جیل سے بچھڑنے کا غم تھا۔ میں نے وہاں چند پودے لگائے تھے۔ ٹھٹھرتی شاموں میں ان پودوں کو سینچتا، ان سے باتیں کرتا۔ میری نظریں بہار کی آمد پر لگی ہوئی تھیں۔ مارچ میں آمد بہار کا منظر سامنے تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلنا شروع ہوئی تو مجھے اٹھا کر اس جیل میں

پھینک دیا گیا۔ مجھے ساحر لودھیانوی کا ایک شعر یاد آ رہا تھا جو حسب حال تھا!

چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا

کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

میں اڈیالہ جیل سے ماٹوس ہو گیا تھا، بلی کے بچے، وہاں کے بے شمر درخت، وہاں کی بلند و بالا دیواریں، وہاں کی چار سو پھیلی ہوئی خاموشی، سب مجھے اپنی اپنی لگتی تھیں۔ میں نے اپنی کتابیں کتنی ترتیب سے رکھی تھیں۔ موتیا، گلاب اور چینیلی کے پودوں کو جب پانی دیتا تو آب رواں کی موسیقی میرے کانوں کو بھلی لگتی، ستر سالہ بوڑھا قیدی جب شدید سردی میں پودوں میں کام کرتا نظر آتا تو میں اس کیلئے چائے بنا کر لے جاتا۔ چائے کی پیالی سے نکلنے والی بھاپ زندگی کی علامت بن جاتی۔ ہر شام مشقتی دو کرسیاں اور ایک میز چھوٹے سے لان کے کونے میں رکھ دیتا، سال بعد اُس نے کہا! ایک سال ہو گیا، دوسری کرسی پر کوئی شخص آ کر نہیں بیٹھا۔ آپ روزانہ دوسری کرسی کیوں رکھواتے ہیں؟ میں نے اُسے کہا میں اکیلا چائے پی نہیں سکتا، تصور کر لیتا ہوں کہ میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ چائے پی رہا ہوں، اڈیالہ جیل کی بہت ساری باتیں مجھے یاد آتی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مجھے اڈیالہ جیل چھوڑنے کا دکھ اپنا گھر چھوڑنے سے بھی زیادہ محسوس ہوا۔ اسے میری ماضی پرستی کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

اب کوٹ لکھپت کا ویرانہ آباد نظر آتا ہے، موسم خزاں میں بھی اتنے پھول کھلے ہیں کہ بہار کا گماں ہوتا ہے۔ ریڈیو پر کوئی فیض احمد فیض کی مشہور غزل "گلوں میں رنگ بھرے" الاپ رہا تھا، نفس کو اُداسی نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، صبا اپنی بے قراری کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، گلشن کا کاروبار رُکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب موسیقی کی دُھنوں سے گذرتا ہوا مقطع میری سماعت سے ٹکرایا کہ

مقام، فیض، کوئی راہ میں چچا ہی نہیں

جو کونے یار سے نکلے تو سوائے دار چلے

تو میری نظریں سامنے والی دیوار سے جا لگیں جہاں سے موت کی وادی کا سفر شروع ہوتا ہے، پھانسی گھاٹ کو دیکھ کر سوائے دار جانے کا منظر میرے سامنے تھا۔ نہ جانے کیوں ایسا سوچتا ہوں کہ کچھ لوگوں کی زندگی کا سفر اس موت کی وادی سے گذر کر شروع ہوتا ہے۔ صبح و شام موت کے پھندے کو دیکھتے ہوئے موت کے خوف کو موت آجاتی ہے۔ جب کوئی بے خوف ہو جائے تو پھر منزلیں اس کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ میں اتنا ماضی پرست ہو گیا ہوں کہ اگر آزادی ملی تو تکلی کو اپنے سامنے نہ پا کر اسکی یاد ضرور آئیگی۔ پھر سوچتا ہوں کہ میں تو پہلے ہی بے یقینی کی سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔ جب یقین کی دولت ہاتھ آئیگی تو یہی سولی میرے لئے زندگی کا پیغام لائے گی۔ وہی قوم دنیا میں زندہ رہنے کے قابل ہے جسکے افراد یقین کی دولت سے مالا مال ہوں۔ جن کے سینوں میں عزائم بیدار ہو چکے ہوں، وہی قوموں کی امامت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ بے یقینی موت ہے اور یقین زندگی۔

ماضی سے رشتہ توڑ کر یقین کی منزل حاصل نہیں ہوتی۔ روشن خیالی کا تصور دوسروں کی تقلید سے مشروط کر دیا جائے تو یہی روشن خیالی خام خیالی بن جاتی ہے اور اگر اپنے اندر کی آگ سے خیالات کو جلا بخشی جائے تو کامیابیوں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔

تمہیں یہ وہم کیوں ہونے لگا کہ میری صحت ٹھیک نہیں، مجھے سخت سردیوں کی وجہ سے فلو ہو گیا تھا، اب بالکل تندرست ہوں، ویسے بھی غالب نے کہہ دیا ہے "بع" اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے۔ تم نے ملتانوں کے بارے میں وہ لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا کہ "فرشتے دوزخ میں ایک شخص کو کنبل اوڑھے دیکھ کر ششدر رہ گئے، انہوں نے کہا اتنی گرمی میں کنبل کی ضرورت کیوں پیش آئی تو جواب ملا کہ تمہیں معلوم نہیں میں ملتان کا رہنے والا ہوں مجھے بھی گرمی راس آئی ہوئی ہے سردی تھوڑا سا تنگ کرتی ہے" میں جب باہر ہوتا ہوں تو میڈیکل چیک اپ باقاعدگی سے کرواتا ہوں، جیل میں طبی معائنہ اسلئے نہیں کروانے دیتے کہ قیدی کو ہسپتال منتقل نہ کرنا پڑے۔ جیل سے ہسپتال منتقل ہونا ایسے ہی ہے جیسے دوزخ سے بہشت میں آجانا۔ لیکن میں نے چالیس سالہ جیل سروس کے اندر ایک رات بھی ہسپتال

میں نہیں گذاری۔ اتنا اچھا جیل ریکارڈ رکھنے کے باوجود حکام میرے اس بنیادی حق کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ میں اپنی صحت کے بارے معلومات جمع کر سکوں۔

ڈیڑھ سال کی جدوجہد کے بعد ڈاکٹروں کی رپورٹ پر عدالت نے مجھے دانتوں کے علاج کی اجازت دی۔ میرے ایک دانت کے ایکسرے کی عدالتی اجازت دوبارہ لینا پڑی۔ دوسرے عدالت نے تشبیہ کی کہ ایکسرے کرایا جائے، تین ماہ ہو گئے ہسپتال جاتا ہوں ایک آدھ گھنٹہ کے بعد واپس آ جاتا ہوں کہ جب تک حکومتی اجازت نہ ہو دوسرے دانت کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ہسپتال میں موجودگی کے باوجود اگر آنکھ چیک کرانی ہو تو یہ ممکن نہیں ہے، اسکے لئے ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھے گا اگر وہ علاج کو ضروری قرار دیں تو پھر بھی عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ عدالتی حکم پر اگر حکومت مناسب سمجھے گی تو جیل سے ہسپتال جانے کیلئے (AMBULANCE) ایسولینس مہیا کرے گی اگر دو تین مہینے ایسولینس مہیا نہ ہو تو آنکھ کا ضائع ہونا معمولی سی بات ہے، ایک سزا یافتہ قیدی کی آنکھ یا دانت اتنا اہم نہیں کہ اسکے نخرے اٹھائے جائیں، میرے دو دانت اسی طرح ضائع ہو گئے ہیں۔ ڈینٹسٹ (DENTIST) کہتا ہے شکر کریں باقی بچ گئے۔ کبھی کبھی میں اپنی اس بے بسی پر ہنستا ہوں، میرے پاس علاج کے وسائل موجود ہیں، میں اس ملک کا وزیر صحت رہا ہوں۔ ٹیلی ویژن پر اپنے شہریوں کو اپنی صحت کی حفاظت کی تلقین کرتا رہا ہوں۔ اب بھی حکومت صحت کی حفاظت کیلئے مہم چلاتی ہے لیکن اس مہم کا اطلاق مجھ پر نہیں ہو سکتا۔

میں نے اڈیالہ جیل میں بھی اور یہاں کوٹ لکھپت میں بھی چوری چھپے اپنا خون لیبارٹری (LAB) میں بھیجا دیا تھا۔ نتائج بہت اچھے ہیں۔ میرا بلڈ پریشر 80 اور 120 رہتا ہے جو آئیڈیل ہے۔ خون میں چربی کی مقدار 170 کے قریب ہے، اسی طرح گلوکوز بھی 93 سے زیادہ نہیں۔ ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیس چالیس کے اتج گروپ میں سمجھتا ہوں۔ روزانہ ایک گھنٹہ سیر کرتا ہوں، موقع ملے تو بیڈ منٹن کھیلتا ہوں۔ چاک و چوندر ہتا ہوں۔ ایک مرتبہ چمبہ ہاؤس کے ٹارچر سیل میں میں نے ایک کرنل کی بے ہودہ گفتگو کا درشتی

سے جواب دیا تو دوسرے دن اس کے ساتھی کرنل نے کہا، کہ آپ کا بلڈ پریشر ہم روزانہ چیک کرتے ہیں، جو نہایت شاندار ہے۔ اسکے باوجود آپ اتنے غصے میں کیوں آگئے تھے، کہیں آپکے خاندان میں کوئی ایسی بیماری تو نہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ "غصہ بھی انسان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے" جو اپنی عزتِ نفس کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ دوسروں کی عزت کی کیا حفاظت کریگا۔ یہی بیماری کئی صدیوں سے میرے خاندان کو بھی لگی ہوئی ہے، میری عزتِ نفس کو مجروح کیا گیا تو اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آؤنگا، یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب اسی ٹارچریل میں ایک شخص دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے فوجی حکام نے ٹارچریل میں لانے سے پہلے اور ہر مرتبہ ٹارچر کرنے کے بعد ڈاکٹری معائنہ کا بندوبست کیا ہوا تھا، میری سخت جانی میری صحت کی حفاظت کرتی ہے۔ تم زیادہ فکر نہ کرو۔

والسلام!

تمہارا والد!

احساسِ ذمہ داری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

24 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

میں زاہد شب زندہ دار نہیں ہوں، اسکے باوجود ایک بے رات تک جاگتے رہنا میرا معمول ہے۔ جیل کی راتیں لمبی ہوتی ہیں اور گونگی بھی۔ مگر اب ہم آپس میں مل کر باتیں کرتے ہیں۔ رات کا کھانا گرم کرتا ہوں چائے یا کافی بناتا ہوں، کتابوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ کبھی غم کی جوت جگا لیتا ہوں اور کبھی اپنے حال دل پر ہنستا ہوں۔ تصور کی دنیا میں چلا جاتا ہوں، اچھے خواب دیکھنے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ مجھے ڈراؤنے خواب کبھی نہیں آئے، جاگتے ہوئے بھی اور سوتے ہوئے بھی۔ میں صرف اچھے خواب ہی نہیں دیکھتا ہوں، ان خوابوں میں رنگ بھرنے کی کوشش بھی جاری رکھتا ہوں۔ جس طرح فرہاد کے عشق نے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالی تھی، میں بھی رات کے اندھیرے کو بھگانے کیلئے صبح کا انتظار کرتا ہوں، اگر چہ جانتا ہوں، یہ کام جوئے شیر لانے سے زیادہ سخت ہے۔ غالب نے کہا تھا ”صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا“۔ عشق نے اگر آداب سحر گاہی نہ سکھائے ہوتے تو میں غلامی پر رضامند ہو جاتا اور دل کی شہنشاہی کے راز مجھ پر کبھی نہ کھلتے۔

مجھے جیل میں اس لئے ڈالا گیا کہ میرا رابطہ باقی دنیا سے کاٹ دیا جائے اور میرے خطرناک خیالات کو ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے۔ میں نے منصوبہ بندی کے ذریعے حکمرانوں کی اس کوشش کو ناکام کر دیا۔ تم دیکھتی ہو میں اخبارات کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی اپنا پیغام اپنی قوم تک باقاعدگی سے پہنچاتا رہتا ہوں۔ مجھے عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے تو میں پریس کانفرنس کر کے قوم کو آنے والے حالات سے باخبر کرتا ہوں اور اپنے

موقف کا اعادہ کرتا ہوں۔ جیل کے اندر سے بھی منظم طریقے سے اپنی آواز پہنچاتا ہوں اور حکمرانوں کو بے بس کرنے کا طریقہ اپنا کر اپنی آئیوالی نسلوں کو پیغام دیتا ہوں کہ مشکل ترین حالات میں انسان کو اپنا مشن جاری رکھنا چاہئے۔ شروع میں اخبارات ایک "باغی" کے بیانات کی اشاعت سے گھبراتے تھے۔ اندر کہیں کو نے کھدرے میں ایک آدھ لائن چھاپ دیتے تھے، آہستہ آہستہ ان کا خوف ختم ہونے لگا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ایک سیاسی کلچر پیدا ہو جائے۔ یہ بات سیاسی راہنماؤں اور سیاسی کارکنوں کے جیل کے خوف کو دور کرنے کیلئے بھی ضروری تھی۔ میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک کی سیاسی قیادت سے بھی براہ راست رابطہ کے ذرائع تلاش کئے۔ اپنی پارٹی کی قیادت اور کارکنان کو ملاقاتوں اور دیگر ذرائع سے اپنی گزارشات پہنچاتا رہتا ہوں اور ان کے مشوروں سے مستفید ہوتا ہوں۔ میں منظم ہو کر جنگ لڑنے کا قائل ہوں اور جب مقاصد واضح ہوں تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ تمہیں ایک عجیب واقعہ سنا کر بات ختم کرتا ہوں۔

میں ایک دن عدالتی پیشی کے لئے جا رہا تھا۔ قیدیوں والی گاڑی میں ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی میرے ساتھ ہاتھ میں بندوق تھا۔ ہم آپس میں سیاسی حالات پر باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا اگر میں آپ کو گولی مار دوں تو مجھے کون روک سکتا ہے؟ پھر کہنے لگا! مجھ پر قتل کا مقدمہ بننے کا کوئی امکان بھی نہیں، آپ کے در ثناء کہیں گے یہ ایک معمولی سپاہی کا کام نہیں ہو سکتا، محکمہ پولیس اپنے تحفظ کیلئے کہے گا، مقتول سپاہی سے بندوق چھین رہا تھا کہ لتبسی دب گئی۔ اس نے سوالیہ انداز سے کہا پھر میں آپ کو مارتا کیوں نہیں؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ آپ کا حسن اخلاق ہے جو آپ کو مجھ پر حملہ کرنے سے روک رہا ہے۔ اُس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود ہی جواب دیا میرے پاس تو بندوق ہے ہی اندرون ملک کے غلط لوگوں کو مارنے کیلئے، فوجیوں کو تو صرف دشمن کے خلاف بندوق کے استعمال کی اجازت ہے، پھر کہنے لگا! میرے محکمہ کو معلوم ہے کہ میں یہ کام نہیں

کرونگا، اس لئے انہوں نے بندوق دے کر آپکے پاس بٹھایا ہے۔ انہیں یقین ہے مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے، پولیس کے ادنیٰ سپاہی سے تو ذمہ داری کے احساس کی توقع کی جا رہی ہے، لیکن جب ملک کا کوئی جرنیل دشمنوں کے خلاف استعمال ہونے والی بندوق اپنے وزیر اعظم کے سینے پر رکھ دیتا ہے تو کیا میں اس جرنیل سے بہتر نہیں ہوں؟ اب تم بتاؤ میں کسے بہتر سمجھوں؟ پولیس کے سپاہی کو یا اس جرنیل کو؟ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آرہی ہیں باقی باتیں پھر سہی.....

والسلام!

تمہارا والد!

اجتماعی قیادت کا تصور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

25 جنوری 2006

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

تم جانتی ہو میں اجتماعی قیادت کو مستقبل میں بنی نوع انسان کا مقدر سمجھتا ہوں۔ اب تو ابھرنے والے منظر کے خدو خال واضح ہونے لگے ہیں۔

آج کی سیاسی دنیا پر نظر ڈالیں تو نہ صرف ہر جماعت میں ایک سے زیادہ قائدین موجود ہیں، جن کی صلاحیتیں اپنی جماعت کا سرمایہ ہیں بلکہ دنیا بھر میں مخلوط حکومتوں کا رواج زور پکڑنے لگا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں کئی جماعتیں مل کر حکومت کی تشکیل کر رہی ہیں۔ یورپ کے کئی ممالک بھی اسی زد میں آچکے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی بین الاقوامی تجارتی کمپنیاں ایک دوسرے میں مدغم (Merge) ہو رہی ہیں بلکہ اب تو متحارب ملک بھی اجتماعی دفاع پر مذاکرات کر رہے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں بادشاہتیں سرنگوں ہوئیں تو رد عمل کے طور پر مضبوط شخصیات کا عمل دخل بین الاقوامی معاملات میں زیادہ ہو گیا۔ ان مضبوط شخصیات نے نظام جمہوریت کو اپنا مطمح نظر بنایا اور اس تاثر کو قائم رکھنے کے لئے پارلیمنٹ کے انتخابات بھی کرائے مگر حقیقت میں وہ جمہوری بادشاہت کے ذریعے اپنے عوام کے سروں پر مسلط ہو گئے۔ چند بڑے ممالک نے کمزور ملکوں کے عوام کے حقوق سلب کر لئے۔ یہ نا انصافیاں دوسری جنگ عظیم کا باعث بنیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی منظر پر افراد کی بجائے دھڑے بندی (BLOCKS) کا غلبہ ہو گیا۔ اس تقسیم کی وجہ سے نو آزاد ممالک میں بڑی طاقتوں نے شخصیات پر انحصار بڑھا دیا، جماعتی سیاست چند ممالک کے سوا کہیں جڑ نہ پکڑ سکی۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے طور پر ابھرا، لیکن وہاں بھی نہرو سے لے کر راہول گاندھی تک، ایک نئی موروثیت نے جنم لیا۔ جس کے اثرات بھارتی سیاست کو ابھی تک اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے دنیا کے نقشہ پر لگ بھگ ڈیڑھ سو نئے ملک معرض وجود میں آئے، ہر ایک ملک کا بابائے قوم بھی پیدا ہو گیا، چند ایک شخصیات کو چھوڑ کر ان بانیاں ملک کی حیثیت بادشاہ کے برابر ہو گئی۔ انہوں نے جماعتی سیاست کو بڑھنے سے روک دیا اور ان کی شخصیت کا سحر نو آموز قوموں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ ہر بابائے قوم سے عقیدت ایک فطری بات تھی یہ ایک ناگزیر مرحلہ تھا۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد امریکہ اور روس نے نئے استعمار کاروپ دھار لیا اور بالواسطہ حکمرانی کے لئے چھوٹے ملکوں کے آمروں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمان علاقوں میں تیل کی موجودگی نے ہر ایک بادشاہ یا آمر کو مطلق العنان بنا دیا۔ روس اور امریکہ کی سرد جنگ کی وجہ سے ترقی پذیر علاقوں کے عوام بے وقعت ہو گئے، وہاں کے وسائل پر قبضے کیلئے ہتھیاروں کی دوڑ شروع کر دی گئی۔ روس کی یلغار کو روکنے کیلئے امریکی اور یورپی اتحاد نے مسلمان حکمرانوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا۔ روس کو یورپ سے فوجیں ہٹانا پڑیں تو اس نے جنوب کی طرف دباؤ بڑھانے کیلئے افغانستان کا رخ کیا۔ روس کی پیشرفت نے مسلمان بادشاہوں کیلئے خطرے کا الارم بجادیا، پاکستان کو بھی خطرات اپنی سرحدوں پر منڈلاتے نظر آئے۔ امریکہ نے شاطرانہ طریقے سے روس کے احمقانہ اقدامات کا بھرپور جواب دینے کیلئے مسلمانوں سے اتحاد کا ڈھونگ رچایا۔ مسلمان اس جنگ کا ایندھن بن گئے۔ روس کی شکست کے بعد امریکہ اب تیل کے وسائل پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنا چاہتا ہے، وہ نہ صرف مسلمانوں کو اپنے راستے میں رکاوٹ سمجھتا ہے، بلکہ وہ یورپی ممالک کو بھی تیل کے وسائل میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ مسلمان اور یورپی ممالک کو ان حالات کا شدت سے احساس ہو چکا ہے۔ مسلمان ممالک کے حکمران اپنے عوام کے سامنے بے نقاب ہو گئے ہیں۔ دنیا بھر کے عوام امریکی مفادات کی بھینٹ چڑھنے کو تیار نہیں۔ بادشاہوں اور آمروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والی قیادت اپنا وقار کھو چکی ہے۔

نئے منظر نامہ میں اجتماعی قیادت ہی سکھ رائج الوقت کے طور پر قبول ہوگی اور زمین بادشاہوں اور آمروں سے بیزاری کا اعلانیہ اظہار کریگی۔ اسکی شروعات کا آغاز ہو گیا ہے۔ کنفیوشس نے تین ہزار سال پہلے کہہ دیا تھا! سیاسی عمل بہتے پانی کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ اسے ایک جگہ پر روکا نہیں جاسکتا۔ اب شخصیات کی گرفت جماعتوں پر ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے جو پارٹیاں ایک شخصیت کے گرد گھومتی ہیں انکا کوئی مستقبل نہیں رہا بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی اکیلی جماعت کسی ملک کے چلانے کے قابل ہی نہیں رہی۔

جب میں نواز شریف یا بینظیر صاحبہ کی قیادت کی حمایت کرتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی تنہا ملک کے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں نہیں رکھ سکے گا۔ ان کا وجود پاکستان کی سیاست کو اگلے مرحلے میں داخل کرنے کیلئے ضروری ہے۔ حالات کا جبر ان کو اجتماعی سوچ کی طرف دھکیل کر لے جائیگا۔ جو بھی زمینی حقائق سے روگردانی کریگا وہ نہ ملک کی کوئی خدمت کر سکے گا اور نہ اپنی جدوجہد کو منطقی انجام سے ہمکنار کر سکے گا۔

اپنی تفصیلی گفتگو کے بعد اب اپنی بات کو آگے بڑھانے کیلئے کرکٹ کا سہارا لیتا ہوں۔ چند روز قبل ہماری کرکٹ ٹیم کا مقابلہ ہندوستان کی ٹیم سے لاہور میں ہو رہا تھا، میں یہ میچ بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ پاکستان نے ہندوستان کے خلاف 679 کا سکور کر کے ایک ریکارڈ بنایا۔ انضمام الحق ہماری ٹیم کے رنز بنانے کی مشین سمجھے جاتے ہیں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ صرف ایک رن بنا کر آؤٹ ہو گئے اگر ٹیم ورک کی بجائے صرف ایک فرد پر انحصار کیا جاتا تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کیا ہوتا؟ اسی طرح ہمارے ایک کھلاڑی یونس خان 199 رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے، انہیں اپنی ڈبل سنچری بنانے کیلئے صرف ایک رن کا اضافہ درکار تھا۔ جب وہ آؤٹ ہو کر جا رہے تھے، انکے چہرے پر عجیب قسم کی مایوسی کا تاثر تھا، اگر ڈیڑھ سو یا اس سے کم پر آؤٹ ہوتے تو انکی یہ حالت نہ ہوتی۔ منزل کے قریب جا کر منزل کھودینا بہت

تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کامیاب سفر بھی ناکام سفر بن جاتا ہے، لیکن اگر ہمت نہ ہاں تو اگلی
کوشش میں منزل خود چل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میچ سے اجتماعی قیادت کے بارے میں
میرے خیال کو مزید تقویت ملی اور شکست کو فتح میں بدلنے کا حوصلہ بھی۔

والسلام!

تمہارا والد!

بڑے باپ کا بڑا بیٹا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

26 جنوری 2006

بشی جی !

السلام علیکم!

عوامی نیشنل پارٹی کے رہبر خان ولی خاں کی وفات کی خبر سے دل و دماغ پر گہرا اثر رہا۔ خان صاحب نے زندگی بھر جمہوریت کیلئے جدوجہد کی، اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اصولوں پر مفاہمت سے نا آشنا رہے۔ وہ تحریک آزادی کے قافلے کے رہرو تھے۔ سامراج دشمنی ان کے خون میں شامل تھی۔ وہ کہا کرتے تھے ہم تقسیم ہندوستان کے مخالف تھے اور اب پاکستان کی تقسیم کرنے والوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ان کے والد محترم خان عبدالغفار خان (باچا خان) نے قیام پاکستان کو انگریز کی سازش سمجھا مگر قیام پاکستان کے بعد اسمبلی میں پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ قائد اعظم کو سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور شاندار استقبال کا اہتمام کیا۔ یہ دورہ کیوں منسوخ ہوا؟ اس کا جواب باچا خان کے ذمے نہیں ہے۔ اس منسوخی کے منفی اثرات سے آج تک پاکستان کی سیاست باہر نہیں نکل سکی۔

خان عبدالغفار خان نے اپنی زندگی کے اٹھائیس سال ہندوستان اور پاکستان کی جیلوں میں گزارے۔ یہ مدت نیلسن منڈیلا (NELSON MANDELA) کی قید سے بھی ایک سال زیادہ ہے۔ خان ولی خان پہلی مرتبہ 1943ء میں وطن کی آزادی کیلئے جیل گئے۔ آخری مرتبہ 1977ء میں حیدرآباد کی جیل میں تھے، اس طرح چونتیس سال تک ان کا جیلوں میں آنا جانا جاری رہا۔ انکی بیگم محترمہ نسیم ولی خان نے خان صاحب کی جیل یاترا کے دنوں میں پارٹی کی راہنمائی کی۔ 1977ء کی تحریک جمہوریت میں انکی قائدانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ انہوں نے بھی قید و بند کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہ

بننے دیا۔ ان کے صاحبزادے اسفندیار ولی پاکستان کی سیاست کا معتبر نام ہیں۔ ولی خان کے بھائی عبدالغنی خان نے بھی بارہا جیل کی کال کوٹھڑی کو آباد کیا۔ 1977ء کے حیدرآباد کے جیل کے زمانے کی بات ہے۔ ہمیں میاں محمود علی قصوری صاحب نے بتایا کہ انہوں نے عدالتی پیشی کے موقع پر خان ولی خان کو کسی دستاویز پر دستخط کرنے کو کہا! ولی خان صاحب نے کاغذات کو بغور پڑھنا شروع کر دیا۔ قصوری صاحب کہتے ہیں میں نے ہنستے ہوئے ولی خان کو کہا یہ طلاق نامہ نہیں اتنے غور سے مت پڑھو۔ ولی خان صاحب سنجیدہ ہو کر کہنے لگے! قصوری صاحب اگر ہماری عورتیں طلاق کا مطالبہ کریں تو وہ حق بجانب ہونگی۔ پھر کہا جب میں پیدا ہوا میرے والد صاحب جیل میں تھے۔ میری والدہ کی خواہش تھی میرے والد ان کے پاس موجود ہوتے۔ میری والدہ اسی دوران مر گئی۔ جب ہم باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا اس وقت میری عمر ساڑھے چھ سال تھی۔ پھر خود جیل میں تھا کہ اسفندیار پیدا ہوا۔ میں نے اسے تین سال کی عمر میں دیکھا۔ اسکی ماں اسی دوران خالق حقیقی سے جا ملی۔ شکر ہے اسفندیار کی ابھی شادی نہیں ہوئی نہ گھر میں کسی کو انتظار ہے۔ ہم نے اپنی عورتوں کو سوائے تکلیفوں کے اور کچھ بھی نہیں دیا۔

باچا خان نے خدائی خدمتگار تحریک سے افغانوں کی زندگی کو سنوارنے کا کام شروع کیا۔ جہالت کے خلاف جہاد کیا اور آپس کی خونریزی کو بند کرایا۔ وہ صلح جو انسان تھے۔ آزادی انہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ خان غفار خان، ولی خان، بیگم نسیم ولی اور اسفندیار کی جدوجہد جمہوریت سے عبارت ہے۔ ان میں سے کسی نے نہ کوئی وزارت قبول کی اور نہ کوئی عہدہ۔ ایک مرتبہ مجیب الرحمن شامی اور میں شاہی باغ میں خان ولی خان سے ملاقات کیلئے گئے۔ وہ کہنے لگے ہم نے سرحد کا گورنر بھی آپکی مسلم لیگ کا مقرر کیا ہے، اس وقت ارباب سکندر خان خلیل سرحد کے گورنر تھے، وہ ساری عمر عوامی نیشنل پارٹی میں رہے ان کے والد مسلم لیگ تھے۔ ولی خان کی اس بات سے نیشنل عوامی پارٹی اور مسلم لیگ کے اختلافات کی گہرائی کا اندازہ لگانا آسان تھا۔ ایک شخص کا والد مسلم لیگ تھا، اس کا

نیپ (NAP) کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ بھی اسے مکمل خدائی خدمتگار کا درجہ نہ دے سکا۔ 1972ء میں مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ولی خان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے وہ منظر پر چھائے ہوئے تھے۔ بچے کھچے پاکستان کے دو صوبوں میں ان کی پارٹی کی حکومت تھی، جو پوزیشن آجکل مجلس عمل کی ہے اُس وقت ان کی پارٹی کی تھی۔ پاکستان کی فوج شکست خوردہ تھی۔ ملک میں آئین نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ نوے ہزار پاکستانی فوجی ہندوستان کے قبضے میں تھے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ان کیلئے الگ مشکلات پیدا کر رکھی تھیں جو بعد میں نیپ (NAP) کی حکومتوں کے خاتمے کا باعث بنیں۔ اُس وقت ولی خان نے ایک سٹیٹس مین (STATES MAN) کا کردار ادا کیا۔ صوبائی خود مختاری کی جنگ میں وہ فاتح بن کر نکلے۔ ذوالفقار علی بھٹو وحدانی طرز حکومت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ولی خان مشکلات میں گھرے رہے۔ مگر اس مشکل وقت میں پاکستان کے مفادات پر اپنے صوبوں کے مفادات کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا اور پاکستان کو مشترکہ آئین دینے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو سے زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے پاکستان کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو کا طرز حکمرانی حزب اختلاف کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ ہم سب نے ولی خان کی قیادت میں جمہوریت کی جنگ کو تیز کر دیا۔ ایک مرحلہ میں جب لسانی فسادات بھڑک اٹھے تو تمام جماعتوں کا اتحاد بنایا گیا۔ مجھے اس کا کنوینر (CONVENOR) چنا گیا۔ ولی خان نے نہ صرف اس بات کو سراہا بلکہ جمہوریت کیلئے میری قربانیوں کی شاندار الفاظ کے ذریعے تحسین کی۔

تم جانتی ہو میں اسفند یار کو کتنا پسند کرتا ہوں، لیکن یہ پسندیدگی صرف اس کی ذات کی وجہ سے نہیں۔ اس کے بزرگوں سے سیاسی اختلاف ہمارا حق ہے، بہت سارے معاملات پر ہم ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی نہیں چھپائی جاسکتی کہ قیام پاکستان سے آج تک پنجاب کا رویہ چھوٹے صوبوں کے ساتھ مثالی نہیں رہا اور جو قیادت بھی صوبائی

خود مختاری کی بات کرے اسے متنازعہ بنا کر غداری کا مرتکب قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب سے مجھے غدار بنایا گیا ہے تو بنائے گئے دوسرے غدار مجھے اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور ولی خان تو مجھے کبھی غیر لگے ہی نہیں۔ جب میں نے اسفندیار سے ولی خان کی وفات پر تعزیت کی، تو اس نے کہا تم خود جانتے ہو بابا تم سے کتنا پیار کرتے تھے۔ مجھے ان کی شفقتیں یاد آئیں تو میری آنکھیں بہنے لگیں، بیگم نسیم ولی خان نے بھی اسی بات کو دہرایا۔ مجھے ولی خان کا غم اپنی ذات کا غم لگنے لگا مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ صرف میرا ذاتی غم نہیں ہے، یہ پوری افغان قوم کا غم ہے، پاکستان کے ہر باضمیر کا غم ہے بلکہ کرہ ارض پر سانس لینے والے ہر آزادی کے متوالے کا غم ہے۔ کیا غفار خان کی زندگی کے اٹھائیس سال صرف شوق فضول میں صرف ہو گئے تھے؟ ولی خان کی جدوجہد اپنی ضد کیلئے تھی؟ اسفندیار جو صرف سو کنال زمین کا مالک ہے، معاشی مشکلات کے باوجود ضمیر کا چراغ روشن کئے ہوئے بے مقصدیت کا شکار ہے؟

میں سمجھتا ہوں تیسری دنیا کے ممالک میں اتنی درخشندہ روایات کے امین لوگ شاید کہیں ہوں۔ اب ساری ذمہ داری اسفندیار کے کندھوں پر ہے، میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

ایک مرتبہ ولی خان نے مجھے کہا تھا!

JAVED ! KEEP THE FLAG FLYING

میں نے اسے اپنے لئے بہت بڑا اعزاز جانا تھا۔ اب میں اپنی کال کوٹھری سے کہنا چاہتا ہوں۔

ASFAND YAR ! KEEP THE FLAG FLYING

جب مجھے قتل کے مقدمے میں ملوث کیا گیا تو کوٹ لکھپت جیل میں میری شناخت پریڈ ہو رہی تھی۔ 1972ء میں بیٹھا سوچ رہا تھا! میں نے یونیورسٹی کے صدارتی انتخاب میں حصہ لے کر کونسا جرم کیا ہے؟ مجھے ایسے مقدمے میں پھنسا یا گیا جس کی سزا موت ہے۔ میں

تمام عمر موت کی کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا پاکستان سے بھاگ جاؤں وطن سے محبت کے تمام دعوے کمزور پڑنے لگے، مصیبت کے ان لمحات میں میری حُب الوطنی کی سطح وہ نہیں تھی۔ اُس دن کے بعد حُب الوطنی کے بارے میں میرے خیالات میں بنیادی تبدیلی آئی، میں نے دوسروں کو سرٹیفکیٹ جاری کرنے بند کر دیئے۔

ولی خان اور اُن کے خاندان نے نصف صدی تک اہل وطن کی سنگ زنی کا سامنا کیا۔ کیا ہم اُن کی طرح کے محبت وطن ہیں؟ اِس سوال کا جواب ضرور تلاش کرنا ہوگا۔

والسلام

تمہارا باپ!

آزادی کی خوشبو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

27 جنوری 2006

بشی جی !

السلام علیکم!

آج پھر رات جاگتے گزری۔ جگراتوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔ شب انتظار، شب ہجر میں ڈھلنے لگتی ہے تو شبِ غم کی زلفیں مجھے اپنی بانہوں میں لے لیتی ہیں۔ میں صبح کے انتظار میں جاگتے رہنا چاہتا ہوں، مگر غم کی چھاؤں اتنی نشلی ہوتی ہے کہ اسی میں عافیت تلاش کرتا ہوں۔ سب سے خطرناک سفر صبحِ کاذب سے صبحِ صادق کا ہوتا ہے۔ نسیمِ سحر کی اٹھکیلیاں اہل دل کیلئے تازہ بستیاں آباد کرتی ہیں اور ہم نیند کے ماتوں کو منزل سے بھٹکا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی صبحیں بے نور ہو جاتی ہیں اور شامیں شامِ غریباں میں ڈھل جاتی ہیں۔ دل کا درد سوا ہو جاتا ہے، آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کے اظہار کیلئے قرطاس اور قلم کا سہارا لے لیتا ہوں اور درد کی انجمن سجالیتا ہوں۔

آج کل مجھے جیل کی ہر صبح، صبحِ بنارس لگتی ہے۔ تیلیوں کے پرتوس و قزح کے رنگوں کی طرح حسین ہیں۔ کل سارا دن جس تتلی کے حسن نے مسحور کیے رکھا آج وہ اس زمین پر گری پڑی تھی۔ چیونٹیاں اس کے خوبصورت پروں کو پیٹ کا ایندھن بناتی رہیں۔ ایک کی موت دوسرے کیلئے سامانِ زیست تھا۔ میں افسردہ ہو گیا۔ میں نے گزرے ہوئے کل پر نظر دوڑائی، تتلی کا حسن ابھی زندہ تھا۔ میرے ذہن کے کمپیوٹر نے اسے اپنے اندر ریکارڈ کر لیا تھا۔ ایک اور سوال ابھرا؟ جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا تو کیا تتلی کا یہ حسن بھی میرے ساتھ رزقِ خاک ہو جائیگا یا دوبارہ لالہ و گل کی صورت میں کل کی تیلیوں کا محور ہوگا۔ میں آواگان میں یقین نہیں رکھتا، مگر کل میں جُور اور جُز میں گل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔

حُسنِ ازل ہی حُسنِ حقیقی ہے۔ مجھے تیلیوں، پھولوں اور رنگوں سے ابدی حقیقتوں کا ادراک ہوتا ہے اور ندیم دوست سے بوائے دوست آتی ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے، حُسنِ ازل نے دنیا کے حسن کو اپنے اندر جذب کر لینا ہے نقارہ بجنا ہے.....

کل من علیہا فان وما یبقی و جہ ربّ الا کرام

(ترجمہ)

پھولوں کی کیاریوں کے اندر چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر مجھے ابھی آزادی کا مژدہ سنایا جائے تو ان پھولوں کا حسن اور خوشبو میرے لئے بے وقعت ہو جائیگی۔ جب میں ٹہل رہا تھا میری نگرانی کرنے والا سپاہی میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے کہا، وہ بلا اجازت اندر کیوں گیا۔ اُس نے کہا، میں دیکھنا چاہتا ہوں آپ کو کیا کیا سہولیات دی جا رہی ہیں؟ میں نے باہر سے کنڈی لگا دی اور اسے کہا کہ میں ڈیوڑھی تک جا رہا ہوں، ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤ نگا، وہ پریشان ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا، تم آرام سے ان سہولتوں سے استفادہ کرو جو مجھے حاصل ہیں۔ وہ گڑگڑانے لگا کہ خدا کیلئے دروازہ کھول دیجئے۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں نے اُسے باہر نکالا تو سردی کے باوجود اُس کی پیشانی پسینہ سے شرابور تھی۔ وہ روزانہ دوسروں کو تالہ بند کرتا تھا۔ اُس نے جیل کے اس کمرے میں بند رہنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

آزادی کی خوشبو پھولوں کی خوشبو سے بھی زیادہ معطر ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی اور بلی سے لے کر شیر کوئی بھی اپنی آزادی کی جدوجہد سے غافل نہیں رہتے۔ وہ ایک پر دوسرے کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کسی پرندے کو پکڑنے کی کوشش کریں تو وہ بھی ٹھونگے مارنا شروع کر دیگا۔

انسان نے دوسروں کی آزادی سلب کرنے کے کئی طریقے ایجاد کئے ہیں۔ وہ زیر دستوں کو اسی طرح پنجروں میں بند کرنا چاہتا ہے، جس طرح جانوروں اور پرندوں کو کرتا ہے۔ انسان کو غلام بنانے کی خواہش ہر دور میں موجود رہی ہے۔ بس انداز بدلتے رہے۔ مگر

میں کیا کروں میں ابنِ آدم ہوں۔ میرے جدِ اول نے حسن ازل کی قربتوں میں فردوس بریں کے حسن اور اسکی لطافتوں پر آزادی کو ترجیح دی تھی۔

میں نے مالی کو گلدستہ کیلئے پھول توڑنے سے منع کیا تو وہ کہنے لگا، میں پھولوں کو سینچتے ہوئے روز ارادہ کرتا تھا کہ جب کلیاں نکلیں گی، میں انہیں گلدستہ کی صورت میں آپ کو پیش کرونگا، میری اس چھوٹی سی خوشی کو پورا ہونے دیں۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ گلدستہ میرے لئے مخصوص ہو جائے گا، جبکہ آزاد فضا کے پھول ہم سب کی آنکھوں کی طراوت ہیں، مگر اُس نے ضد کر کے گلدستہ بنایا۔ پھولوں کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج نے پھولوں کے حسن کو دو بالا کر دیا۔ میں اسے پھول کی خوبصورتی کہوں یا انسان کے ذہن کی، میں انسانوں کو اشرف المخلوقات بنانے والے کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

آزادی کی خوشبو سب خوشبوؤں سے بہتر ہے۔ خدا نے پابندیاں لگا کر آزادی کی نعمت کا احساس دلایا، اور بد صورتی پیدا کر کے حُسن کا۔ درحقیقت حسن اور آزادی خدائی وصف ہیں۔ خدا نے انسان کو دنیا پر اسی لئے بھیجا ہے کہ وہ حسن اخلاق سے احترام آدمیت کا سبق پڑھے، اور آزادی سے معراج انسانیت کا.....

دیکھیں قطرہ گہر بنتا ہے یا سورج کی تمازت سے ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، کسی اور سمندر سے کسی اور خطے میں کسی اور موسم میں ابر کرم بن کر برستا ہے یا سیلاب بن کر کسی کو ڈبو دیتا ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

زمینی حقائق

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

12 جنوری 2006

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میں بکائن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے رنگوں سے محظوظ ہو رہا ہوں۔
 بکائن کے درخت کی شاخیں بے لباس ہیں۔ سبزے کا نام و نشان نہیں رہا، پتوں کی جگہ خاکی
 رنگ کے دانوں نے لے لی ہے۔ ہر شاخ بار آور ہے۔ اُس پر پکا ہوائیج ایسے لگتا ہے جیسے
 کسی نے خشک شاخوں میں موتی پرو دیئے ہوں۔ گرمیوں میں یہ درخت پھیل جاتا ہے۔
 سورج کی جلتی کرنوں کی حدت اپنے اندر جذب کر کے ہمیں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ سردیوں
 میں سکڑ کر سورج کی کرنوں کو ہم تک پہنچنے کیلئے راستہ دیتا ہے۔ شاید ذات کی نفی کے فلسفے پر
 یقین رکھتا ہے۔

کیڑے مکوڑوں، تلیوں، پرندوں، گلہریوں نے اپنی الگ دنیا آباد کر رکھی ہے۔
 گلہریاں سب سے زیادہ شرارتیں کرتی ہیں، وہ اپنی آواز سے بلیوں کو اپنی طرف متوجہ
 کر کے درختوں سے اتر کر ان کے قریب آ جاتی ہیں۔ بلیوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ شکار ان
 کی زد میں ہے۔ گلہری تیزی سے درخت کی طرف دوڑنا شروع کر دیتی ہے، بلی پیچھا کرتی
 ہے، گلہری درخت کی چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔ بلی بھی اپنی تمام قوت جمع کر کے چوٹی پر پہنچتی
 ہے تو گلہری ساتھ والے درخت پر چھلانگ لگا دیتی ہے۔ بلی کھیانی ہو کر واپس آ جاتی ہے تو
 اسکی یہ دوست اسے زنج کرنے کیلئے پھر آمو جو د ہوتی ہے۔ بلی اور چوہے کا کھیل تو
 مشہور ہے مگر بلی اور گلہری کا کھیل اُس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ میں گلہری کی آنیاں
 جانیاں دیکھتا رہتا ہوں۔ ہمارے حکمرانوں کی آنیاں بھی کم دلچسپ نہیں۔ دیکھتے ہیں کہ

کب تک وہ بلی کی دسترس سے بچے رہتے ہیں۔

جب کوؤں کا غول بلی پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ منظر بھی قابل دید ہوتا ہے۔ کوؤں کی اجتماعیت اُن کے پروں میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ بلی خوفزدہ ہو کر جائے پناہ کی تلاش میں بھاگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے خود کو محفوظ کر لیتا ہے لیکن کو اپنی کالی کالی وردی سے بلی کو ڈراتا ہے۔ وردی سے ڈرانے کا وصف انسانوں میں بہت ہے اور بھیگی بلی بننے کا ذوق بھی۔

نباتات، حشرات الارض، انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کا مطالعہ جتنا قریب سے جیل میں کیا جاسکتا ہے، باہر رہ کر شاید ممکن نہ ہو۔ میں نے مکوڑوں کی زندگی سمجھنے کیلئے کئی دن صرف کئے۔ وہ ایک قطار میں اپنے بل سے نکل کر اناج کی تلاش میں چل پڑے، واپسی پر ایک کمزور مکوڑے سے اناج کا بڑا دانہ گر گیا، اس دانے کا حجم مکوڑے کے وجود سے بھی بڑا تھا۔ دوسرے مکوڑے اپنی قطار میں چلتے رہے کسی نے اس کی مدد کرنے کیلئے قطار نہیں توڑی۔ بل کے اندر سے ایک اور مکوڑا نکلا، وہ اناج کے ڈھیر کی طرف جانے کی بجائے اُس مکوڑے کے پاس آ کر رُک گیا۔ دونوں نے فارمیشن بنائی، ایک دانے کو دھکیلنے لگا اور دوسرا بل کی طرف کھینچنے لگا، اس دوران اناج کی طرف جانے والے کسی مکوڑے نے اپنی قطار سے نکل کر اُن کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ایک دو مکوڑے قطار کے آگے پیچھے پھر رہے تھے، وہ اناج کی بوسونگھ کر چھوڑ دیتے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ پورے کام کی نگرانی کر رہے تھے یا بل کے اندر پیغام رسانی ان کے ذمہ تھی۔ میں نے ایک بڑے مکوڑے کو دیکھا جو شاید مادہ تھی کیونکہ دو چھوٹے مکوڑے اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، وہ اتنے چھوٹے تھے کہ اس کے بچے لگتے تھے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ بچے تھک جاتے مگر ماں اپنا سفر جاری رکھتی، فاصلہ بڑھنے لگا تو میں سمجھا کہ اب ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے، اُس وقت حیرت زدہ رہ گیا، جب وہ بچے بہت دُور جا کر پلٹے تو تیز رفتاری سے اُن راستوں پر چلتے ہوئے، جن پر اُن کی ماں چل رہی تھی، ماں تک پہنچ گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ماں کے جسم سے

نکلنے والی خوشبو انھیں ماں تک پہنچنے کیلئے راہنمائی کرتی ہے۔ یہ خوشبو ہی مانتا ہے۔ انار کے پیڑ پر شہد کی مکھیوں کا نظم و ضبط دیکھنے کے قابل ہے۔ جتنا مشاہدہ کریں، جہان حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔

بلی کو اپنے ہاتھ سے گوشت کھلاتا ہوں۔ میں نے اسے پلیٹ میں کھانے کی تربیت دی، وہ برتنوں میں منہ ڈالتی ہے، نہ کچن میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے غسل خانے کے آداب دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ وہ ضروریات سے فارغ ہونے کیلئے کوئی نہ کوئی کونہ تلاش کرتی ہے، پنجوں سے زمین کو کھود کر رفع حاجت کرتی ہے، پھر اُس پر مٹی ڈال کر سونگھتی ہے، اگر وہ مطمئن نہ ہو تو مزید مٹی ڈالتی ہے۔ اگر میں سختی سے پیش آؤں تو میرے ہاتھ سے گوشت کھانا چھوڑ دیتی ہے۔ دُور جا کر بیٹھ جاتی ہے، کسی ملازم کے پاس جا کر میاؤں میاؤں کرتی ہے تاکہ بھوک مٹا سکے، میں اسے پچکا کرتا ہوں، پیار کرتا ہوں پھر کہیں جا کر میرے ہاتھ سے کھانا کھانے کیلئے تیار ہوتی ہے، وہ بھوک رہ سکتی ہے مگر اپنی انا کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔

نباتات کے رویے اُن کی بڑھوتری سے ظاہر ہوتے ہیں۔ گلے کے پودے کو زمین میں منتقل کیا جائے تو اس کی خوشنمائی بڑھ جاتی ہے، نامیاتی کھادوں اور پانی کا وقت پر ملنا، موسموں کا تغیر و تبدل ان پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔

ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا تمام علم اکتسابی ہے۔ جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں انکی بنیاد انسان کے مشاہدات پر مبنی ہے۔ آج کی بہت ساری حقیقتیں اُدھوری ہیں۔ ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ آج نئی کہکشاں دریافت ہو گئی ہے، آج زمین کے اندر مادے کی کیفیات پر نئی تحقیق سامنے آ گئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی علم ابھی کامل نہیں ہے۔ انسان حیوان ناطق ہے۔ باقی تمام مخلوق کے خصائص ان کی عادات و اطوار کے بارے میں حقیقت پر مبنی رائے قائم کی جاسکتی مگر انسان کس حالت میں کیا طرز عمل اختیار کریگا، اسکے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ انسان کو قواعد، اصول و ضوابط کا پابند کرنا

ایک معاشرتی تقاضا ہے۔ آج تک دنیا میں کسی حیوان نے اپنی نسل کے اتنے حیوان نہیں مارے ہونگے جتنے انسان نے دوسرے انسان مارے ہیں۔ ایک ہی نسل کے حیوان ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور اس میں کوئی ایک آدھ حیوان دوسرے حیوان کے ہاتھوں مارا بھی جاتا ہے مگر انسان نے دوسرے انسانوں کو مارنے کیلئے شروع سے ہی مہلک ہتھیاروں کا سہارا لیا ہے۔ تہذیبیں جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اتنی ہی وحشی ہوتی جاتی ہیں۔ ترقی کا مطلب، آخر کار، مہلک ترین جدید ہتھیاروں کی تخلیق بن جاتا ہے۔ دوسرے انسان پر بالادستی کی خواہش جنون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کئی تہذیبیں بالادستی کے جذبے کی تسکین کیلئے خود کو مٹا بیٹھیں۔

جب تک انسان برابری کی سطح پر ایک دوسرے کو برداشت کرنا نہیں سیکھے گا جیل کی بلی، گملے کے پودے، ریگنے والے کیڑے مکوڑے اور بکائن کے درخت، اس سے کہیں بہتر ہونگے۔ انسان کی اپنے بنائے ہوئے آئین کی پابندی کرنا ہوگی، یہی چیز اسے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے بعد ہی اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے۔ ورنہ وجود میں پہاڑ، درخت، ہاتھی، کہکشاں، دریا اور سمندر اس سے کہیں بڑے ہیں اور طاقتور بھی۔ وہ تمام اپنے محور کے اندر رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے آج تک کوئی اصول نہیں توڑا۔ انسان، جسے شعور عطا کیا گیا ہے، مشاہدے کی طاقت رکھتا ہے، وہ چار سو پھیلی ہوئی حقیقتوں سے انحراف کرتا رہتا ہے۔ تم بھی زمینی حقائق کے مشاہدے کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنا لو تو رویوں میں توازن برقرار رکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

والسلام!

تمہارا والد!

دل دریا سمندروں ڈونگے

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

13 جنوری 2006ء

بشی جی!

السلام علیکم!

آج رات چودھویں کا چاند نور کی کرنیں بکھیرتا رہا۔ میں ساری رات نہیں سویا، اپنے سیل کی جالیوں سے ٹھٹھرتی ہوئی چاندنی کے حسن سے اپنی آنکھوں کو مزید ٹھنڈا کرتا رہا۔ چاند نے "سمندروں ڈونگے دل میں" جذبات کا طلاطم برپا کر دیا۔ گذشتہ چالیس برسوں کا بیتا ہوا ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہڈیوں میں اتر جانے والی جیل کی پہلی سردی مجھے آج تک نہیں بھولی، زندگی کی کئی چاندنی راتیں اسی طرح گذر گئیں۔ جب میں بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کر رہا تھا تو مجھے ایک لمحے کیلئے تاسف کا سامنا نہیں تھا۔ مجموعی طور پر میری زندگی ایک خیال پرست کے طور پر گزری اور آج بھی یہ احساس شدت کے ساتھ جاگزیں ہے، کہ انسانیت کی بالادستی کا جو تصور اسلام نے دیا اُس کو عملی زندگی کا حصہ بنانے کا وقت آن پہنچا ہے۔

صبح ہوئی تو میرے سیل کا تالہ کھولا گیا۔ میں پھولوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شبنمی ماحول میں چاند کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ شبنم کے قطروں میں آزادی کا عکس نمایاں تھا۔ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سرخ گولے نے سورج کا روپ دھار لیا، اُس کی نوزائیدہ کرنیں صبح نو کا پیغام پہنچانے کیلئے آگے بڑھیں، بادلوں نے ان کا راستہ روکا تو پرندوں کی آوازیں زندگی کا پیغام بن گئیں، کائنات جاگ اُٹھی، کاروبار زندگی شروع ہو گیا، دودھ والا پہلے آیا پھر انڈے اور مرغی کے گوشت والا ملازم پہنچ گیا۔ ہمارے پاس انڈے پہلے آئے ہیں پھر مرغی! سنا ہے کہ آزاد دنیا میں یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا کہ پہلے انڈا آیا تھا یا مرغی؟

تمہارا والد!

والسلام

پردہِ غیب سے باہر
بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

یکم فروری 2006

بُشی جی !

السلام علیکم !

آج ملاقات کیلئے آنے والوں کی فہرست بہت طویل تھی، اس میں سیاسی کارکن بھی تھے اور دانشور بھی..... کراچی سے لے کر پشاور تک ملک کے طول و عرض سے آنے والوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ملکی اور بین الاقوامی صورتحال پر بہت سنجیدہ تبصرہ ہوا، پاکستان اور ہندوستان کی ترقی کا موضوع دیر تک زیر بحث آیا، میں نے دوستوں سے کہا کہ اس خطے میں دو عظیم ملک چین اور ہندوستان تقریباً ایک ہی وقت میں آزاد ہوئے۔ یہ بات دُرست ہے کہ چین، تائیوان اور پاکستان، ہندوستان کی تقسیم سے آپس میں کشیدگی بڑھ گئی جس کی وجہ سے معاشی حالات میں ابتری لازم تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو چین ایک کامیاب معاشی حالات کی تصویر پیش کرتا ہے بلکہ اس کی معاشی ترقی نے امریکہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی معیشت کو بھی متاثر کیا ہے۔ دفاعی طور پر وہ کہیں آگے ہے اور دنیا کی قوموں میں اس کے اثر و رسوخ میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ چین اور بھارت کی آبادی تقریباً برابر ہے، قدرتی وسائل بھی ایک جیسے ہیں۔ دونوں کو تقسیم کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر بھارت ترقی کے باوجود ابھی تک پسماندہ ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے، اسکی کیا وجہ ہے؟ اسکا جواب تو ہندوستانی قیادت ہی دے سکتی ہے مگر زمینی حقائق یہی ہیں کہ تقسیم کے وقت پاکستان کے حصے میں پسماندہ علاقے آئے، ان علاقوں میں تقسیم سے پہلے ہندو اور سکھ معاشی طور پر بالادست تھے۔

پشاور سے لاہور، لاہور سے ملتان اور وہاں سے کراچی تک شہروں میں ہندو تمام

کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ تعلیم میں بھی ہندو سے کہیں آگے تھے۔ چھوٹے قبضوں سے لے کر بڑے شہروں تک منڈیوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمان خال خال نظر آتا تھا جس سے مسلمانوں کی معاشی ابتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کی مجموعی حالت کیا ہوگی؟ وہاں پر تو سماجی طور پر بھی انھیں ہندوؤں کی بالادستی قبول کرنا پڑتی تھی۔

شروع دن سے پاکستان کا ہندوستان سے معیشت کے میدان میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ہندوستان کو بنا بنایا دارالحکومت مل گیا۔ انتظامی ڈھانچہ بھی موجود تھا، ہندوستان کو ایک ہزار سال بعد غیر قوموں سے نجات ملی تھی۔ انہوں نے جمہوریت اور آزادی کو لازم و ملزوم قرار دیدیا۔ جبکہ پاکستان کو نئے تجربات سے گذرنا پڑا، جس کی وجہ سے ملک دو لخت ہو گیا۔ بھارت کو ایسے صدمات کا سامنا نہیں تھا۔ ہندو معاشرے کے مزاج میں راجکماروں کو قبول کرنا آسان بات ہے۔ اس لئے ابھی تک ایک ہی خاندان کی پانچویں نسل ان پر حکمرانی کر رہی ہے۔ بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اعزاز حاصل ہے۔ پاکستان میں ہندوؤں کے زور پر حکومت کی جارہی ہے۔ عوام ہر آمر سے ٹکرا جاتے ہیں، کیونکہ ان کا مزاج جمہوری ہے۔ ہندوستان کا دعویٰ سیکولر ازم کا ہے، لیکن وہاں ووٹ کے ذریعے ہندو ازم کی حکومت بنتی ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے مگر یہاں پر عوام نے آج تک مذہبی قوتوں کو حکمرانی کا حق نہیں دیا۔ اب کچھ صوبوں میں مذہبی قوتیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ میرے خیال میں ہندو معاشرے کے مقابلے میں پاکستانی معاشرہ زیادہ لبرل رویوں کا اظہار کرتا ہے۔ تقسیم سے پہلے زیادہ تر ہندو مسلم فسادات ان علاقوں میں ہوئے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ بہار، بنگال اور گجرات میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر رکھی تھی اور یہ سلسلہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں فسادات میں کبھی پہل نہیں کی گئی۔ سرحد، پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال میں ہندو پُرامن ماحول میں رہ رہے تھے۔ ان علاقوں کی معیشت اور معاشرت پر

ہندوؤں کو کسی تعصب کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

تقسیم کے بعد بھی کانگریسی حکمران دور بینی کی صلاحیت سے محروم رہے۔ انہوں نے پاکستان کے حصے کے فنڈز دینے سے انکار کر دیا، جس کیلئے مہاتما گاندھی کو مرن بھرت (بھوک ہڑتال) رکھنا پڑا۔ ہندوستان نے بین الاقوامی سیاست میں روسی بلاک میں جانا پسند کیا اور علاقائی سیاست میں اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کو دباننا شروع کر دیا۔ حیدرآباد، سکم، بھوٹان، نیپال، برما، سری لنکا اور اب بنگلہ دیش اور اپنے عظیم ہمسایہ ملک چین سے بھارت کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ خاص طور پر چھوٹی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھارت کی مداخلت معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ بھارت نے علاقے کا چوہدری بننے کا خواب دیکھا، مگر اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے جو رویہ اپنایا اس کی وجہ سے علاقائی کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا، اسی وجہ سے جنوبی ایشیاء پسماندگی میں غرق ہو گیا۔ اس وقت ہندوستان، پاکستان، افغانستان، نیپال، بھوٹان، دنیا کے کم تعلیم یافتہ علاقے ہیں، بیماریوں کے علاج کیلئے افریقی ممالک کی پوزیشن ہم سے بہتر ہو گئی ہے۔

اگر ہندوستان مثبت رویہ اختیار کرتا تو نہ پاکستان امریکہ کا دست نگر ہوتا اور نہ دوسرے چھوٹے ممالک بھارت کے خوف کی وجہ سے بین الاقوامی قوتوں کو اپنے معاملات میں دخل ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ ہم چند ساتھی پاکستان کے سابق صدر اور بزرگ راہنما نور الامین سے ملنے گئے۔ وہ کہنے لگے! جب ہم پاکستان بنا رہے تھے تو ہمیں بھارت دشمنی کا اندازہ نہیں تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم باہمی تعاون اور احترام کے ساتھ ایک دوسرے کا وجود تسلیم کر لیں گے اور بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات مثالی ہوں گے۔ بھارت نے اپنے رویے سے پورے خطے کیلئے جو خطرات پیدا کیے، ہمیں اس کا اندازہ ہوتا تو ہم پاکستان بنانے سے پہلے سو بار سوچتے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہندوستان کا رویہ مثبت ہوتا تو افغانستان، ایران، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، شام، اردن، کویت، بلکہ پورا مغربی ایشیاء تیل کے وسائل کی اہمیت کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی اور معاشی برتری کا باعث بنتا۔ مگر ہندوستان

کی قیادت اتنی اہم ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ آج بھی اس کا طرز عمل نہایت منفی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کا حجم اور ہندوستانی قوم کی صلاحیتیں اسے دنیا کی اہم ترین قوموں میں شمار کرانے کیلئے کافی ہیں۔ وہاں کی قیادت آج کے دور کے چیلنجز کا سامنا کرنے کی بجائے ہمسایہ ممالک کو غیر مستحکم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ یہ عدم استحکام خود ہندوستان کے وجود کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔ آج جب دنیا میں وسائل پر قبضے کی جنگ شدید ہو گئی ہے۔ بھارت نے اپنا وزن قبضہ گروپ کے پلڑے میں ڈال دیا ہے۔ آخر کار اسے چین، عرب دنیا، جنوبی یورپ، جنوبی ایشیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ کا ساتھ دینا ہوگا۔ اگر اس نے اپنے آپ کو تنہا کر لیا تو پھر ایک ہزار سال پیچھے چلا جائے گا۔ یہ ہندوستان کے عوام کی بہت بڑی بد قسمتی ہوگی اور آنے والی صدیاں آج کے غلط فیصلوں کا خمیازہ بھگتیں گی۔ پاکستان کے حکمرانوں کی سوچ بھی بھارت سے ملتی جلتی ہے، وہ اعلان یہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی طاقتوں کا ساتھ نہ دیتے تو ہمیں تباہ کر دیا جاتا۔ گویا وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی پالیسیاں پاکستان کے حق میں نہیں بلکہ مجبوراً انہیں یہ پالیسی اختیار کرنا پڑی ہے۔ تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے پر پاکستان کے عوام کی سوچ نئے سامراج کے خلاف ہے۔ اس قوم کا یہی اثنا ہے آنے والے وقت میں اس کے کام آئے گا۔

میں ملاقات سے واپس آ کر بھی اس بات پر سوچ بچار کرتا رہا کہ ہندوستان، جمہوریت کے باوجود، ایسی قیادت کیوں پیدا نہیں کر سکا، جو اتنی بڑی طاقت کو اس کے شایان شان مقام دلا سکے۔ ہندوستان معاشی اور دفاعی طور پر اتنا مضبوط ضرور ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے ارد گرد کے ملکوں میں انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ وہ چھوٹے ملکوں کی معیشت کیلئے مسائل بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس سوچ سے ہندوستان کی انا کی تسکین تو ہو سکتی ہے لیکن پورے علاقہ کے انتشار سے ہندوستان خود محفوظ نہیں رہے گا۔ اسے تمام ہمسایوں سے برابری کی سطح پر تعلقات بڑھانا چاہیے اسلحہ جمع کرنے سے ہندوستان مستحکم نہیں ہو سکتا، اسلحہ روس سے زیادہ

کسی کے پاس نہیں ہو سکتا۔

میں نے تمہیں 25 جنوری کے خط میں لکھا تھا کہ اجتماعی قیادت سے اجتماعی ذمہ داری کا تصور جنم لیتا ہے۔ اس کیلئے میں نے اس دن کے ہندوستان اور پاکستان کے کھیل کے مختلف پہلو تمہارے سامنے رکھے تھے، میں نے کہا تھا اگر ہمت نہ ہا رہیں تو اگلی کوشش میں منزل خود چل کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کراچی میں اسی یونس خان کو بہترین کھلاڑی کے اعزاز سے نوازا گیا، انضمام الحق کی کمر تکلیف کی وجہ سے آج کپتانی بھی وہ کر رہا تھا، 25 جنوری کو جو شخص منہ لٹکائے ہوئے مایوس کی تصویر بنا ہوا تھا آج مرد میدان تھا۔ انسان کو کبھی بھی حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ میرا ایمان ہے کہ نظام قدرت ہر قدم انسان کی مدد کیلئے پردہ غیب سے باہر آ کر اسکی مدد کرتا ہے۔ سب سے پہلے انسان کو خود منزل کی طرف بڑھنا پڑتا ہے اور اگر جرات رندانہ نہ ہو تو منزل پر پہنچ کر بھی منزل گم ہو جاتی ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

تاریخ کا پنڈولم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

4 فروری 2006ء

بُشی جی !

اسلام علیکم! مزاج بخیر!

آجکل دو واقعات نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہے۔ ایک ایران کی جوہری قوت کے بارے میں ہے اور دوسری توہین رسالت کے بارے میں۔ ڈنمارک اور دیگر مغربی ممالک کے اخبارات میں اہانت آمیز کارٹون چھپا ہے۔ جس میں حضرت محمد ﷺ کی شان میں نعوذ باللہ توہین کی گئی ہے۔

حالات کا رخ بتا رہا ہے کہ یہی واقعات آنے والے کئی سو سال کا ایجنڈا طے کر دیں گے۔ دنیا کی معلوم تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ معاشی بالادستی کا توازن (PENDULUM) پنڈولم کی طرح ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف حرکت کرتا رہا ہے، کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف۔ ایک اور حقیقت جس کا اعتراف کر لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ بالادست اقوام کے باہمی ٹکراؤ نے بھی کمزور قوموں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے میں بنیادی عامل کا کردار ادا کیا، دنیا پر کسی ایک قوت کی بالادستی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔

یہ حقیقت بھی اب اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ وسائل پر قبضے کی خواہش نے امریکہ کیلئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ شروع ہو چکی ہے اور یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے، یورپ اب ڈالر کیلئے چیلنج بنتا جا رہا ہے۔ عالمی منڈیوں پر قبضے کی خواہش سے مفادات کا ٹکراؤ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جو ممالک یورپ اور امریکہ کی اشیاء خریدتے تھے، ان کی تعداد میں واضح کمی آگئی

ہے۔ تیل کے ذخائر رکھنے والے اکثر ممالک غربت اور پسماندگی کے دور سے گذر رہے ہیں۔ وہاں کے عوام اپنے حکمرانوں کی پُر تعیش زندگی کو امریکی اور یورپی ممالک کی سازش سمجھتے ہیں اور ان اقوام کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کی اقوام کو اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھا کر بالادست اقوام کی بلیک میلنگ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ چین کی معاشی ترقی نے انہیں اس بات کا حوصلہ دلادیا ہے کہ اگر امریکہ اور مغربی ممالک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا جائے تو متبادل اشیاء کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ جان گئے ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک مہلک ہتھیاروں کی فروخت سے ان کو ہر حالت میں پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تم صرف اپنے گاؤں کی معیشت پر غور کرو، جہاں دو ہزار سے زیادہ افراد اپنے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ سردیوں کی ٹھہرتی راتوں میں کھیتوں کو پانی دیتے ہیں، اور گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ہل چلاتے ہیں، انکا بال بال زرعی بنک کے قرضے میں جکڑا ہوا ہے، اپنے بچوں کی فیس ادا نہیں کر سکتے۔ علاج کا تو تصور بھی محال ہے، ان کی عورتیں اور بچے کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں۔ اس محنت سے امریکہ اور یورپ کی فیکٹری میں بننے والے ایک ٹینک کی قیمت ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مغربی ممالک کا کاکا کولا کو بھی ٹیکنالوجی کے طور پر فروخت ہوتا ہے۔

جنہیں ہم غریب یا پسماندہ ممالک کہتے ہیں، ان کے پاس دنیا کے قدرتی وسائل کا ستر فیصد سے زیادہ حصہ پایا جاتا ہے۔ یورپ کی ایجادات اور امریکی بالادستی نے انہیں خود انحصاری سے کوسوں دُور کر دیا تھا، اب یہ قومیں نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہیں، ان پر بند دروازے کھل چکے ہیں۔ مغربی ممالک کیلئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکیں۔ وہ اب بھی قدغنون اور پابندیوں کے ذریعے ان اقوام کے وسائل کو اپنی مٹھی میں لینا چاہتے ہیں۔ اب بھارت، چین، برازیل، بلکہ ایشیاء، افریقہ، اور لاطینی امریکہ کی ترقی سے تیل پیدا کرنے والے ممالک کو صارف دستیاب ہیں۔ یہ ممالک ایک دوسرے کی ضرورت

بن گئے تو امریکہ اور مغربی ممالک کا مہنگا طرز زندگی خود ان کی معاشی موت کا سبب بن جائیگا اور مصنوعی نظام دھڑام سے آئیچے گرے گا، امریکہ کی زراعت بھی اس مہنگی معیشت کا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔

وسائل کی نامنصفانہ تقسیم اور عالمی سطح کے غلط فیصلوں نے ترقی پذیر قوموں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اگر اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کو قبول کر لیا گیا ہے تو ایران اور پاکستان پر اعتراض کیوں ہے؟ اگر امریکہ کو اپنے وسائل پر اختیار حاصل ہے تو وینزویلا، نائیجیریا، سعودی عرب، افغانستان، ایران، اور عراق کو یہ اختیار کیوں حاصل نہیں؟ یہ سادہ سوالات ہیں جن کا جواب امریکہ اور مغربی قومیں دینا نہیں چاہتیں۔

امریکہ اور مغربی اقوام نے حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے اسے عقائد کی جنگ بنا دیا ہے، کبھی وہ انہیں صلیبی جنگوں کا نام دیتے ہیں، کبھی تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نام دیتے ہیں، کبھی ہمارے طرز بود و باش کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، کبھی اسلام کو دہشت گرد مذہب ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور اب براہ راست رسالت ماب ﷺ کی زندگی کو نعوذ باللہ دہشت گردی کی علامت بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ ان کی ذہنی پسماندگی کی واضح علامات ہیں۔ اصل وجہ معاشی بد حالی کا خوف ہے جو اژدہا بن کر اُنکے سامنے کھڑا ہے۔ وہ تبدیلی کے اس عمل کو روکنے کیلئے جن چیزوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ تاریخ ثابت کر چکی ہے کہ وہ عارضی سہارے ہیں۔ تاریخ کے پھینے کو اُلٹا نہیں گھمایا جاسکتا، جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہر عمل کا رد عمل لازمی ہے۔ تاریخ کا پنڈولم حرکت میں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس مرتبہ یہ مغرب اور مشرق کی بجائے شمال اور جنوب کے درمیان حرکت کر رہا ہے۔

مغرب کے مادہ پرست اپنی ہوس کا علاج روحانیت میں تلاش کر رہے ہیں: ”عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے۔“

والسلام!

تمہارا والد!

حیاتِ جاودانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

5 فروری 2006ء

بُشی جی !

السلام علیکم!

آج کل زندگی برسِ مقتل گذر رہی ہے۔ میرے اور تختہ دار کے درمیان بس ایک دیوار
حائل ہے۔ آج صبح گنجِ قفس سے دیوارِ مقتل کا منظر عجیب تھا۔ دیوار کی نیل پر ایک پھول
مُسکرا رہا تھا۔ پس منظر میں گڑھی ہوئی صلیب میرے آنکھن میں جھانک رہی تھی، مرغانِ
خوش نوانے جشنِ طرب بپا کیا ہوا تھا۔ پھولوں اور پرندوں نے متنوع رنگوں اور آوازوں
سے فضائے بسیط کو حُسن اور موسیقی کی لازوال دُھنوں کا نذرانہ پیش کیا۔

دیوار کا پھول زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا بلبُل خاموش
تھا۔ میں سمجھا شاید وہ میرے ساتھ مل کر آہ و زاری کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ پھول کی قربت میں
کس چیز کا شکوہ؟ اور زندگی کی موجودگی میں کیسا ماتم؟ ہم دونوں میں درد کا اشتراک نہ تھا۔
اُسے وصالِ یار نصیب ہو رہا تھا اور میں دردِ تنہائی میں مبتلا! ہمارے ہاں مرنے کو بھی وصال
کہتے ہیں۔ جب میرے والدِ محترم کا وصال ہوا تھا تو مجھے کچھڑنے میں وصال کی جھلک نظر
آئی تھی۔ شاید میری تڑپ کو بلبُل نے وصالِ یار سمجھ لیا تھا، پھر بھی میرا فیصلہ یہی تھا کہ میرا
زدنا بلبُل کا رونا نہیں یہ تو چمن کا رونا ہے۔

اس مرتبہ موسمِ بہار اپنے وقت سے پہلے آ گیا۔ فصلِ گل جو بن پر ہے، سردیاں مختصر ہو
گئی ہیں، مجھے قبل از وقت بہار کا آنا اچھا نہیں لگا۔ گندم کی نرم و نازک بالیاں اس دُھوپ کی
جدت برداشت نہیں کر سکتیں۔ اُن کی نشوونما میں کمی رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً گندم کی پیداوار کم
ہوگی۔ میں اپنی گندم کے کھیت کنارے جا بیٹھا۔ اگر انسان کو تصور کی طاقت نہ ملتی تو اسکی دُنیا

کتنی تاریک ہو جاتی۔ میں چشمِ تصور سے گندم کے لہلہاتے کھیت دیکھنے لگا، نیلگوں سبزہ کی بہار میری آنکھوں کو طراوت دینے لگی۔

ایک مرتبہ میمونہ اور میں جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ اُس کی عمر چار برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ملتان ائر پورٹ سے جونہی جہاز نے اُڑان بھری گندم کے کھیتوں پر نظر پڑتے ہی میمونہ نے اپنی تو تلی زبان میں سوالات کی بو چھاڑ کر دی۔ پھر وہ ہر ایک سوال کا جواب بھی خود دیتی! وہ کہہ رہی تھی کہ یہ گندم سبز سے سنہری ہو جائیگی، میں نے کہا ہاں، کہنے لگی پھر اس کی فصل کاٹی جائیگی، میں نے پھر ہاں کہا، وہ کہنے لگی کیا گندم کو بھوسے سے الگ کیا جائیگا؟ گویا اس نے گندم کے گھر آنے، چکی پر اس کے آٹا پیسنے اور آٹا گوندھنے کے تمام مراحل کو بیان کر دیا، آخر میں کہنے لگی آپ کیلئے تو بے پروائی میں بناؤں گی، وہ دُختر کسان تھی، اُسے پورے عمل کی سمجھ تھی، اُس کے کانوں نے شب و روز یہی گفتگو سنی تھی۔

مجھے نہیں معلوم میں کون سا ذکر چھیڑ بیٹھا ہوں۔ میں تصورات کی دنیا میں اپنے ٹیوب ویل سے نکلتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا ہوں، وہ گائیں اور بھینسیں وہ درختوں کے جھنڈ جن کی چھاؤں میں میرا بچپن گذرا تھا، اب مجھے ٹھٹھرتی ہوئی راتوں کا سناٹا یاد آ رہا ہے، میں پیر بخش کو کھیتوں کو پانی دیتے دیکھ رہا ہوں، بر فیلے پانی میں اُس کی سوکھی کانپتی پنڈلیوں پر میری نظر ہے، اُس کے بچوں کی بھوک بڑھاپے میں بھی اسے چین نہیں لینے دیتی، ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک پانی کیلئے راستہ بناتے بناتے، اُس کے بازو شل ہو رہے ہیں۔ چودھویں کے چاند کی اُداس اور ٹھٹھرتی ہوئی کرنیں اپنا حُسن کھور ہی ہیں، میں سخت نگران کا رُوپ دھار چکا ہوں۔ جو نہ سوتا ہے، نہ دوسروں کو سونے دیتا ہے۔ کھیت مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ زمین سے رشتے کی طاقت ہے یا زیادہ سے زیادہ فصل اُگانے کا لالچ؟ یہ سب کچھ بار بار کیوں یاد آ رہا ہے، کہیں میں حقیقت کی دنیا سے آنکھیں چرانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ مجھے بہار کے قبل اُز وقت آنے پر بھی اعتراض ہے، بہار تو بہار ہے، غنچہ دل کھانے کا موسم، شاخوں پر کوئلیں پھوٹنے کا موسم، میری نظر جیل احاطے کے آم کے

پودے پر ہے، جسکی شاخیں بُور سے بھر گئی ہیں۔

میں جامعہ پنجاب سے فارغ ہوا تو ایک الوداعی تقریب میں عہد کر بیٹھا کہ جب بھی مادرِ وطن کو میری ضرورت پڑے گی ہل کی ہتھی چھوڑ کر میدانِ کارزار میں کود جاؤنگا۔ جان دے دوںگا، مگر حرمتِ وطن پر کوئی آنچ نہ آنے دوںگا۔ تم جانتی ہو میں عہد شکن نہیں ہوں، خود شکنی اور خود نگری مجھے آزمائشوں کا سامنا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ذات کے عفریت سے نکل کر تصور اور تخیل کی دُنیا میں چلا جاتا ہوں۔ انسان کے تصورات نے دنیا کو کئی رنگوں کا لباس پہنایا۔ سوچ کا بہتا دریا ہر نئے انقلاب کی بنیاد ہوتا ہے۔ خدا نے کہا ہو جا اور وہ ہو گیا (گن فیکون)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری نے کہا تھا پل جھپکیں اور ملکہ سبا کا تخت آپ کے سامنے ہوگا، قرآن گواہ ہے ایسا ہی ہوا۔ خدا فرماتا ہے میں نے کائنات کو انسان کے قبضہ قدرت میں دیدیا ہے۔

سُبْحَانَ اللَّهِ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ

مگر انسان کیلئے مشکل کام خود کو مسخر کرنا ہے۔ جب انسان نے دوسروں پر کنٹرول حاصل کرنے کی بجائے خود کو کنٹرول کر لیا تو یہ فتح مبین ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز اس کے اشارہ ابرو کی منتظر ہوگی۔

مقتل کی خشک ٹہنی پر موت رقص کرتی ہے۔ پھول نہیں کھلتے، جس ٹہنی نے زمین سے رشتہ توڑ لیا وہ دوسروں کو تو موت بانٹ سکتی ہے، خود کو زندگی نہیں دے سکتی۔ میرے سامنے والے پھول کی مسکراہٹ میں اُداسی کا رنگ غالب آ گیا ہے۔ چند لمحوں کا ساتھی مر جھا گیا ہے، بلبل وہاں سے اُڑ کر نیم کے ٹنڈ منڈ درخت پر آ بیٹھا ہے۔ وہ شجر سے پیوستہ رہ کر قافلہ بہار کا استقبال کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ سارے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، تم میرا خط پڑھتے ہوئے اسکا تصور کر سکتی ہو۔ حقیقت اور تصور کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تم تصورات کی دُنیا کو جتنا حسین کر لو گی، دُنیا اتنی حسین ہو جائیگی۔ اگر تم نے میری جیل کی پابندیوں کے تصور کو خود پر حاوی کر لیا تو میں تم پر مغلوب گماں ہونے کا فتویٰ صادر کر دوںگا۔

میں نے ایسا نہ بھی کیا تو زمانہ تم پر کم ہمتی کا الزام دھرے گا۔ تم تصور کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ حقیقت ازلی یہی ہے کہ نہ میں نے اس دنیا میں ہمیشہ رہنا اور نہ تم نے۔ کردار کو موت نہیں آتی، اپنے عمل کو احترام آدمیت کیلئے وقف کر دو۔

میرے سامنے والا پھول اب بکھر چکا ہے مگر اس کی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی ہے بلبل کو موسم بہار کے نئے پھولوں کا انتظار ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

زرعی فارم کی کہانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

آج تمہیں اپنے معاشرتی ڈھانچے کے حوالے سے کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اس کو سمجھنے کیلئے تمہارے لئے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ تم اُس جگہ کی معاشرت کو سمجھو جہاں تم پیدا ہوئی ہو۔ میمونہ بی بی تمہارے دادا محترم بہت بڑے زمیندار نہیں تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر زمیندار تھے ہی نہیں۔ وہ ایک فقیر آدمی تھے، سارا علاقہ انھیں ایک انصاف پسند، دیندار اور ولی اللہ کے طور پر جانتا تھا۔ زندگی بھر انھوں نے کسی کو دکھ نہیں دیا، کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ اپنے ملازموں کو بھی برابری کا درجہ دیا، انھوں نے سادہ زندگی گزاری۔ وہ شان و شوکت کے دلدادہ ہرگز نہ تھے۔ تمہارے پردادا نے اپنے دونوں بیٹوں کیلئے الگ الگ گھر بنوائے۔ ہمارے حصہ میں جو گھر آیا اُس کی عمارت بھی تمہارے پردادا کی بنائی ہوئی تھی۔ تمہارے دادا نے اس میں ایک اینٹ کا اضافہ نہیں کیا، دو کنال میں چند کمرے اور اُنکے سامنے خوبصورت نقش و نگار سے مزین لکڑی کا چھجہ اور اس کے ساتھ ہی ایک بغیر چھت کے کمرہ تھا جس کو تمہارے پردادا غسل خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس کے ساتھ ایک اور اضافی کمرہ تھا۔ جب بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو انھیں وہ کمرہ دے دیا گیا۔ جب دوسرے بھائی کی شادی ہوئی تو غسل خانے پر چھت ڈال کر اُنکا بیڈروم بنا دیا گیا۔ غلے کا گودام جسے صُفّہ کہتے تھے، یہ ایک بڑا ہال تھا۔ اس کے اندر ایک اور دیوار کھڑی کر کے ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا۔ ڈیوڑھی سے بھی مہمان خانے کا کام لینا شروع کر دیا گیا۔ تمہیں اب دُنیا سے اُنکی بے رغبتی کا اندازہ ہو گیا ہوگا، اُنکی چال ڈھال، اُنکا لباس اس بات کا غماز تھا کہ اُن کا اس دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ساری زندگی انھیں سفید

لباس کے علاوہ کسی اور رنگ کے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔

میں نے انہیں لوگوں کے اندر مال تقسیم کرتے بھی نہیں دیکھا۔ تمہاری دادی پورا گھر اٹھا کر دے دیتیں، انہوں نے اس پر بھی کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ایسے لگتا تھا کہ مال اور دولت سے ان کا دور کا واسطہ نہ تھا۔ اسکے باوجود ہمارے چھوٹے سے زرعی فارم پر کام کرنیوالوں کے حالات قابل رشک نہ تھے۔ مجھے یاد ہے ہمارا ایک ملازم جن دو ڈا ہمارا آٹا پسواتے ہوئے مشین کی زد میں آ کر اس دنیا سے چلا گیا، اُسکی بیوی ظہراں مائی بڑھاپے میں بے یار و مددگار تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ بھی کانپتے تھے، اُسکی بیٹی کو کسی نے اغواء کیا اور حیدرآباد میں لے جا کر بیچ دیا۔ ظہراں مائی کو ہمارے گھر سے روٹی تو مل جاتی تھی۔ اس کو دیگر ضروریات کیلئے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے تھے، مجھے یہ بات کبھی اچھی نہیں لگی۔ ہمارا ملازم اللہ بخش فقیر ہمارے کھیتوں میں کام کرتا تھا، اُس کی بینائی چلی گئی، وہ ہمارے گھر تک دھکے کھاتے ہوئے آتا اُس کو بھی روٹی مل جاتی۔ باقی ضروریات کیلئے وہ گلیوں میں بھیک مانگتا نظر آیا۔ اسی طرح گاموں بڑا مبارزنگا اور طاقتور آدمی تھا، وہ اتنا شہ زور تھا کہ کہا جاتا تھا کہ اس پر جن کا اثر ہے۔ وہ کابنی دیر تک ہل چلاتا رہتا، کسی سے کام کرتے ہوئے، گھاس کترنے کی مشین چلاتے ہوئے وہ واقعی جن لگتا تھا، آخری عمر میں اُسکی بینائی ختم ہو گئی، اکثر ہمارے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا، روٹی اسے بھی مل جاتی تھی۔ اسی طرح ہمارا ایک ملازم اللہ بخش جس کو مٹی اللہ بخش کہتے تھے، پر شدید بیماری کا حملہ ہوا۔ وہ چار پائی سے لگ کر گھر بیٹھ گیا، اس کی آنکھوں میں ویرانی ہوتی۔ ہم پاس سے گذر جاتے، روٹی اس کو بھی مل جاتی تھی، لیکن اس کی بے کسی کا کوئی چارہ ساز نہیں تھا۔ رمضان مصلیٰ اسکے دو اور بھائی سرور اور الہی بخش ہمارے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کوئی ان کو اپنے ساتھ بٹھا کر روٹی کھلاتا نہ ان کو کوئی اپنے برابر بیٹھنے دیتا۔ میں اپنے والد کو ظالم نہیں سمجھتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ خدا کا نظام ہے، میں خدا کو بھی ظالم نہیں سمجھتا، خدا ظالم کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نظام کے اندر اتنی درندگی ہے۔ کہ افراد جتنے بھی پارسا ہوں، وہ بھی اس نظام کا حصہ بن جاتے

ہیں۔ وہ اس ظلم اور زیادتی کو برائی ہی نہیں سمجھتے۔ جسکے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے وہ بھی اس کو برا نہیں سمجھتا۔ اگر صورتحال یہی رہی تو آئندہ سو سال میں بھی ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی اور نہ ہی پاکستان کی ترقی کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ ہمیں ایسا نظام لانا ہوگا جسکی وجہ سے علم، انصاف اور علاج غریب کے دروازے پر دستک دے۔ اگر یہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی تو ہماری قوم ترقی یافتہ کہلانے کی مستحق کیسے ہو سکتی ہے؟۔

میمونہ بی بی! یہ ایک زرعی فارم کی کہانی نہیں۔ پاکستان کے ہر شہر کی کہانی ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ کب تک لوگ اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے، کب تک نظام کے جبر کی چکیوں میں ان کی ہڈیاں پستی رہیں گی، غریبوں کی زبانیں بند کر کے انھیں گونگے اور بہرے بنا کر ان کی آنکھوں کی روشنی چھین کر ان کو ذات پات کی زنجیروں میں باندھ کر ان کے انسان اور مسلمان ہونے پر شکوک و شبہات کی چادر ڈال کر ان کے وجود کی نفی کرتے رہیں گے، کون جواب دے گا؟ آخرت میں تو دینا ہی دینا ہے، اس دنیا میں راہنمائی کس نے کرنی ہے؟

جب ہم اپنے لوگوں کی عزت اور آبرو کی حفاظت کریں گے، تبھی جا کر ہم اللہ کی حفاظت میں ہونگے۔ صرف خدا حافظ کے لفظ کو اللہ حافظ کے لفظ میں بدل دینے سے ہم اللہ کی حفاظت میں نہیں آسکتے!

والسلام!

تبہارا والد!

نیب کی عدالت میں بیان

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 فروری 2006ء

بشری بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے معاشی معاملات کیا ہیں؟ پچھلے سال جب مومنہ اور جویریہ کی فیس ادا نہ ہو سکی تو وہ پریشان ہو گئیں، تم نے انہیں جب یہ بتایا کہ تمہاری تعلیم کے دوران کوئی ایک بھی موقع نہ آیا کہ فیس بروقت ادا کی گئی ہو تو یہ سچ تھا تمہاری فیس ہر دفعہ لیٹ ہو گئی جو مع جرمانہ ادا کی گئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ تمہارے خاندان کی مالی حیثیت اتنی مستحکم تھی کہ 1951ء میں پاکستان بننے کے بعد قائم ہونے والی پہلی ٹیکسٹائل ملز میں میرے ددھیال اور ننھیال مالکانہ حقوق رکھتے تھے۔ جب تمہاری ماں، بہنوں کو اور تمہیں عدالت میں پیش کیا گیا کہ تمہارے پاس ناجائز اثاثے ہیں تو جتنے اضطراب کا سامنا مجھے کرنا پڑا وہ میں ہی جانتا ہوں، اُس روز مجھے اپنی کم ہمتی کا بھی شدید احساس ہوا تھا۔

نیب کی عدالت میں حکومت کی طرف سے گواہیاں مکمل کرنے کے بعد مجھے اپنی صفائی میں عدالتی بیان داخل کرانے کو کہا گیا۔ میں یہ ساری تفصیلات پہلے ہی مختلف پیرائے میں بیان کر چکا ہوں۔ قانونی تقاضے پورے کرنے کیلئے جو تحریر عدالت میں جمع کرائی ہے۔ اُسے اس خط کا حصہ بنا رہا ہوں۔

جناب والا!

میرے خاندان کا نسبی تعلق رسالت مآب حضرت محمد ﷺ سے ہے۔ میرے آباؤ اجداد عرب سے ہجرت کر کے، براستہ افغانستان، برصغیر پاک و ہند میں آئے۔ گذشتہ گیارہ بارہ سو سال سے ہمارا خاندان ایک ہی علاقے میں مقیم ہے۔ اڑھائی سو برس تک انہوں

نے دریائے سندھ اور دریائے ستلج کے علاقوں پر حکمرانی کی۔ اُن کی قلمرو میں موجودہ ضلع لیہ، لال عیسن کروڑ سے لے کر دیپالپور اور ملتان کا پورا علاقہ شامل تھا۔

میری کچھلی پانچ نسلوں کی جائیداد میں بدستور اضافہ ہوا ہے۔ میرے دادا کے دادا حضرت مخدوم محمد شاہ صاحب سے لے کر، میرے پردادا حضرت مخدوم بہار شاہ صاحب رحمۃ اللہ، میرے دادا حضرت محمد نور چراغ شاہ صاحب رحمۃ اللہ، اور میرے والد محترم حضرت مخدوم محمد شاہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ تک، ہر ایک کی جائیداد اڑھائی سو سالہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق بڑھتی رہی ہے۔ یہ تمام جائیداد خریدی گئی ہے۔ اس جائیداد میں ایک مرلہ زمین بھی مغلوں، سکھوں اور انگریزوں کی طرف سے جاگیر نہیں ہے۔ ہمارے مریدین سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے مختلف شہروں میں آباد ہیں۔

میں موجودہ حکومت کا شروع دن سے ہی مخالف ہوں۔ 12 اکتوبر 1999ء سے اکتوبر 2001ء تک مجھے مختلف سیاسی مقدمات میں گرفتار کیا گیا اور پھر عدالتوں کے حکم پر رہا کیا گیا۔ اس دوران مجھ پر ذہنی و جسمانی تشدد کے پہاڑ توڑے گئے۔ میں نے فوجی حکمرانوں کے غیر آئینی اقدامات کی مخالفت جاری رکھی اور قید و بند کی دُشواریاں بھی مجھے اپنے راستے سے نہ ہٹا سکیں۔ فوجی حکومت قائم ہونے کے اڑھائی سال بعد حکمرانوں نے جنوری 2002ء میں میرے خلاف نیب کی عدالت میں ریفرنس دائر کر دیا اور اتنی تاخیر سے دائر کرنے کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی گئی۔ ریفرنس میں گھناؤنے الزامات کو شامل کیا گیا، جنہیں میری گرفتاری کا جواز بنانے اور میری کردار گشی کرنے کیلئے بار بار پریس میں اُچھالا گیا، پاکستان ٹیلی ویژن پر اُن الزامات کی تشہیر کی گئی۔ میں حیران ہوں کہ ریفرنس میں مذکورہ الزامات ثابت کرنے کی بجائے واپس لے لئے گئے۔ جو الزامات واپس لے لئے گئے ہیں، واپس لیے گئے الزامات وہ درج ذیل ہیں:

- 1- میرے کروڑوں روپے کے اندرون و بیرون ملک بینک اکاؤنٹ پکڑے گئے ہیں۔
- 2- میں نے غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے پچاس پچاس ہزار روپے خرد برد کر لیے ہیں۔

3۔ میری بیٹی نے سکولوں کے ذریعے کروڑوں روپے کی تنخواہ وصول کر کے متعلقہ افراد تک نہیں پہنچائی۔

جناب والا!

الزامات تو واپس ہو گئے مگر اس سے قوم کے سامنے جو میری اور میرے خاندان کی تضحیک ہوئی ہے، اُس کا حساب کون دے گا۔ میں چودہ ماہ جیل میں رہا، جیل سے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا، تمام تر نامساعد حالات کے باوجود میرے حلقہ انتخاب کے باشعور عوام نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے اپنی نیابت کیلئے موزوں قرار دیا۔ یہ نیب کے جھوٹے پراپیگنڈے کا عوام کی طرف سے بھرپور جواب تھا۔ ہائی کورٹ نے مجھے رہا کر دیا۔ میں نے قومی اسمبلی میں پہنچتے ہی ایل ایف او کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف تحریک چلائی۔ مجھے 17 سیاسی جماعتوں، جو اے آر ڈی کے پلیٹ فارم پر متحد ہیں، کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اسمبلی میں میرے ہوتے ہوئے حکمرانوں کو، ایل ایف او کو، آئین کا حصہ بنانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے میری جمہوری سیاسی سرگرمیوں سے خائف ہو کر مجھے بغاوت کے ایک جھوٹے مقدمے میں گرفتار کر لیا۔ میں نے جیل سے وزیراعظم کے انتخاب میں حصہ لیا۔ متحدہ اپوزیشن جس کے ممبران کی تعداد 153 کے قریب ہے۔ انہوں نے میری بھرپور حمایت کی، موجودہ ریفرنس اسی پس منظر میں دائر کیا گیا۔

جناب والا!

میرے خلاف تمام الزامات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ نیب کا ادارہ سیاسی انتقام کیلئے بنایا گیا۔ اس ادارے کو موجودہ حکمرانوں کے خلاف ایک بھی ریفرنس دائر کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پچھلے چھ سالوں میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں سے کسی ایک سیاستدان نے بھی کرپشن نہیں کی تو پھر فوجی وردی یا فوجی اقتدار کا کیا جواز ہے۔

جناب والا!

قومی ادارہ برائے احتساب National Accountability Bureau کا

مخفف NAB ہے، جس کا مطلب ہے پکڑ لینا۔ مدنیت کے ساتھ ہی احتساب کے عمل کو لازمی قرار دیا گیا۔ کوئی معاشرہ احتساب کے بغیر پنپ ہی نہیں سکتا۔ ہمارے مذہب نے بھی احتساب کا حکم دیا ہے۔ جہاں حکام کے پاس بے لگام طاقت ہو، وہاں کرپشن اور رشوت خوری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں طاقت تین گروہوں کے پاس رہی ہے۔ جاگیر دار، جرنیل اور افسر شاہی۔ کاروباری طبقہ بھی عوام کو لوٹنے کیلئے رشوت اور کرپشن کا ایک بڑا عمل ہے۔ تیسری دنیا کے بے بس عوام ان طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جمہوری معاشروں میں احتساب ووٹ کے ذریعے بھی ہو جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی۔ بعض اوقات کسی اخبار میں ناقابل تردید بیان، کسی بھی سیاستدان جنرل یا افسر کو ہمیشہ کیلئے پبلک آفس سے باہر نکال پھینکنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ احتساب کے اس عمل سے معاشرتی قدریں اُجاگر ہوتی ہیں۔ ہر غلط کار کا انجام دوسروں کے لئے سبق آموز ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی دوسروں معاشروں کی طرح احتساب کا نعرہ بہت مقبول ہے، ہر فوجی حکومت اسے اپنے فوجی مقاصد کیلئے استعمال کرتی ہے۔ یہ معاشرے کو کرپشن اور رشوت خوری سے بچانے کے نعرے پر اقتدار کا جواز تراشتی ہے۔ ایبڈو جیسے قانون بنا کر اور فوجی عدالتیں لگا کر اپنے مخالفین کو خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ ایوب خان نے سینکڑوں سیاستدانوں کو "ایبڈو" قانون کے تحت سیاست بدر کر دیا۔ کچھ سرپھروں نے ایبڈو کے خلاف مقدمے لڑے مگر سیاسی طور پر کمزور ہو کر مٹ گئے۔ جب ایوب خان کو سیاسی حمایت کی ضرورت تھی تو انہوں نے انہی ایبڈو زدہ سیاستدانوں کے دروازوں پر دستک دی۔ ان میں سے ایک مثال مخدوم زادہ حسن محمود کی ہے۔ ایوب خان مادرِ ملت کے خلاف حمایت حاصل کرنے کیلئے جمال دین والی (رحیم یار خان) جیسے دُور افتادہ گاؤں میں سر کے بل گئے تھے۔

جناب والا!

ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار نیب کے معاملے میں محدود ہوتا ہے۔ ان کا اپنا چیئرمین، فوجی وردی میں ملبوس، ایک لیفٹیننٹ جنرل ہوتا ہے۔ لیکن وہ کسی فوجی کا احتساب

نہیں کر سکتا۔ عملی طور پر جاگیردار بھی اس احتساب سے ماورا ہیں۔ متوسط طبقے کے سیاستدان انکا پسندیدہ اور آسان ہدف ہیں۔ دُنیا کو دکھانے کیلئے شروع میں چند صنعت کار اور بیوروکریٹ بھی پکڑے گئے کیونکہ دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے یہ ضروری تھا۔ ایک آدھے ریٹائرڈ فوجی افسر پر بھی مقدمہ بنایا گیا اور انہیں اتنی آسائشیں پہنچائیں جو کسی والی سیاست کو تخت پر حاصل ہوتی ہیں۔

انہنا تو یہ ہے کہ جن سیاستدانوں کے خلاف اسی حکومت نے فرد جرم عائد کیا، انہیں ساہا سال جیلوں میں رکھا، بعد میں انہی کو وزارتیں دی گئیں۔ اگر کوئی تنقید کرے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں عوام نے منتخب کیا ہے لیکن اب اُن سے کون پوچھے کہ چلے عوام نے کم علمی کی بنیاد پر منتخب کر لیا لیکن آپ تو اُن کے اعمال سے باخبر تھے۔ آپ کے نزدیک تو وہ چور ہیں، آپ نے چوروں کو خزانہ کیوں سوئپ دیا؟ لیکن جو حقیقت سے پردہ اٹھائے، وہ غدار ہے یا باغی۔ نیب کی اصلیت عوام پر آشکار ہو چکی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ عوام کا ہر طرح کے احتساب سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ کسے چور سمجھیں اور کسے چوکیدار۔

میرے لئے نیب کی گرفتاری ناقابل یقین تھی۔ میں نے اپنے پورے سیاسی کیریئر کو اس انداز سے ڈھال رکھا تھا کہ اس میں دولت جمع کرنے یا اختیارات کے ناجائز استعمال کا تصور تک نہ تھا۔ میں نے ساری زندگی کبھی بجلی یا ٹیلی فون کے بل ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہیں برتی۔ پوری زندگی میں نے کبھی ٹریفک کے اشارے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اپنے خاندان میں کسی کو ملازمت نہیں دلوائی۔ میرا بھانجا تسلیم عالم ملازمت کے شوق میں بی اے، ایل ایل بی (B.A.L.L.B) کرنے کے بعد عمر زیادہ ہونے سے بچنے کیلئے پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہو گیا۔ دوسرا بھانجا فیض مصطفیٰ شاہ بی اے، پی ٹی سی (B.A.P.T.C) کر کے پرائمری سکول کا ٹیچر ہے۔ میرے خاندان کے اکثر افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ شاہد بہار ہاشمی جو میرا بھتیجا اور داماد ہے، ایم اے۔ ایل ایل بی (M.A.L.L.B) ہے۔ وہ کاشت کاری کر رہا ہے۔ ایک بھتیجا علمدار حسین شاہ ایم بی اے (M.B.A) ہے، وہ کاشت کاری

کر رہا ہے۔ اور ایک بھتیجا عالم ایل ایل بی (L.L.B) ہے۔ میں نے کبھی اپنے کسی عزیز کو ملازمت دلانے کیلئے اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال نہیں کیا۔ میری دو بھانجیاں اور دو بھتیجیاں ایم اے پاس ہیں۔ باقی بھانجیاں، بھتیجیاں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میری ایک بیٹی ایم اے اکنامکس (M.A-Economics) ہے، دوسری بیٹی نے ایم بی اے کیا ہے اور تیسری بیٹی نے ماس کیونیکیشن میں ایم اے کیا ہے۔ میری چوتھی بیٹی کننیر ڈکالچ لاہور سے گریجویٹ ہے، تاہم میرا کوئی بھی دور نزدیک کارشتہ دار سرکاری ملازمت میں نہیں ہے۔

میری جائیداد ہی ہے جو میرے آباؤ اجداد کے پاس انگریزوں کے آنے سے پہلے تھی یا میرے دادا اور والد نے خریدی۔ میں خاندان کا پہلا شخص ہوں جس نے دو سو سال پہلے کی جائیداد فروخت کر کے سیاست کی۔ میری بیوی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے، اس کو اپنے والد محترم مخدوم مہر حسین شاہ اور مخدوم ہادی شاہ کی ساری زرعی جائیداد اپنے ورثے میں ملی اور یہ جائیداد بھی انگریزوں کے دور سے پہلے کی ہے۔ ہماری ساری جائیداد 1846ء کے بندوبست اراضی میں موجود تھی۔ اس کا ریکارڈ نیب کو فراہم کر دیا گیا ہے اور ملتان کے ضلعی سرکاری دفاتر میں موجود ہے۔ کچھ جائیدادیں فروخت کر کے میں نے اسلام آباد میں پلاٹ خریدا، یہاں کوئی بیوقوف ہی پلاٹ خریدتا ہے۔ بااثر لوگوں کیلئے یہ مفت کا شہر ہے۔ گھر بنانے کیلئے تمام سرکاری ملازمین اور قومی اسمبلی کے ارکان کو زمین تقریباً مفت ملتی ہے بلکہ کمرشل پلازے اور ان پر عمارتیں تعمیر کرنے کیلئے کروڑوں روپے کے قرضے بھی دیئے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی رقم سے گھر تعمیر کرایا۔ اسمبلی توڑی گئی تو میں واپس ملتان چلا گیا۔ اسلام آباد کا گھر فروخت کر کے ملتان میں گھر کی تعمیر شروع کی جو آج دس سال بعد بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ اسلام آباد کے گھر کی فروخت سے ایک گاڑی بھی خریدی جو ملتان کے گھر کی قسط ادا کرنے کے کام آئی۔

اب میرے پاس صرف 1985ء ماڈل کی ایک گاڑی ہے، انیس سال پرانی یہ گاڑی اکثر بیچ سڑک کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ نامکمل گھر اور چلنے سے زیادہ تھرکنے والی یہ گاڑی، میری

زندگی بھر کی کمائی ہے۔ وراثتی زرعی جائیداد کی آمدن نیب کے سرکاری گواہوں کے مطابق کروڑوں میں بنتی ہے اور میری بیوی کی زرعی زمینیں بھی اب سرکار کی تحویل میں ہیں۔ مجھے نیب کی عدالت میں پیش کیا گیا، میں نے عدالت کو فیض احمد فیض کے چند اشعار سنائے۔

ہم خستہ تنوں سے مستسبو کیا مال و منال کا پوچھتے ہو

جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں

دامن میں ہے مشت خاک جگر، ساغر میں ہے خون حسرت سے

لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام الٹائے دیتے ہیں

57 دن تک مجھے شدید ذہنی اور جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی دنوں نیب کے

عقوبت خانے میں، جہانگیر بدر کے ایک ساتھی نے جان کی بازی ہار دی تھی۔ مجھے اُس سے

بھی زیادہ تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ میری گرفتاری پر جو فرد جرم عدالت میں پیش کی گئی وہ

خونفک تھی۔ مجھ پر سینکڑوں سکول کھول کر کروڑوں روپے سرکاری خزانے سے لینے کا الزام

تھا۔ یہ الزام بھی تھا کہ غریبوں کے نام پر پچاس ہزار کے صوابدیدی فنڈ زمیں نے اپنی

ذات پر خرچ کیے۔ بیرون ملک اکاؤنٹس میں کروڑوں جمع کرانے کا الزام بھی لگایا گیا، ان

الزامات کی ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات میں تشہیر کی گئی۔ میرے زیر تعمیر گھر کی ایسی تصاویر

شائع کی گئیں کہ مجھے بھی وہ تاج محل نظر آنے لگا۔ میں سوچنے لگا اگر میں نے یہ سب کچھ کیا

ہے تو بہت برا کیا ہے مگر عدالت میں نیب نے سارے الزامات واپس لے لئے اور کسی کو

کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔ قوم کے سامنے میرا مسخ شدہ چہرہ پیش کرنے والوں کا اپنا

چہرہ مسخ ہو گیا۔ درحقیقت یہ نیب کی حکمت عملی کا حصہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے سیاستدانوں

کی بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ ہر آدمی متعلقہ شخص سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اس کے

بعد نیب کیلئے آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ اسے جتنا عرصہ چاہے جیل میں رکھے یا اس کے

خاندان پر ظلم کرے۔ میں نے اس ظالمانہ شکنجے کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنے کا مصمم

ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ بلیک میلنگ کا کوئی ہتھیار فوجی حکمرانوں کے پاس نہ رہے۔ فوجی

قیادت نے یہ شکنجہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ جس سے ملٹری کورٹس والا کام لینا تھا۔ احتساب کے نام پر عدالتوں کی آزادی سلب کر لی گئی۔ ذرائع ابلاغ کو صرف تصویر کا ایک رُخ دکھانے کی اجازت دی گئی۔ اخبارات کے بلیک میلرز کو جس نے چندہ دینے سے انکار کیا، انہیں نیب کے ذریعے چین چین کر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ متوسط طبقے کی قیادت کی کردار کشی کچھ اخبارات کا محبوب مشغلہ ہے۔ جو بھی اُن کی بلیک میلنگ میں نہیں آتا، اسکے خلاف فیچر چھاپ دیتے اور نیب والے ان لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے۔ چونکہ نیب کے پاس بنیادی مواد جمع کرنے کا نظام نہیں تھا اور نہ ہی وہ احتساب کے عمل کو سنجیدگی سے لے رہے تھے، وہ اس طرح کے اخبارات کے جھوٹے پروپیگنڈے کو خوشدلی سے قبول کر کے اسے اپنی کامیابیوں کی فہرست میں شامل کر لیتے۔ بلیک میلرز کو مزید لوٹنے اور ان کی جائیدادوں پر ناجائز قبضے کا کھلا لائسنس مل جاتا۔ ایک بلیک میلر نے مجھ سے بھی بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ میں اُس کی اس جسارت پر حیران رہ گیا۔ میں نے اُس کے ساتھی کو کہا "کسی نا خوشگوار واقعے سے بچنے کیلئے اُسے یہاں سے لے جائیں۔ وہ کئی سال تک میرے خلاف جھوٹی خبریں چھاپتے رہے، میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔" مجھ پر اپنی آمدن سے چالیس لاکھ کے زائد اثاثے کا الزام لگایا گیا ہے۔ میری تین لاکھ کی 19 سالہ بوڑھی گاڑھی کی قیمت 20 لاکھ بتائی گئی۔ میں نے نیب حکام سے کہا "آپ اُسے دو لاکھ میں مجھ سے خرید لیں۔" دوسری گاڑی جو میں نے بیچ کر 20 لاکھ کے مکان کی قسط ادا کر دی، وہ قسط کے 20 لاکھ میرے مکان کی مالیت میں شمار کرتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں، وہ گاڑی ابھی تک اضافی جائیداد کے طور پر گنی جائے گی۔

انہوں نے گوجرانوالہ میں گاڑی کے نئے مالکوں کو جا پکڑا۔ دو سال قبل میں اپنے دوست اور ساتھی رانا تنویر سے جیل میں ملاقات کیلئے گیا، کہنے لگے "نیب نے گذشتہ 9 ماہ سے کسی سیاستدان کو گرفتار کیا اور نہ ہی کسی کے خلاف نیا مقدمہ بنایا ہے۔" دو مہینے بعد میں ان کے ساتھ جیل میں تھا۔ میں نے اس سے کہا "مقدمہ بھی موجود ہے اور ملزم بھی حاضر

ہوں اور رہوں گا۔ میں نے حکومت کی سیاسی معاشی پالیسیوں کو قومی مفادات کے خلاف پایا ہے۔ فوج کے سیاسی کردار کو غیر آئینی سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کا قائم مقام صدر ہوں۔ اے آر ڈی اور مسلم لیگ دونوں کی پارلیمانی پارٹیوں کا منتخب لیڈر ہوں۔ فوجی حکمران مجھے اپنے غیر آئینی اقدامات کے راستے کی سب سے بڑی دیوار سمجھتے ہیں۔ مشرف دور حکومت میں مجھے دسویں بار گرفتار کیا گیا ہے۔

جناب والا!

مجھ پر جتنے الزامات عائد کئے گئے ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن اپنے اصولی موقف کی وجہ سے میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ موجودہ حکمران مجھے اپنے بدترین انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔ لیکن یہ تصور بھی نہ تھا کہ مجھے بغاوت، غداری، سازش، جلسا سازی اور کرپشن جیسے بے بنیاد الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دستخط!

جاوید ہاشمی

وطن کی بیٹیو!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

السلام علیکم!

میں آپ سے ایسے مقام سے مخاطب ہوں جہاں ذہن پر لگے ہوئے کئی جالے اترنا شروع ہوتے ہیں اور چیزوں کی شناخت میں آسانی ہو جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ

الطلبو العلم فریضة علی کل مسلمة و مسلما

اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ تمام مسلمان مرد اور عورتوں پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ چودہ سو سال میں علماء دین نے عورتوں کی تعلیم پر کوئی شرعی پابندی نہیں لگائی۔ رسالت مآب ﷺ کی زندگی اور اس کے بعد کے دور میں خواتین دین کا علم آگے منتقل کرنے میں مردوں سے کسی صورت میں پیچھے نہیں رہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت ام سلمہؓ نے احادیث کا علم آگے منتقل کیا۔ حضرت زینبؓ، حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی زندگی پوری اُمت کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں ان کے علم کے حصول پر کوئی قدغن نہیں رہی۔ لیکن جو نہی بادشاہوں کا دور شروع ہوا، قبائلیت عود کر آئی۔ بادشاہت نے عورتوں کی آزادی اور ان کے علم کے حصول پر سب سے زیادہ حملہ کیا اور بعد میں قبائلیت نے عورتوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے۔ نہ صرف دروازے بند کیے بلکہ اس کو شریعت کا تقاضا کہہ کر دین اسلام کی توہین کی۔

جو جگہ علم کا منبع تھی اب اسی سعودی عرب میں عورتوں کی تعلیم کی شرح پوری دنیا میں سب سے کم ہے۔ اگر میں مبالغہ نہیں کر رہا تو دوسرے مسلم معاشروں میں بھی عورتوں کو ایک طرف اٹھا کر پھینک دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں نے ان کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی بلکہ اس حکم کی توہین کی۔ آج جو تعلیم آپ حاصل کر رہی ہیں، یہ ہمارے مذہب کے تقاضوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ بچیوں کی تعلیم کی جو یلغار

ہے یہ مغربی معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے اپنی عورتوں کو اپنے معاشرتی معاملات میں برابری کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور یہ کہنا بھی بے جا نا نہ ہوگا کہ کچھ معاملات میں انہوں نے اپنی عورتوں کے کندھوں پر ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جو فطری طور پر عورتوں کے اٹھانے کا نہیں تھا۔ روشنی کی کرن جو آپ تک پہنچی ہے یہ اسلامی معاشرے کی وجہ سے نہیں ہے لیکن ہے عین اسلام۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ "اگر تم نے میری بات کو آگے نہ بڑھایا تو میں دوسری قوم پیدا کر لوں گا" یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ یہ کام ہم مغربی معاشرے کی وجہ سے سرانجام دے رہے ہیں اور اللہ نے یہ کام دوسری جماعتوں اور معاشرہوں سے لے لیا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کا بنیادی فریضے کیلئے جو حکم تھا، اس پر عملدرآمد ہم غیروں کی وجہ سے کر رہے ہیں۔

دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ پردے کے احکامات اسلام میں بالکل موجود ہیں اور میں حجاب کے حق میں ہوں۔ مگر ہندو مذہب میں اگر آپ راجپوت ہندوؤں اور گجروں کے پردے کی تفصیلات میں جائیں تو آپ دنگ رہ جائیں گی کہ وہاں پر لوگوں کی موجودگی میں بیوی ساری عمر اپنے میاں سے پردہ کرتی ہے، خواہ ان کی عمر نوے سال سے بھی بڑھ جائے۔ میں کئی ایسے خاندانوں کو جانتا ہوں جن میں یہ پردہ آج بھی اسی طرح سے موجود ہے۔ پردے کی بات صرف اسلام نے نہیں کی اور معاشرہوں میں بھی یہ بات موجود ہے۔ اسلام پردہ کی پابندی مردوں پر بھی لگاتا ہے۔ افریقہ کے کئی قبائل اور ملک ایسے ہیں جہاں اب بھی مرد پردہ کرتے ہیں لیکن عورتیں نہیں کرتیں۔ جہاں تک بالوں کی نمائش کا تعلق ہے تو یہ عرب معاشرے میں مردوں کو بھی ہر حالت میں چھپانے پڑتے ہیں، اس کیلئے اسی طرح کا لباس تیار کرنا پڑتا ہے جیسا عورتوں کے بال چھپانے کے لئے ہے۔ آپ نے کسی سعودی عرب کے باشندے یا کسی عالم دین کو شاید ہی کبھی ننگے سر دیکھا ہو۔ اگر عورت چہرے کا پردہ کئے بغیر طواف کر سکتی ہے تو عملی زندگی کی مشکلات کے پیش نظر اس پر اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ دیہات میں نوے فیصد عورتیں رات دن محنت مزدوری والے کام

کرتی ہیں ان کے لئے خاص قسم کا پردہ کرنا ممکن ہی نہیں دس فیصد برقعہ سٹیٹس سمبل کے طور پر اوڑھتی ہیں قرآن حکیم میں کام کرنے والی عورتوں (کینروں) اور محصنات کے لئے پردے کا الگ معیار قائم کیا ہے۔

میں کوئی مذہبی سکا لرنہیں ہوں لیکن میں یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ آگے بڑھ کر مردوں کے شانہ بشانہ اپنی سرگرمیوں کو منظم کریں۔ اسلام نے آپکے انجینئر، ڈاکٹر ہونے پر کبھی پابندی نہیں لگائی۔ آپکے کاشتکار یا دکاندار ہونے پر پابندی نہیں لگائی، آپکے اخبار نویس یا استاد ہونے پر بھی پابندی نہیں لگائی۔ کسی بھی معاشرتی کام میں آگے بڑھنے پر قرآن وحدیث نے کہیں بھی پابندی نہیں لگائی۔ نہ ہی آپکو پیچھے رکھ کر آپکی معاشرتی سرگرمیوں کو محدود کیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث نے عورت کے سربراہ ہونے پر بھی پابندی نہیں لگائی، اس کے حکومتی معاملات چلانے میں مشاورت پر کہیں پابندی نہیں۔

عورت کا جو تصور آج ہمارے معاشرہ میں ہے، اسلامی تعلیمات میں اس کا وجود نہیں ہے۔ آپکو اس دور میں آگے بڑھنا ہوگا۔ نیلی وردیوں میں سکول جانیوالی بچیاں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ جب میں انھیں دیکھتا ہوں تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ مجھے جب ہسپتال یا عدالتوں میں پیشیوں کیلئے لیجاتے ہیں، میں سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی بچیوں کو سکولوں کی طرف رواں دواں دیکھتا ہوں، تو یہ پھولوں کی لہلہاتی ہوئی کیاریاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کے چہروں پر عزم کی داستاں لکھی ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ وہ بھرپور کردار ادا کرنے کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کل کی راہنما ہیں۔ میں ان تعلیم یافتہ ماؤں کی آغوش میں آنے والی نسل کا تصور آنکھوں میں بسا لیتا ہوں۔ قوس وقزح کے یہ رنگ میرے اندر سے یوں پھوٹتے ہیں کہ میں ان میں نہا جاتا ہوں۔ میری خوشی اُبل کر میرے لفظوں میں ڈھلنا چاہتی ہے۔ خدا کرے تم آگے بڑھتی رہو۔ اس بھنگی ہوئی قوم کو تم ہی راہ راست پر لاسکتی ہو۔ میں آج بھی اُس بچی کی آواز سن رہا ہوں جو حشر کے دن اپنے ننھے منے ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو جائیگی اور اللہ سے پوچھے گی کہ مجھے

کس جرم کی سزائیں زندہ گاڑا گیا تھا:

فَبَأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

”بتاؤ مجھے کس جرم میں زندہ گاڑا گیا تھا“

تمہاری صلاحیتوں کو قتل کرنے اور تمہاری شخصیت کی توڑ پھوڑ کر نیوالوں سے بھی ضرور پوچھا جائیگا اور تمہاری صلاحیتوں پر عدم اعتماد کرنے والوں سے بھی پوچھا جائے گا۔ مرد کو انسانیت کی معراج پر پہنچایا گیا ہے، تمہیں ان سے الگ کر کے سوچنا تمہیں قتل کرنے کے برابر ہے۔ اس قتل عام میں ہماری کئی نسلیں شریک رہی ہیں مگر اب ہر ایک کو باور کرانا ہے کہ ہماری بیٹیاں ہمارے مستقبل کی امین ہیں۔ تخلیق کا عمل، ایک نسل کی تربیت کا عمل، معراج انسانیت کا عمل ہے۔

میری بیٹیو!

آگے بڑھو، آئیوالا زمانہ آپکا ہے، آپکے راستہ میں کھڑی ہوئی جہالت کی دیواریں گر رہی ہیں، فرد کی بالادستی کی دیواریں گر رہی ہیں، اب اپنے آپ کو کمزور مت سمجھنا، ناتوانی کا دور ختم ہو چکا ہے۔

اپنے علم، فکر اور سوچ سے دُنیا میں اُجالا کرنے کیلئے خود کو تیار کرو۔ ماں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے، تم اس دھرتی کو بھی جنت میں تبدیل کر سکتی ہو۔ تمہیں گھر کی چار دیواری میں بند کر کے تمہاری صلاحیتوں کی توہین کرنے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اپنے آپ کو علم کی طاقت سے مسلح کر لو اور اپنے فکر کی روشنی کو بلندیوں پر پہنچا دو۔ زمانہ آپکی یلغار کا منتظر ہے، وہ قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی جس کی مائیں علم کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ آدھی آبادی کو قید میں ڈال کر ترقی کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے اور پھر تم تو ایک ایسے دین کی پیروکار ہو جو اس وقت تمہیں علم پھیلانے کی ہدایت کر رہا تھا، جس وقت بیٹیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ عورت کو بھی جائیداد سمجھ کر وراثت میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اس وقت تمہاری وراثت کا حق تسلیم کیا گیا۔ مگر آج تک ہم میں سے کوئی بھی تمہیں تمہارا حق دینے کو تیار نہیں۔ تم میں اتنی سکت

ہونی چاہئے کہ تم اپنا حق چھین سکو۔ بعض مذاہب میں عورتوں کو مجرد رکھ کر ساری زندگی داسی کے طور پر پانن کے طور پر گزارنا پڑتی ہے، لیکن قرآن نے عورت کی زندگی کو رہبانیت کے حوالے کر کے ویرانے میں نہیں ڈالا، اس کی جیتی جاگتی صلاحیتوں کو دفن نہیں کیا۔

یورپ نے سولہویں صدی عیسوی میں عورت کی آزادی کی بات شروع کی لیکن اُس کو دوٹ کا حق 1940ء تک حاصل نہ تھا۔ روسو (Rousseau) اور ولٹیئر (Voltaire) پہلے فلاسفر ہیں جنہوں نے عورت کے حق میں آواز اٹھائی۔

مصر، یونان، ایران اور عربوں کی قدیم تہذیبیں، تمام ناکردہ گناہوں کا بوجھ عورت پر ڈالتی تھیں۔ کمیونزم کے قائم ہو جانے کے بعد بھی روس میں عورتوں کی خرید و فروخت ہوتی رہی۔ لینن (LENIN) نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔ حضور ﷺ اُس معاشرے میں جہاں بیٹیاں زندہ گاڑی جا رہی تھیں، اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر اُن کے استقبال کیلئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

پانچ ہزار سال پہلے موجود اڑو میں ناچنے والی لڑکی کی روح چیخ چیخ کر پوچھ رہی ہے کہ عورت کو دل بہلانے کا کھلونا کب تک سمجھا جاتا رہے گا؟ تم اپنے ہاتھ میں اللہ کی کتاب پکڑ کر جواب دے سکتی ہو!!!۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

ماں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بشری بی بی!

السلام علیکم!

آج اخبار میں پڑھا کہ مجیب الرحمن شامی صاحب کی والدہ محترمہ اس دنیا سے کوچ کر گئی ہیں (انا لله وانا الیہ راجعون) ہم سب انہیں امی جی کہتے تھے۔ اخبار میں جب ان کا نام چھپا تو میں حیران رہ گیا کہ ان کا کوئی اور نام بھی تھا۔ مجھے جیل میں پابندیوں کا احساس رہتا ہے لیکن جب کسی عزیز ترین ہستی کی موت کی خبر ملتی ہے تو یہ درد سوا ہو جاتا ہے۔ امی جی کی موت پر میرا پہلا رد عمل یہ تھا کہ میری ماں کو دوسری مرتبہ موت نے آن گھیرا ہے۔ امی جی عمر رسیدہ تھیں، میں نے ان کی زندگی کے آخری تیس سال دیکھے ہیں۔ ان کے دور پ تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ان کی زندگی کا کوئی رنگ نہیں دیکھا، وہ پہلے بیوی تھیں اور پھر ماں۔

انہوں نے مجھے جتنا پیار دیا، اس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔ صرف اس بات سے اندازہ کر لو کہ میرے کھانے پینے کی عادات کا جتنا علم امی جی کو تھا، اتنا میری والدہ محترمہ کو بھی نہیں تھا۔ امی جی کو معلوم تھا کہ میں گودالے چاولوں میں کتنا بیٹھا پسند کرتا ہوں، کس سالن میں نمک تیز کھاتا ہوں، اور کس سالن میں کم، میرے ان ذائقوں سے میری والدہ واقف نہیں تھیں۔ اس طرح تم جان سکتی ہو کہ وہ کتنا خیال رکھنے والی ماں تھیں۔ ملازمین، رشتہ دار اور غریب لوگوں سے ملنے کا انداز ماں جیسا تھا۔ محترم مجیب الرحمن شامی صاحب سے میرا تعارف 1971ء میں ہوا۔ ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے یہ تعلق بھائی چارہ میں تبدیل ہو گیا۔ مجیب الرحمن شامی سے اس بھائی چارے کی وجہ سے یونیورسٹی سے باہر کی دنیا میں ان کیساتھ آنا جانا بڑھ گیا۔ اسی دوران شامی صاحب کیساتھ ساہیوال میں امی جی کو پہلی مرتبہ

دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک مہربان چہرہ تھا جو میری آنکھوں میں رچ بس گیا۔ امی جی ہم سے ملنے کے بعد فوراً رسوائی میں گھس گئیں اور اُن کی ملازمہ نے اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کھانے کا ذائقہ میں آج تک نہیں بھول سکا۔ امی جی ایک قناعت پسند خاتون تھیں، وہ دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتی تھیں، وہ تمام بچوں سے یکساں پیار کرتی تھیں۔ لیکن مجیب الرحمن شامی کے ساتھ رہنا انہیں پسند تھا۔ حج کے موقع پر جب ان کے میاں محترم صاحبزادہ فیض الرحمن شامی صاحب حج کی بھیڑ میں گم ہو گئے تو انہیں تنہا واپس آنا پڑا، واپس پہنچیں تو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ انہیں اپنے ساتھی کے یوں پکھڑ جانے کا شدید صدمہ تھا۔ مجیب شامی صاحب کو زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع ملے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ قریشی برادران کے ادارے میں ملازم تھے، لیکن ولیمہ کے دن انہیں ملازمت سے فارغ کر دیا گیا، انہوں نے رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس ادارے کے قیام کیلئے بہت سارے دوستوں نے خدمات پیش کیں۔ میری حقیر کوششیں بھی اس ادارے کے قیام میں شامل تھیں۔ معاشی حالات بہتر ہوئے تو شامی صاحب کے والدین ساہیوال سے لاہور منتقل ہو گئے، یوں امی جی سے ملاقاتوں میں تسلسل پیدا ہوا۔ میں نے 1974ء میں یونیورسٹی چھوڑی، 1977ء تک جب لاہور میں ہوتا، تو میرا قیام شامی صاحب کے گھر پر ہوتا۔ اُن کی بیوی طاہرہ بی بی نے میری خدمت بہن بن کر کی۔ 1974ء میں گاڑی کے حادثے کی وجہ سے مجھے اپنے بڑے بھائی سے محروم ہونا پڑا۔ طاہرہ بی بی کی اس حادثے میں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شامی صاحب بیہوش تھے۔ میری اس پریشان حالی کے اس دور میں وہ مخدوم رشید میں ہمارے ہاں رہنے لگے۔ طاہرہ بی بی نیشنل ہسپتال میں زیر علاج تھیں، وہیں ان کے بڑے صاحبزادے فیصل مجیب نے جنم لیا۔

امی جی نے مصیبت کے ان دنوں میں مجھے بے پناہ محبت سے نوازا، میرے مرحوم بھائی کے بڑے بیٹے زاہد بہار کو ہم تعلیم کیلئے لاہور لے آئے، وہ رات دن اس کا خیال رکھتی تھیں۔ جب میں راتوں کو دیر سے گھر آتا تو پورچ میں گاڑی آہستگی سے داخل کرتا۔ امی جی

کے کان میرے قدموں کی چاپ پر لگے ہوتے، وہ پوچھتیں کہ جاویدا تنی دیر سے کیوں آئے ہو تو ان کا سامنا نہ کرنے کی خواہش کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ امی جی آج اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی ساری اولاد ترقی کے عروج پر ہے۔ جواں سال بیٹے رضاشامی کی موت کے علاوہ انھیں زندگی میں بے حد خوشیاں ملیں، اُنکے بڑے بیٹے ضیاء الرحمان شامی، اُن کی بیٹیاں آپاوسیم، آپایاسمین، روبینہ اور شمینہ معاشرے میں اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ صبر و قناعت کا جو عالم ان کی زندگی میں پہلی دفعہ ساہیوال میں دیکھا، وہ آخری دم تک قائم رہا۔ جیل سے رابطہ کر کے ان سے بات کی تو کہنے لگیں جاوید تو ہسپتال سے آ کیوں نہیں جاتا، انھیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ میری بیٹیوں سے بھی بہت محبت کرتی تھیں، نہ صرف میری بہنوں بھائیوں کے حالات، بلکہ ان کی اولاد کے معاملات سے بھی باخبر ہوتی تھیں، ان کی تعلیم میں دلچسپی لیتیں، اُن کی بہتری کا سُن کر خوش ہوتی تھیں۔ ان کی یادیں آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، میں ان کی محبتوں کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن محبت تو بحرِ بے کراں ہے اس کا احاطہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ کبھی اس میں سکوت ہوتا ہے اور کبھی طوفان۔ وہ نوے سال اس دنیا میں رہیں، اس عمر میں جانے پر عزیز واقربا بھی مطمئن ہوتے ہیں کہ ایک بھر پور زندگی گزارنے پر آخر جانا ہی تھا، وہ چلی گئیں لیکن میری آنکھیں اُن کی موت کی خبر سن کر بھیگ گئیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، ہر ایک کو جانا ہوتا ہے، دیر یا سویر! لیکن یہ عجیب بات ہے دنیا کے عظیم شاعروں اور ادیبوں نے ماں کے رخصت ہونے کے درد بہترین ادبی شہ پاروں میں سمویا ہے، باپ کی وفات کا ذکر اس انداز سے نہیں کر سکے۔ ماں خواہ ایک صدی گزار کر جا رہی ہو اُسکے جاتے ہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے ماں کی یاد کی خوشبو چار سو پھیلتی جاتی ہے۔

رات کو سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بلیوں کے بے ہنگم شور نے نیند میری آنکھوں سے اُچک لی، بلی اور اُسکے بچوں پر دو تین باتوں نے حملہ کر دیا تھا، یہ جنگ ساری رات جاری

رہی، ماما کی آواز چیخوں میں بدل گئی اور پھر اُس نے دھاڑنا شروع کر دیا، میں تالہ بند ہونے کی وجہ سے بے بس تھا اُسکی کوئی مدد نہ کر سکا، اُس کی غراہٹ زخمی شیرنی کی گونج میں تبدیل ہو گئی، صبح تالہ کھلتے ہی میں نے جیل ملازم کو چھت پر بھیجا اُس نے خونخوار بلوں کو بھگا دیا، اس دوران اُس کا ایک بچہ مر چکا تھا، اُس نے اپنے بچے کی لاش پر جو آوازیں نکالیں اُس سے ماحول سوگوار ہو گیا۔ وہ بچے کی لاش کے قریب آنے والے ہر فرد پر جھپٹتی تھی، میرے سمیت ہر ایک کو شک سے دیکھتی تھی کہ کوئی اس کا بچہ اٹھا کر نہ لے جائے پھر اُس نے باقی بچوں کو میرے کمرے میں لا کر الماری کے اندر چھپا لیا اور جب کوئی اُس جگہ کے قریب سے گذرتا تو اُسے کھانے کو دوڑتی، کئی روز تک گوشت اور دودھ اُسکے سامنے پڑا رہا وہ اُسکے قریب نہ گئی۔

ماں نہ ہوتی تو خدا اپنی مخلوق کی تخلیق کیسے کرتا۔ ذرا تصور تو کر کے دیکھو، انسان تو انسان، ایک جراثیم پیدا کرنے کیلئے بھی پہلے ماں کی تخلیق ضروری ہے۔ خدا نے ماں کی تخلیق کی اور ماں نے خدا کی تخلیق کردہ روح کو اپنے جسم سے جسم عطا کیا۔ باپ کے بغیر پیدا ہونے کا تصور ایک پیغمبر کے بارے میں موجود ہے مگر بچے کی پیدائش صرف خالق کائنات کر سکتا ہے یا ماں۔

والسلام
تمہارا والد!

شکرم سامانِ موت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بشرای بی بی!

السلام علیکم!

اگرچہ نو گرفتار نہیں ہوں، پھر بھی اپنے ہم سفروں سے دُور تہہ دام تڑپنے پھڑکنے کی توفیق سے بہر مند ہوں۔ دل مرتضیٰ بھی رکھتا ہوں اور سوزِ صدیق بھی۔ آج کل اپنی صحت اور غذا پر بھرپور توجہ دے رہا ہوں۔ روزانہ کئی گھنٹہ سیر کرتا ہوں، شام کو بیڈ منٹن کھیلتا ہوں، خود کو چاک و چوبند محسوس کرتا ہوں۔ میں نے جب سے کھانا آدھا کیا ہے، سوچنے اور لکھنے کی رفتار میں تیزی آگئی ہے۔

جب معدہ ضرورت سے زیادہ بھر جائے تو سوچ کا عمل سست ہو جاتا ہے۔ افراد کی طرح امیر تو میں بھی جب خود کو معاشی طور پر بہت طاقتور محسوس کرتی ہیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ جس طرح ایک بھوکا شخص کفر کے قریب چلا جاتا ہے، اس کی تمام صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح غریب تو میں بھی جہالت اور بیماریوں کا مریع بن جاتی ہیں۔ صرف متوازن معاشی ترقی کسی فرد یا قوم کی صحت کی ضمانت دیتی ہے۔

آج صبح سیر کرتے ہوئے میں نے ذیکھا، بلی کے منہ سے کوا گوشت کا ٹکڑا چھین کر بھاگ گیا۔ دراصل بلی کا پیٹ بھر چکا تھا اور وہ کوئے کے حملے کو روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ کوئے کی بھوک نے اسے ہر قسم کے خطرے کا سامنا کرنے کیلئے تیار کیا۔ قوموں کی زندگی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ دنیا پر حکمرانی کرنے والی قومیں آرام پرستی کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گئیں۔ ان کی طاقت، جلال و حشم کو وقت کی دیمک نے چاٹ لیا۔ تاریخ عالم پر اُچھتی نظر ڈالیں تو عجیب قسم کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

زیادہ دور کی بات نہیں، ماضی قریب کے چار ملک ایسے ہیں جو دنیا کے بیشتر حصوں پر

حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ ان میں سنٹرل ایشیاء، ترکی، برطانیہ، اور روس کا تذکرہ بر محل ہوگا۔ افغانستان کے حکمران مفتوحہ ممالک خصوصاً برصغیر ہندوپاک سے بے پناہ دولت اپنے ملک میں لے گئے تھے، مگر آج منگولیا اور افغانستان دنیا کے پسماندہ ترین ملک بن چکے ہیں۔ اس مال و دولت کا کیا ہوا؟ اسی طرح ترکی کی سلطنت عثمانیہ میں ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بیشمار ملکوں کی دولت تھی۔ آج حالت یہ ہے کہ یورپی یونین کمزور معیشت کی وجہ سے اسے اپنا رکن بنانے پر آمادہ نہیں۔ برطانیہ نے امریکہ، کینیڈا، چین، ہندوستان سمیت اکٹھے ملکوں پر اپنا سکہ چلایا۔ دوسری جنگ عظیم یعنی 1944ء تک دنیا کی قسمت کے فیصلے لندن میں ہوتے تھے، مگر صرف تیس سال کے اندر اندر یعنی 1974ء میں برطانیہ والوں کی غربت کی وجہ سے یورپی دنیا کے ممالک انہیں اپنے ہاں مزدوری کیلئے ویزا دینے کو تیار نہیں تھے۔ اسی طرح روس کی عظیم طاقت تو تمہارے سامنے تحلیل ہوئی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کے اہم فوجی عہدیداروں کو ماسکو اور پیٹرز برگ کی سڑکوں پر کھڑے بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ وہاں کے لوگ روٹی کے ٹکڑوں کیلئے ترس رہے ہیں۔ یہ برطانیہ کی خوش قسمتی ہے کہ 1976ء میں وہاں کے سمندروں سے تیل نکل آیا۔ قدرت اگر ان کی امداد نہ کرتی تو آٹھ سو سالہ دور حکمرانی ان کی نسلوں کو بھوک کی سوغات کے علاوہ کچھ بھی تو نہ دے سکتا۔ آج کی عظیم طاقت امریکہ ہے۔ تمام دنیا اس کے فیصلوں سے متاثر ہوتی ہے۔ امریکہ کا پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر گیا ہے، سوچنے کے عمل میں کمی آچکی ہے۔ تاریخ اپنے آپکو بار بار دہراتی ہے، کیا امریکہ کو اس عمل سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے؟ آثار اچھے نہیں خدا خیر کرے۔

والسلام!

تمہارا والد!

روشنی کا دریچہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

22 فروری 2006ء

بشری بی بی! السلام علیکم!

آج محستہوں کے حضور پیش ہونا تھا، دن جلدی شروع ہو گیا، آنکھ کھلی تو کونل کی کوک سنائی دے رہی تھی، میں نے صبح کی سیر کی اوز تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈیوڑھی کے ملازم نے آکر کہا کہ "گارد" پہنچ گئی ہے۔ میں دروازوں اور تالوں کو کھلتے اور بند ہوتے دیکھتا رہا۔ حصارِ بام و در سے باہر آیا تو گاڑیوں کی لمبی قطار موجود تھی۔ ڈور تک وردیاں ہی وردیاں، ٹوپیاں ہی ٹوپیاں نظر آرہی تھیں۔ ہر وردی والا مسلح تھا، بندو قوں کی چھاؤں میں یہ قافلہ عدالت کی طرف روانہ ہو گیا۔ وائرلیس سیٹ پر آواز گونجی "مہمان روانہ ہے"۔

جیل میں تھا تو اپنے گھر میں تھا اور پہرے داروں کے بدلتے ہی میں مہمان بن گیا تھا، زبردستی کا مہمان تو سنا تھا، زبردستی کے میزبان یہاں آکر دیکھے۔ دراصل یہ پولیس کی خفیہ زبان ہے، اسے استعارہ کی زبان بھی کہا جاسکتا ہے۔ اہم شاہراہوں پر ٹریفک روکنے کے احکامات جاری ہونے لگے۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس آفیسر نے کہا! سر جب آپ بطور وزیر لاہور آتے تھے تو آپ کو پروٹوکول کی ایک گاڑی ملتی تھی۔ اس وقت سات گاڑیاں اور سو کے قریب پولیس والے آپ کے جلوس میں شامل ہیں، وہ مجھے میری اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جیل سے باہر نکلا تو دائیں طرف کے کھیتوں میں قیدیوں کو آلو کی فصل برداشت کرتے دیکھا۔ بائیں جانب گندم کی فصل سے خوشہ گندم سر نکال رہا تھا، خمار گندم نے منظر کو دو آتشہ کر دیا، میں نے فضا میں قلابازی لگائی اور اپنے کھیت کنارے پہنچ گیا لیکن وائرلیس کی آوازوں نے مجھے واپس بلا لیا۔ ہم سبزی منڈی سے گزر رہے تھے۔ قریبی گاؤں کے کسان

گدھا گاڑیوں اور نیل گاڑیوں میں پھل، سبزیاں اور جانوروں کیلئے چارہ لئے بیچاریگی کیساتھ بیٹھ ہوئے تھے، ان کے چہرے کی ہڈیوں پر ماس نہیں تھا، تن ڈھانپنے والے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کھیلے تھے۔ پولیس والے انہیں غصیلی نظروں سے دیکھتے تو وہ لجاجت سے عرض حال بیان کرتے نظر آتے، جیسے کہہ رہے ہوں معاف کر دیں، ہماری روزی کا سوال ہے، یہ ساری گفتگو اشاروں کنایوں میں ہو رہی تھی۔ بالا دستوں کے چہرے کے خوفناک زاویے زیر دستوں کی جھکی ہوئی نگاہوں کے آر پار ہو رہے تھے۔ بے زبانی زبان بنی ہوئی تھی۔ مجھے ان میں اپنے گاؤں کے ہر کسان کا عکس نظر آنے لگا اور پھر دنیا کے تمام کسانوں کی بے بسی اور بیچاریگی میرے سامنے تھی۔ انکی ترجمانی کا دعویٰ کرنے والے چہرے بھی سامنے آگئے، جو ان کا نام استعمال کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

ہم آگے بڑھے تو ایک موچی جوتے چکار ہاتھا۔ اسکی چار پانچ سال کی دو معصوم بچیاں سامنے کھڑی تھیں، ان کے تن پر پھٹے ہوئے کپڑے تھے اور ان کے چہرے بھی ہڈیوں کے ڈھانچے تھے، ان کے بال خاک آلودہ تھے، وہ آئیو الے وقت کی پرچھائیوں سے بے خبر تھیں، ان کے والد نے انہیں دو مالٹے تھمائے اور وہ خوش ہو گئیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ان کی ہم عمر بچیاں خوبصورت نیلی وردیاں زیب تن کئے سکول کی طرف رواں دواں تھیں، دو چھوٹے چھوٹے بچے گدھا گاڑی چلاتے ہوئے تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے۔ چھوٹے بچوں کی مشقت کو روکنے والی تنظیمیں اگر اس چوک میں آکر ان بچوں کے حالات کو دیکھیں تو انہیں اپنی کارکردگی کا اندازہ ہو جائے گا۔

جب ہم عدالت کے احاطے میں پہنچے تو پولیس کی مزید قطاریں میری منتظر تھیں۔ ڈیڑھ منٹ کی عدالتی کارروائی کے بعد ہم فارغ تھے۔ جج صاحب نے مجھے چند دستوں اور عزیزوں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ ہماری پارٹی کے سرکردہ راہنما اور انجمن شہریان لاہور کے صدر اور بزرگ سیاستدان رانا نذیر الحسن تشریف لائے۔ وہ ملکی حالات پر آزرده تھے، جماعتی معاملات پر بھی بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ

حالات کی سنگینی کے باوجود مجھے مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ اگر چند راہنما قربانیاں دینے کیلئے آگے آئیں تو قوم ان کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہے اور اگر قیادت نے حالات کی نزاکت کو نہ سمجھا تو لوگ خود قیادت سنبھال لیں گے۔ سیاسی بحرانوں سے قیادت جنم لیتی ہے۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور "مہمان" اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

واپسی پر ہمارا کارواں قینچی امرسدھو کے قریب ٹریفک میں پھنس گیا، ریڑھیوں، بیل گاڑیوں، ٹرالیوں اور ٹرکوں کے اژدھام میں موٹر سائیکلوں نے بھی دخل در معقولات کو اپنا حق سمجھ لیا۔ میرے سامنے ایک بھاری بھر کم شخص، جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھا تھا، موٹر سائیکل پر سبز چارہ لدا ہوا تھا اور دونوں طرف دودھ کے ڈبے لٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا اس شخص کو اتنا بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں اس کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے اپنی آزادی کی قربانی دے رہا ہوں، نہ ہی ارد گرد کے لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ میں کون ہوں؟ ایک دم موٹر سائیکل والے شخص نے میری طرف دیکھ کر انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا اور مسکرا کر ہاتھ ہلانے لگا گویا وہ مجھے احساس دلارہا تھا کہ میں نے اپنی قوم کے سیاسی شعور کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے انصاف نہیں کیا۔ میں اپنی اس سوچ پر شرمندگی محسوس کرنے لگا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، حصارِ ذات میں روشنی کا دریچہ کھل گیا، میں ایک اور دنیا میں پہنچ گیا، اندر کی دنیا جس میں ضمیر کی حکمرانی ہے۔ نہ وہاں بندوتوں کا سایہ ہے اور نہ ہی بام و در کا حصار، جہاں آزادی ہی آزادی ہے۔ میں اُس موٹر سائیکل والے شخص کا شکر گزار ہوں جسکی مسکراہٹ مجھے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کی چمک مجھے اپنی منزل کا پتہ دیتی ہے۔

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

سیکولر ازم اور اسلام

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

6 جنوری 2006ء

بشی جی! السلام علیکم!

تم نے پوچھا ہے کہ سیکولر ازم اور لبرل ازم کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں؟
اسلام اور سیکولر ازم میں کیا فرق ہے؟ اور ہندوستان کے سیکولر ازم، لبرل ازم اور جمہوریت
کے بارے میں میری کیا رائے ہے؟

سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام کے سوا
کچھ نہیں مگر حکمرانوں نے ہمیشہ اسلام کو صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے حالانکہ
اسلام حکمرانوں کا نہیں عوام کا مذہب ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان پر
برطانیہ کی نوآبادیات کے لئے تربیت یافتہ انتظامیہ چھائی ہوئی ہے۔ وہ اسلام کے بنیادی
نظام کو پرانے وقتوں کی چیز سمجھتی ہے اس نے اسلام کے علاوہ ہر نظام کا تجربہ کر کے پاکستان
کو ایک تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج کل سیکولر ازم فوجی حکمرانوں کے سیاسی ایجنڈے
پر سرفہرست ہے۔ پچھلے فوجی دور میں اسلام کا نام استعمال کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ
امریکہ اس وقت اسلام کے ذریعے روس کو شکست دینا چاہتا تھا۔ اس لئے ہمارے حکمران
بھی اسلام کے نفاذ میں ”مخلص“ نظر آتے تھے۔ آج امریکہ اسلام کو شکست دینے کے لئے
سیکولر ازم کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ لہذا ہمارے حکمران بھی سیکولر ازم کو تمام مسائل کا حل قرار
دے رہے ہیں۔ جس طرح کا سیکولر ازم ہمارے حکمران لارہے ہیں یورپ میں اسے انتہا
پسندوں کا سیکولر ازم سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے مغرب زدہ طبقے اپنی بے راہ روی کو بھی سوشلزم
اور کبھی سیکولر ازم کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں انہیں سوشلزم یا سیکولر ازم کے مقاصد
سے کوئی غرض نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں اسلام کو میانہ روی کا مذہب کہا گیا ہے وہ یکسر نہ تو

سوشلزم کو مسترد کرتا ہے اور نہ ہی سیکولر ازم کو۔ وہ صرف سوشلزم اور سیکولر ازم کی انتہا پسندی کے خلاف ہے۔ اسلام تو ہر نئے علم کو سیکھنے کی تلقین کرتا ہے اور اچھی سوچ کا خیر مقدم کر کے اسے مومن کی گم شدہ میراث کہتا ہے۔

تمہارے سوالوں کا مختصر جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ اسلام زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ حیات ہے۔ سیکولر ازم معاشرتی آزادیوں کی تحریک ہے۔ ہندوستان کی جمہوریت لبرل ازم اور سیکولر ازم ایک ایسا گورکھ دھندہ ہے جس پر موروثیت، رام راج اور ذات پات کی چھاپ نمایاں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ چند ابتدائی معلومات کے ذریعے اپنی بات واضح کر سکوں۔

اسلام اور سیکولر ازم میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں مذہبی رواداری اور برداشت میں یقین رکھتے ہیں دونوں پاپائیت اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ہیں دونوں انسان پر انسان کی بالادستی کے خلاف ہیں اور معراج انسانیت میں یقین رکھتے ہیں۔ بنیادی اختلاف یہ کہ اسلام ضابطہ حیات پر عمل درآمد کیلئے ریاست کا قیام عمل میں لاتا ہے جبکہ سیکولر ازم ریاست کی بنیاد کے لئے کسی نظریے کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ تمام معاملات افراد کی منشاء پر چھوڑ دیتا ہے۔ مغربی سیکولر ازم اب نائیجیریا، ایران، لبنان اور فلسطین میں عوام کی جمہوری فتح کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ وہ مسلمان ملکوں میں فرد واحد کی حکمرانی کا محافظ بن گیا ہے۔ مسلمان بھی جمہوریت کو سیکولر ازم کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ سمجھ کر بادشاہت اور آمریت کو قبول کر چکے ہیں حالانکہ جمہوریت نے اپنے سفر کا آغاز پانچ ہزار سال پہلے یونان سے کیا تھا۔ اس طرح کے رویے سے گویا مسلمانوں اور عیسائیوں نے سیکولر ازم مخالف قوت کا روپ دھار کر بنیاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

سیکولر ازم کی بنیادی تعریف مذہبی امتیاز کی بناء پر سیاست نہ کرنا ہے۔ پاپائیت کے محدود مذہبی تصور نے عیسائیت کو خون میں نہلا دیا تھا۔ آرتھوڈوکسی، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں بٹے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے لاکھوں کی تعداد میں ایک

دوسرے کو قتل کیا۔ ہزاروں بستیاں اور شہر اجاڑ دیئے گئے۔ ان المناک داستانوں نے سیکولر ازم کو مذہب مخالف نظریہ کا رنگ دے دیا۔ اسلام میں بھی احناف نے خود کو مذہب حنفیہ کا پیروکار کہا اور مذہب حنفیہ دارم ملت حضرت خلیل کا نعرہ بلند کیا۔ اہل تشیع نے ملت جعفریہ کے طور پر خود کو متعارف کرانا بہتر سمجھا۔ اسلامی مفکرین نے مذہب کے اس محدود تصور کو رد کر دیا۔ علامہ اقبال نے مذہبی تنگ نظری کے خلاف جنگ لڑی اور مذہب کی بجائے دین کے پرچم کو سر بلند رکھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

جدا ہو دین سیاست سے
تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

سیکولر ازم فرد کی آزادی کو اہمیت دیتا ہے اور ریاست کو ان آزادیوں کا محافظ قرار دیتا ہے۔ یورپ کے ریئے سانس (Renai Ssance) جدیدیت یا نشاۃ ثانیہ میں اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ پاپائیت کے بوجھ تلے دبا ہوا جاں بلب یورپ سیکولر ازم کی بیساکھیوں کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب اب مذہب کے مدرسے سے بھاگا ہوا ایسا بچہ ہے جو سمجھتا ہے کہ اگر اسے مذہب کے مدرسے میں واپس لایا گیا تو اس کی آزادی زنجیروں میں جکڑ دی جائے گی حالانکہ مذہب دنیا کی اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ناممکن ہے پوری دنیا مذہب کی گرفت میں ہے۔ عیسائیت، اسلام، ہندومت، یہودیت، بدھ مت، جین مت، سکھ، پارسی سب کے سب صدیوں سے خدا کو مانتے چلے آ رہے ہیں یا خدا ان سب سے خود کو منوار ہا ہے۔

اسلام واحد مذہب ہے جو ریاست کا نظام قائم کرتا ہے اور زکوٰۃ عشر خمس اور دیگر معاشی اقدامات کے ذریعے ذرائع آمدنی میں غریبوں کو بطور استحقاق حصہ دار بناتا ہے اور ان کا حق کھانے والوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ سیکولر ازم اسلام کے اس نظریے سے متصادم نہیں ہے نہ سیکولر ازم اپنی آزادی کے لئے جانیں دینے والوں کو دہشت گرد کہتا ہے بلکہ وہ دنیا بھر کے آزادی پسندوں کی حمایت کرتا ہے۔ عراق پر حملے کے خلاف دنیا بھر میں

کرڈوں انسانوں نے مظاہرے کئے خاص طور پر امریکہ اور یورپ کے سیکولر طبقے نے جتنی شدت سے اس حملے کو مسترد کیا اسلامی دنیا اس کا عشرِ عشر بھی نہ کر سکی۔

میری دانست میں سیکولر ازم کوئی نظر یہ نہیں بلکہ یہ صرف ایک تحریک ہے، جس کا اسلام سے براہ راست کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ یہودیوں نے اسے اپنے تحفظ کے لئے استعمال کیا ہے، مغرب نے مادرِ پدر آزاد معاشرے کے لئے، ہندو نے تقسیم در تقسیم قوموں اور علاقوں والے خطے ہندوستان کو ایک رکھنے کے لئے، مسلمان علماء نے تبلیغِ دین، اور کیمونسٹوں نے اپنے نظریے کو پھیلانے کے لئے۔ سیکولر ازم کو مسلمانوں کے بہترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ آزاد فضا میں حقیقت کے اظہار کا ماحول میسر آتا ہے، جسکے پاس سچائی ہوتی ہے اُسے اپنے نظریے کو پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔ تمہیں یہ بات عجیب لگے گی کہ پاکستان کے علماء سیکولر ازم کے سخت خلاف ہیں، مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو سیکولر ازم کی چھتری نے پناہ دے رکھی ہے۔ وہاں کے مسلمان علماء سیکولر ازم کے حق میں ہیں جب کہ ہندو پنڈت سیکولر ازم کے خلاف اور رام راج کے مذہبی فلسفے کے حق میں ہیں۔ تمہیں یہ بات اور بھی عجیب لگے گی کہ ہندوستان سیکولر ازم کے نام پر بنا، مگر وہاں پر حکومتیں رام راج کے نام پر بننے لگی ہیں۔ پاکستان ایک نظریے کی بنا پر معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن پاکستانی عوام نے ہمیشہ معاشی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے کے دعویداروں کو حق حکمرانی سے سرفراز کیا۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ دُنیا کی سب سے بڑی سیکولر سٹ جمہوریت میں ایک ہی خاندان کی پانچ نسلیں حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، سنجے گاندھی، سونیا گاندھی اور اب راہول گاندھی کانگریس کے صدر یا ملک کے وزیرِ اعظم رہے ہیں یا امیدوار ہیں۔ آج کے جمہوری دور میں دُنیا میں کسی اور ملک میں اس طرح کی مثال موجود نہیں۔ نہرو کی بیٹی نے ایک پارسی فیروز گاندھی سے شادی کی اور قائدِ اعظم کی بیٹی کا انتخاب بھی ایک پارسی تھا۔ قائدِ اعظم کی بیٹی زندہ ہے۔ اس کے بچے جو قائدِ اعظم کے نواسے ہیں۔ اس دنیا میں موجود ہیں۔ قائدِ اعظم نے

انہیں اپنا جانشین بنایا اور نہ ہی مسلم معاشرے نے انہیں قبول کیا۔ ایوب کا بیٹا گوہر ایوب بھی جانشین نہ بن سکا۔ یحییٰ کے بیٹے موجود ہیں، اسی طرح ضیاء الحق کا بیٹا بھی سیاست میں دھکے کھا رہا ہے۔ البتہ ذوالفقار علی بھٹو کی جان کی قربانی نے بے نظیر کیلئے سیاست کا دروازہ کھولا۔ پاکستان کے عوام نے جمہوریت کی طویل جنگ لڑی ہے اور ہتھیار نہیں پھینکے۔ قائد اعظم نے پاکستان کی اساس اسلامی نظریے کو قرار دیا، مگر انہوں نے بارہا اپنی تقاریر میں کہا کہ پاکستان کے آئین اور قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں اور مذہب کی بنا پر ان سے امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔ قائد اعظم بخوبی جانتے تھے کہ سیکولر ازم اور اسلام میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

اب میں تمہیں بتانے کی کوشش کروں گا کہ مسلم معاشرے میں سیکولر ازم کا کیا مقام ہے؟ درحقیقت، مغرب میں پاپائیت کے خلاف صدیوں پر مشتمل تحریک کو سیکولر ازم کا نام دیا گیا۔ مذہب کے نام پر حکومت کرنے کا فائدہ عیسائیوں کے گلے میں پڑا ہوا تھا، وہ انہوں نے اتار پھینکا۔ ہمارے علماء اور مفکرین نے سیکولر ازم کے خلاف کلیسا کی شکست کو مذہب کی شکست سمجھا، حالانکہ، کلیسا سے نجات کے بعد یورپ کے لوگوں نے نظری اور فکری آزادی حاصل کر لی اور انہیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ ان پر دنیا کے دروازے کھلنے لگے۔ معاشی نظریات کو انسانی زندگی سدھارنے کا موقع میسر آیا، سائنسی دریافتیں ہونے لگیں۔ جس معاشرے میں زمین گول ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں وہاں کے سائنسدان دعویٰ کرنے لگے کہ وہ مذہبی رہنماؤں سے زیادہ خدا جانتے اور مانتے ہیں۔

یورپ اور مغربی ممالک سیکولر ازم کے خلاف ہونے والی ہر بات کو جہالت سمجھتے ہیں اور کسی حد تک وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ لیکن جن نظریات کو مغربی قومیں انسانی ترقی کی بنیاد سمجھتی ہیں وہ اسلام سے ہرگز متصادم نہیں ہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ سیکولر ازم نے اسلام کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔ وہ انسانی معاشرے کو آزاد رویوں کی تلقین کرتا ہے۔ اس آزادی کا سب سے زیادہ فائدہ اسلام کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ جہاں پر شعور بیدار ہو وہاں پر اسلام کے نظریات کو پھیلانے کا دریچہ کھلتا ہے۔ آزاد ماحول میں اسلامی نظریات کی تبلیغ اور

تروج میں آسانی ہوتی ہے۔ میں بار بار پوچھتا رہتا ہوں کہ تبلیغی جماعت کا اجتماع سعودی عرب میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ طالبان کی اسلامی حکومت نے انہیں افغانستان میں کیوں گرفتار کیا تھا؟؟ یہ اجتماع ہندوستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، برطانیہ، اور امریکہ میں کیوں ہوتا ہے؟؟؟ درحقیقت، جس نظام میں لوگوں کے اجتماع سے خطرہ محسوس نہیں کیا جائیگا وہی اسلام ہے۔ اجتماع پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔

سیکولر ازم مذہب اور مذہب کی تبلیغ کے خلاف نہیں، بلکہ وہ آزادی اظہار کا زبردست حامی ہے۔ اسی آزادی کی وجہ سے مسلمان علماء کو مغربی معاشرے میں دین اسلام پھیلانے کا حق حاصل ہے۔ سیکولر ازم ریاست کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ لوگوں پر اپنا مذہب مسلط کرے۔ وہ لوگوں کو یہ حق ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے دین کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے قانون نافذ کریں۔ سیکولر ازم اسلام نہیں مگر اُسے لادینیت کے ہم پلہ قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ اسلام بھی اپنے نظام کو ریاست میں رہنے والی اقلیتوں پر جبراً مسلط نہیں کرتا۔ ریاستی مداخلت کی حدود کو متعین کر دیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست مدینہ روئے زمین کی پہلی ریاست تھی جس نے اقلیتوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر تسلیم کیے۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ریاست کے باہر کے مسلمانوں کے حقوق مقامی اقلیتوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اس کے مقابلے میں آج بھی دنیا کی کئی حکومتیں ہیں جن میں ہر شہری کو عیسائی نام لازمی طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ میں برازیل گیا تو وہاں ایک عجیب واقعہ دیکھنے کو ملا۔ پاکستان کے ایک سفارتی اہلکار کی بیٹی پیدا ہوئی، اس کی بیوی کو (57) ستاون روز تک ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ ان پر دباؤ تھا کہ وہ بچی کا عیسائی نام رکھیں۔ سفارتکار کا موقف تھا کہ میں برازیل کا شہری ہوں اور نہ اس ملک کی ملازمت میں ہوں۔ بڑی مشکل سے اس کا موقف تسلیم کیا گیا اور اس نے بچی کا اسلامی نام رکھا۔

سیکولر ازم سے پہلے عیسائی، آتش پرست یا رومی کسی مخالف مذہب رکھنے والوں کو اپنے

ملک میں نہیں رہنے دیتے تھے، بلکہ وہ جس شہر یا علاقے کو فتح کرتے، وہاں سے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یا تو تہ تیغ کر دیتے یا انہیں دور دھکیل دیتے۔ یہ شرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک عراق، شام، سعودی عرب اور فلسطین میں عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ بلکہ سات سو سال تک یہودیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہیں ہسپانیہ، اندلس، استنبول (ترکی) ایران اور مصر میں تھیں۔ یہاں انہیں عیسائی ملکوں کی نسبت نہ صرف مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم نے کہا تھا کہ وہ شہر شہر نہیں کہلا سکتا جس میں یہودیوں کی آبادیاں نہ ہوں۔ یہودی اسلام کے ان احسانات کا اپنی کتابوں میں برملا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک گھر میں دیوار پھاند کر داخل ہو گئے، گھر کے مالک نے انہیں کہا کہ آپ کو اس طرح آنے کی اجازت شریعت نے نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے صحابی کا موقف تسلیم کر لیا۔ سیکولر ازم انفرادی آزادی کا دعویدار ہے۔ اسلام تو ہے ہی مذہبی اور انفرادی آزادی کا محافظ، البتہ، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ جس طرح پاکستان اور ہندوستان میں سیکولر ازم کے معنی مختلف ہیں۔ اسی طرح یورپ اور دیگر ممالک میں اسکی تشریح مقامی حالات کے مطابق کر لی گئی۔ ہندوستان کے لوگوں کا ذہن ابھی تک راجکماروں کے تصور سے آزاد نہیں اور نہ ہی سیکولر ازم وہاں پوری طرح رائج ہو سکا اسی لئے ہندوستان دنیا کے معاملات میں بنیادی کردار ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔

پاکستان کا وجود ہی نظریہ سے وابستہ ہے۔ اس لئے مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے اہتمام کرے۔ اگر اس نظریہ کو پاکستان کے وجود سے نکال دیا جائے تو بنیاد ختم ہو جائیگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کی مغربی معاشرت دوسری انتہا پر پہنچ گئی ہے۔ وہ سیکولر ازم یا لبرل ازم کے نام پر فرد کی آزادی کو معاشرے کے اجتماعی ضمیر پر ترجیح دیتی ہے۔ اس طرح کی بے لگام آزادی کو معاشرے قبول کرنے لگیں تو تاریخ گواہ ہے۔ وہ اجتماعی خود کشی کے انجام کو پہنچ

جاتے ہیں۔ یورپ کی اقوام تسلیم کرتی ہیں کہ جب یورپ تاریک دور (DARK AGES) سے گذر رہا تھا تو مسلمان انسانیت کی فکری اور عملی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ ہسپانیہ کی ترقی کی چکا چوند سے یورپ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں تھیں، جسکی وجہ سے لوگوں نے ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے والے نظام کا جو اء اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔

اب جبکہ مغربی اقوام نے آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا ہے اُنکی ترقی معکوس کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ معاشرتی بد نظمی کا دور دورہ ہے۔ وہاں کی مائیں اب بچے نہیں جننا چاہتیں اور باپ اُنہیں پالنے سے انکاری ہیں، تخلیق کے اس عمل سے جانور بھی گریزاں نہیں ہیں۔ آزادی کا عمل جب انسان کو فطرتی تقاضے پورے کرنے سے روک دے، تو اُس نظام کی ناکامی یقینی ہے۔ یہ سیکولر ازم کا منفی پہلو ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، سیکولر ازم کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے، اس سے خائف ہونے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔ ہمارے علماء یورپ اور امریکہ میں داخل ہوتے ہی اسی سیکولر ازم کا فائدہ اٹھا کر اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں اب سیکولر ازم کمزور ہونے لگا ہے۔ معاشرے پر بنیاد پرستی غالب آرہی ہے۔ اب وہ اپنے مذہب کو بنیاد بنا رہے ہیں۔ آنے والے وقت میں اگر یورپ اور امریکہ سیکولر ازم کے اصولوں پر قائم نہ رہے تو وہاں کی مسلم آبادیوں کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، مگر اس کا سب سے زیادہ نقصان مغربی معاشروں کو ہوگا۔ اب پوری دنیا ایک بڑے گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور اس میں رہنے والے زندگی گزارنے کے لئے اپنے اپنے طریقے اپنائے ہوئے ہیں جنہیں تبدیل کرانا آسان نہیں۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ قربتیں بڑھنے کی وجہ سے بالآخر وہی طریقہ حیات زندہ رہے گا جو انسان کی بالادستی تسلیم کرے گا۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام ہی وہ ضابطہ حیات ہے۔ سیکولر ازم کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنی سوچ دوسرے پر مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام بھی انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

لَا اِكْرَهَ فِي الدِّينِ لِيَعْنَى دِينَ زَبْرَدَسْتِي مُسَلِّطٌ نَحْنُ كَمَا جَاءَ سَلْطَا۔

ایسا فلسفہ جدید معاشرے کی بنیاد بن سکتا ہے جس میں تمام مذاہب کے زندہ رہنے کی ضمانت موجود ہو۔ قرآن نے حتمی فیصلہ دے دیا کہ تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین۔ یہی جیو اور جینے دو کا وہ زریں اصول ہے۔ جس پر قائم رہ کر دنیا کو امن کا گہوارا بنایا جاسکتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سیکولر ازم لبرل ازم اور جمہوریت کا پرچار کرنے والا امریکہ بنیاد پرستی کا شکار ہو گیا ہے وہ کروسیڈ (مذہبی اور صلیبی جنگیں) لڑنے کا اعلان کرتا ہے وہ امریکہ جو دنیا بھر میں سیکولر ازم اور جمہوریت کا حامی ہونے کی وجہ سے ماضی میں محکوم قوموں کی آزادی کی جنگوں کی حمایت کرتا رہا ہے۔ آج عراق فلسطین، کشمیر، لبنان اور افغانستان میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کو خودکش بمبار اور دہشت گرد کہہ کر سیکولر ازم اور جمہوریت کا مذاق اڑا رہا ہے کل تک جو امریکہ کے نزدیک مجاہدین آزادی (Freedom Fighters) تھے آج امریکہ کی بنیاد پرستی کا شکار ہیں۔

میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ ایک طویل موضوع ہے اور رات بھی گہری ہو گئی ہے پھر کبھی موقع ملا تو اس پر مزید گفتگو کریں گے۔

والسلام!

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی!

کوے کی لاش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

2 مارچ 2006ء

بشو بی بی!

استلام علیکم! مزاج بخیر!

کل مارچ کی پہلی تاریخ تھی، موسم بہار جو بن پہ تھا۔ صبح سویرے تالہ کھلنے کی آواز آئی تو میں لپک کر باہر آ گیا۔ ابھی دُھند لکا سا تھا اور ہوا میں بھی خاصی خنکی تھی۔ مسبری کے پھولوں کی آنکھیں نیم وا ہو چکی تھیں، یہ پھول سورج نکلنے کے ساتھ جاگ جاتے ہیں اور سورج غروب ہوتے ہی پتیاں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر سو جاتی ہیں، ان پھولوں کو بچوں کی طرح جلد سونے کی عادت ہے۔ چند قدم آگے چلا تو سامنے کوے کی لاش پڑی تھی۔ ٹھنیوں پر اس کے عزیز واقربا گم گم بیٹھے تھے، جونہی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو انکے شور سے ایک حشر بپا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر اس کی لاش اٹھالے جانا چاہتے تھے۔ ایک قیدی نے وہ لاش اٹھائی تو غول نے اُس پر حملہ کر دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ یہ اس مردہ کوے سے اپنائیت کا اتنا ظہار کیوں کر رہے ہیں۔ جب لاش پھینکی جا رہی تھی تو وہ ایک بھاری جنازے کا منظر تھا۔ لاش دفن کرنے کا طریقہ سکھانے میں تو کوادیسے بھی انسان کا استاد ہے۔ مجھے ایک اور کوے کی لاش یاد آگئی جو کسان اپنے کھیتوں میں کسی اونچی جگہ پر ٹانگ دیتے ہیں، تاکہ زندہ کوے اسکے عبرت ناک انجام سے سبق حاصل کریں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ کوے اس کھیت کے قریب نہیں آتے۔

انسانوں، پرندوں، درندوں اور جانوروں کی بہت سی عادات ایک دوسرے سے کافی قریب ہیں۔ دورِ حاضر کا انسان درندگی کو کامیابی قرار دینے پر تولا ہوا ہے۔ صبح کے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر دل بچھ سا گیا کہ شمالی وزیرستان میں بیسیوں انسانوں کو اپنی فوج نے تہ تیغ

کر دیا۔ ان بستیوں میں رہنے والوں کا جرم کیا تھا۔ معصوم بچے، عورتیں، بوڑھے سب راگھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے، انسانی درندگی کے اس مظاہرے پر زمین پھٹ کیوں نہیں گئی۔ انسان اتنی جلدی "ثم رَدَدْنَهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْن" کے مقام پر کیوں پہنچ جاتا ہے۔

3 مارچ یعنی کل امریکہ کے صدر بُش نے چند گھنٹے کیلئے پاکستان آنا ہے۔ فوجداروں نے اپنے آقا کو پچاس جانوں کا بلیڈ ان پیش کیا۔ گذشتہ چھ سال کی حکمرانی میں ہمارے فوجیوں نے وطیرہ بنا لیا ہے کہ وہ امریکہ جائیں یا امریکہ سے کوئی آقا پاکستان آئے، لوگوں کو ہلاک کر کے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ دہشت گردوں کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا، دوسرے دورے کیلئے نئی کھیپ تیار کر لی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا خونچکاں سلسلہ ہے جو بند ہونے کو نہیں آرہا۔ فوجی حکمران اس طرح دور اقتدار کی سند حاصل کر لیتے ہیں اور وردی کی صورت میں خلعت فاخرہ بھی۔ جس طرح روم کے جرنیل انسانوں کو شیروں کے پنجرے میں ڈال کر ان کی خوفناک چیخوں سے تفسن طبع پیدا کر لیتے تھے اور اپنے بادشاہوں سے داد بھی وصول کرتے تھے۔ ہمارے فوجدار بھی یہ خونی کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

امریکہ نے افغانستان اور عراق کو خون میں نہلا دیا۔ اب ایران اور پاکستان کی باری ہے۔ امریکہ اس مقصد کیلئے ہندوستان اور اسرائیل کو فطری حلیف سمجھتا ہے، ان کے ذریعے وہ اس خطے کے قدرتی وسائل پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ اب تک اُسے شدید ناکامیوں کا سامنا ہے، سادہ ایشیا میں وسائل پر قبضے کا خواب چکنا چور ہو رہا ہے۔

انسانی تاریخ میں لاشوں کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ فاتحین لاشوں کے مینار بناتے رہے ہیں۔ تاکہ ان کا خوف محکوموں پر طاری ہو جائے۔ کچھ لاشیں درسِ عبرت بن گئیں اور کچھ لاشیں منارہ نور بن کر تاریخ کے زریں صفحات پر زندگی کی علامات بنیں۔

امام حسین علیہ السلام، سقراط، منصور حلاج، عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو موت بھی نہیں مار سکی۔ دُنیا کی چھ ارب آبادی میں سے چار ارب کو یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں۔ پھانسی کا پھندا اُنکا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

فرعون کی لاش دریائے نیل کی موجیں بھی نہ نگل سکیں۔ خدائی کا دعویٰ کر نیوالے کے فلسفہ فرعونیت کو قبول کر نیکی جرات کوئی نہ کر سکا، آج بھی خدائی کے دعویدار موجود ہیں، موسیٰ کا وجود تقاضائے فطرت ہے۔ شاید اسی لئے خدا نے اپنی آخری کتاب میں فرمایا کہ فرعون کی لاش کو عبرت کیلئے محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ اگر کوئی کلیم پیدا نہ ہو تو، فرعون کی لاش خود اپنی داستان سنانے کیلئے موجود ہو۔

میری توجہ ایک اور لاش کی طرف چلی گئی۔ یہ لاش ٹامس کرامویل (Cromwell) کی تھی جس نے آئینی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا، قوم نے اُسکے مرنے کے بعد بھی اس گناہ کو معاف نہیں کیا، اُس پر اُس کی موت کے بعد مقدمہ چلایا گیا، عدالت نے اُسے سزائے موت دی، اُسکی قبر کھود کر لاش نکالی گئی، اُسے لندن شہر کے تاریخی مقام "ٹریفالگر سکوائر" کے درمیان پھانسی دیدی گئی، یہ لاش کئی ماہ تک لٹکتی رہی۔ اس اقدام سے برطانیہ فوجی طالع آزماؤں کی دسترس سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گیا، جمہوریت کی جڑیں اتنی گہری ہو گئیں کہ آج تک برگ و بار لارہی ہیں۔

ہمیں لاشوں کی سیاست کی بجائے عوام کی بالادستی کو قبول کر لینا چاہیے۔ ضروری نہیں لاشوں سے سبق حاصل کیا جائے۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

دلیل، نہ وکیل، فقط تعمیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

ذوالفقار علی بھٹو کو جب بار بار عدالتوں کے دھکے کھانا پڑے تو انہوں نے سرائیکی کے ایک شعر میں اس دردناک لمحوں کا نقشہ کھینچا انہوں نے کہا

زرداں دی ماری جندڑی علیل اے

سوہتا نہیں سندا ڈکھ دی اپیل اے

چند روز پہلے جیل حکام نے مجھ سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، تو میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا اس نوٹس میں انکم ٹیکس ٹریبونل کی طرف سے حکم تھا کہ 06-09-2005 تاریخ کو میرے خلاف چیف انکم ٹیکس کمشنر نے نالہ و فریاد کی ہے کہ انکم ٹیکس کمشنر ملتان نے کیوں مجھ پر پچاس لاکھ کا بوجھ لادنے سے انکار کیا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ محترمہ بینظیر کے دور حکومت میں میرے خلاف ساٹھ لاکھ انکم ٹیکس کا مقدمہ بنا دیا گیا اور تمہاری والدہ کے خلاف بھی تقریباً تیس لاکھ واجب الادا ٹھہرائے گئے۔

ہماری حکومت کے زمانے میں ہمیں کوئی نوٹس نہ ملا تو ہم نے سمجھا کہ سیاسی انتقام کے تحت بنایا گیا مقدمہ آپ اپنی موت مر گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی مع بچوں کے خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ بن مانگے انصاف مل گیا ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پھر ہماری حکومت نہ رہی۔ دیکھو میں کتنا بھلا مانس بن گیا ہوں کہ فوجی حکمرانوں کی بجائے حکومت کی تبدیلی کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرا رہا ہوں تاکہ راضی رہے صیاد بھی.....

ہماری حکومت کے جاتے ہی انکم ٹیکس کی فائلوں نے سر نکالا اور ہمیں جو ابد ہی کیلئے

طلب کر لیا گیا۔ میرا وکیل ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور حالِ غم سنانے لگا۔ میں اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار بیٹھا تھا۔ انکم ٹیکس کمشنر سندھ کا کوئی اوڈھ راجپوت تھا۔ اُسکی رگ انصاف اس بے انصافی کے دور میں پھڑک اُٹھی اُس نے مقدمہ کا تفصیلی فیصلہ تمہارے والدین کے حق میں لکھ مارا۔ آج کے دور میں اس جنسِ نایاب کا ملنا اگرچہ کافی دُشوار ہے، قدرت مجھے بتانا چاہتی تھی کہ ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دم سے ابھی انسانیت قائم ہے۔ فیصلے کے آتے ہی حکومتی ایوانوں میں بھونچال آ گیا کہ ایسے فرد کو مسٹر کلین ہونے کا سرٹیفکیٹ کیوں جاری کیا گیا جسے وہ نمونہ عبرت بنانا چاہتے ہیں۔ لہذا حکومت کی طرف سے انکم ٹیکس ٹریبونل میں اس فیصلے کیخلاف اپیل دائر کر دی گئی۔ دراصل میں اُسی نوٹس کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے ٹریبونل کی طرف سے جیل میں ملا۔

تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ مقدمات کی بھرمار نے مجھے اُنکے نتائج سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں نے سوچا تیرہ سال سے اس مقدمے کی پیروی کر رہا ہوں جو کسی طور بھی مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ میں تنگ آیا ہوا تھا، میں نے تمہاری والدہ سے مشورہ کیا کہ جو ہونا ہے ہونے دیں۔ ہمارے پاس ہے کیا، جسکے بچاؤ کی جنگ لڑیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل دُرسٹ ہے کہ میرے پاس مقدمے کے اخراجات کیلئے اضافی اخراجات کا حصول بھی آسان نہ تھا۔ اس لئے کسی وکیل کو پیش ہونے کیلئے نہ کہا۔

آج انکم ٹیکس ٹریبونل کی طرف سے اُن کا فیصلہ موصول ہوا ہے جس میں ہماری غیر حاضری کے باوجود حکومتی اپیل مسترد کر دی گئی اور یہ بھی لکھ دیا کہ مدعا عالیہ یعنی میری طرف سے کوئی دفاع کیلئے پیش نہیں ہوا۔ میں خوش بھی تھا اور حیران بھی.... اسی قسم کا فیصلہ تمہاری والدہ کے مقدمے میں بھی کیا گیا۔

مجھے اپنے حق میں فیصلے کی خوشی سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ابھی خیر کا عنصر معاشرے میں موجود ہے۔ تیرہ سال جس طرح مجھے اس مقدمے میں زنج کیا جاتا رہا، وہ ایک طویل داستان ہے، جسکی تفصیل میں جانے کا نہ موقع ہے اور نہ اسکی ضرورت۔

میں اُس فیصلے کو اپنی جدوجہد کے صبر آزما مرحلے کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اسی لئے اسے
 کتاب کا حصہ بنا کر تاریخ کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے ایک حج کا نام منصف خاں
 ہے انہوں نے اپنے نام کی لاج رکھ لی ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

شناخت پریڈ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

جیل کے اندر کی زندگی میں ہر قیدی کی شناخت ختم کر کے اسے نمبر الاٹ کر دیا جاتا ہے لہذا قیدی نمبر 6492 جیل کے درخت نمبر 435 کے نیچے بیٹھ کر یہ خط لکھ رہا ہے۔

آج ڈیوڑھی میں گیا تو ایک مجسٹریٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہلے سے موجود تھے، گرم جوشی سے ملے۔ میرے دریافت کرنے پر کہا کہ میں ایک شناخت پریڈ کے سلسلے میں آیا ہوں، اُن کی بات سنتے ہی میں 1970ء کی دہائی میں چلا گیا۔

مارچ 1972ء کی رات کو اسی جیل میں میری شناخت پریڈ ہوئی تھی، مجھ پر اور میرے دیگر تین ساتھیوں سمیت قتل کا مقدمہ بنایا گیا تھا۔ حفیظ خان، رانا نذر الرحمن اور نعمان بٹ سمیت سب ملزمان اس شناخت پریڈ میں شریک تھے، ہم دُعا مانگ رہے تھے کہ خدا کرے ہمیں کوئی شناخت نہ کر سکے۔ بکھے شاہ نے کہا ہے

اٹھ بٹھیا چل اوتھے چلئے جتھے سارے انہے

ناں کوئی ساڈی ذات پہچانے، نہ کوئی ساڈی منے

اور پھر وہی ہوا، ہم میں سے کسی کی شناخت نہ ہو سکی، گویا شناخت کھودینا کامیابی کی

دلیل ٹھہرا۔

سات سال سماعت کے بعد عدالت نے ہمیں بری کر دیا، لیکن جس ذہنی کیفیت سے ہم اور ہمارے عزیز واقارب گزرے اُسکے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب 35 سال بعد راجہ انور نے اخبار میں کالم لکھ کر تاریخ کا قرض اُتار دیا ہے، جو اُس کے ذمے تھا۔ وہ ہمارے فریق مخالف تھے اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے مشیر کے عہدے پر فائز رہے۔

انہوں نے انکشاف کیا کہ برکات احمد مرحوم کا قتل ان کے اپنے ساتھی کی گولی سے ہوا اور بعد میں قاتل کسی دوسرے ساتھی کی آبرو سے کھیلے ہوئے خود قتل ہو گیا۔ راجہ انور نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا کہ اگرچہ اس واقعہ کو کافی عرصہ بیت گیا تھا، مگر میں چاہتا تھا حقیقت حال چھپائے رکھنے سے بہتر ہے کہ اُسے ریکارڈ پر لایا جائے، اتنا عرصہ بعد حقیقت حال بیان کرنے پر میں راجہ صاحب کا شکر گزار ہوں، انہوں نے مجھے مزید وضاحت سے بچا لیا۔ یہ قتل اُس وقت ہوا تھا جس وقت انتخابی نتائج کا اعلان کرنے کیلئے پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیسپس میں ووٹوں کی گنتی جاری تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کا ہر فرد جانتا تھا کہ میں تقریباً بلا مقابلہ صدر منتخب ہو چکا تھا، خود اپنی کامیابی کے نتیجے کو روکنے کیلئے میں یا میرا گروپ جھگڑے کی صورت کیوں پیدا کرتا؟۔ پچھلے دنوں برکات رشید کے خالہ زاد اور اس کے مقدمے کے مدعی مجھے ملنے آئے تو سارے گلے جاتے رہے، ملک طارق خورشید پیپلز پارٹی کے سرگرم راہنما ہیں انہوں نے ایک کتاب سوئے دار لکھی ہے جس میں ان کی آٹھ سالہ قید کی داستان ہے انہیں انک قلعہ سے لے کر پنجاب کی ساری جیلوں میں پھرایا گیا مگر ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے میں ان کی جدوجہد کو سلام پیش کرتا ہوں۔

آج کل اخبارات میں ایک اور شناخت پر یڈ کا بہت چرچا ہے۔ تو ہین رسالت ﷺ کے سلسلہ میں نکلنے والے جلوسوں کا سارا الملبہ خواجہ سعد رفیق اور زعیم قادری پر ڈالنے کے لئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ صرف گرفتاری پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ عدالتوں میں پیش کرتے وقت زعیم قادری کے سر اور منہ کو ایک سیاہ تو بڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔ اخبارات میں چھپنے والی تصویر انتہائی ذلت آمیز تھی۔ جب اخبارات میں اس طریقہ کار پر تنقید کی گئی تو حکومت نے جو جواب دیا وہ انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ کہا گیا چونکہ ان کی شناخت پر یڈ ہونا باقی ہے، اس لئے ان کا چہرہ ڈھانپنا ضروری تھا۔

خواجہ سعد رفیق اور زعیم قادری کو کون نہیں جانتا۔ خواجہ سعد رفیق اس دور میں قوم کی آبرو ہیں۔ وہ قومی اسمبلی کے منتخب ممبر بھی ہیں۔ ان کے والد محترم سے بھی پورا پاکستان

واقف ہے۔ اسی طرح سیدز عیم قادری بھی، نہ صرف پاکستان مسلم لیگ (ن) پنجاب کے سیکرٹری جنرل ہیں اور وہ میاں نواز شریف کے ترجمان بھی ہیں، ان کا خاندان برصغیر کے نامور اور ممتاز خاندانوں میں سے ایک ہے۔ کیا وہ رسالت مآب کی آبرو کے تحفظ کے جلو سوس میں شریک ہو کر اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ یہ کسی بیمار ذہنیت کی سوچ ہے کوئی ذی شعور ایسی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

پاکستان میں ایسے حکمرانوں کو لایا گیا جنہیں اپنی والدہ کی قبر کا نشان تلاش کرنے میں مشکل درپیش تھی۔ موجودہ وزیر اعظم کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا۔ وہ کس جگہ کے رہنے والے ہیں۔ اگر وہ اپنی جائے رہائش کا بتا دیتے تو ان کے ہمسایوں کی ان کے بارے میں رائے پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ ہماری معیشت ٹھیک کرنے کے لئے ایسے لوگ لائے گئے جنہوں نے پاکستان میں مرنا اور دفن ہونا بھی پسند نہ کیا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنے اقتدار کے لئے استعمال کیا، مگر پاکستان کو اپنی شناخت نہ بننے دیا۔ اب ان کی شناخت پریڈ ہونی چاہئے جنہوں نے پاکستان کی شناخت خراب کی ہے۔

والسلام

تمہارا والد!

انقلاب کے آثار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

دوروز قبل تیز ہوا کے جھونکوں سے بکائُن کا وہ درخت زمین بوس ہو گیا، جس کے سائے تلے بیٹھ کر میں آنے والے وقتوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس درخت کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ جب وہ گرا تو معلوم ہوا کہ اُس کے تنے کو مٹی نے چاٹ لیا تھا۔ وہ بظاہر صحت مند تھا۔ گرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کی جڑیں اُس کا ساتھ پہلے ہی چھوڑ چکی تھیں۔ میں نے شاخوں پر اُس کے بیجوں کا تذکرہ ایک خط میں کیا تھا۔ وہ بیج بھی صفائی والے عملے نے دالان سے باہر پھینک دیئے۔ میں درخت گرنے سے مغموم تھا۔ ساتھی کہہ رہے تھے کہ اللہ نے آپ کو بچا لیا ہے، آپ شکر ادا کریں۔ دراصل جہاں درخت گرا، چند لمحے پہلے وہاں میں بیڈمنٹن کھیل رہا تھا، وہ میری جان بچنے پر مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔ میں ساری رات اُس کی جدائی میں ادا اس رہا۔

ہمارے ملک میں ایسے نظام چلائے جا رہے ہیں۔ جو، بظاہر، شجر سایہ دار کی طرح ہیں۔ لیکن اُن کے تنے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اُن کے سروں پر بُرائی کا بیج ہے، جو ہوا کے ایک جھونکے سے لرز جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی جڑیں زمین کی گہرائی تک نہیں پہنچتیں۔ وہ تپتے صحراؤں کی دھوپ میں قوم کو تنہا چھوڑ کر منہ کے بل گر جاتے ہیں۔ صرف وہی نظام زندہ رہتے ہیں جسکی جڑیں عوام میں ہوں۔

1988ء میں جب جناب ضیاء الحق کی تدفین کی تقریب ایسے پر شکوہ انداز میں ہو رہی تھی کہ، شاید ہی کسی شہنشاہ کو اس انداز سے لحد میں اتارا گیا ہو۔ دُنیا بھر کے عالی مرتبت نمائندگان موجود تھے۔ انوارِ پاکستان کے ڈسپلن نے بھی سماں باندھ رکھا تھا۔ خبر رساں

ادارے پل پل کی خبر براہ راست لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی مشہور مؤرخ "ایما ڈنکن" (EMADANCON) نے کہا: کہ دیکھ لینا "دس سال کے اندر فوج اقتدار سنبھال لے گی" مجھے اس بات کی منطق سمجھ نہ آئی تو اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسا شخص جس نے دس سال تک ملک پر آمریت مسلط کئے رکھی اُسے قوم اتنے شاندار انداز سے الوداع کر رہی ہے۔ تو آج کے میجر یا کرنل کے دل میں ایسی موت کی تمنا کیوں پیدا نہ ہوگی، صرف انہیں جنرل یا کمانڈر انچیف بننے کا انتظار کرنا ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُس وقت کے کرنیل اور میجر ہی اس وقت ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

میں کل ڈیوڑھی میں ملاقات کر رہا تھا کہ ایک پکتان اور میجر پاک فوج کی وردی میں مابوس کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ جیل حکام سے کسی مسئلہ پر بات کرنے کیلئے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر میرے پاس آگئے اور کہنے لگے، ہم آپکی صحت کے بارے میں متفکر رہتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اللہ نے مجھے بہترین صحت سے نوازا ہے، آپکی ہمدردی کیلئے آپکا شکر گزار ہوں، انہوں نے مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا۔ میرے ایک ساتھی نے پکتان کی وردی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ فوج میں پکتان کی وردی تمام وردیوں سے خوبصورت ہوتی ہے۔ نو جوان پکتان نے کہا کہ اگر کوئی آپ کے کہنے پر وردی نہیں اتارتا تو میں حاضر ہوں، میجر نے میرے قریب آ کر کہا خدا آپکو اپنے مقصد میں کامیابی دے، آپ ہم سب کا سرمایہ ہیں۔

پچھلے دنوں مجھے ایک نو جوان ملنے کیلئے آیا تو اُس نے ایک دلچسپ واقعہ سُنایا، اُس نے بتایا کہ وہ مقابلہ کا امتحان پاس کر چکا ہے اور اب آئی سرز اکیڈمی میں تربیت حاصل کر رہا ہے، کہنے لگا میں جب سروسز ٹریونل میں پیش ہوا، انٹرویو کے دوران سروسز ٹریونل کے چیئرمین جنرل جمشید کیانی نے کہا کہ آپکی زندگی کا آئیڈیل کون ہے تو میں نے دو نام لیے ایک آپکا اور دوسرا ڈاکٹر شاہد عمران کا، میں انٹرویو دیکر باہر آیا تو دوستوں نے کہا تم نے حماقت کی ہے، میں نے انہیں کہا کہ میں سچ کہنے سے اپنے آپکو باز نہ رکھ سکا اس لئے میرا ضمیر مطمئن ہے۔

جب مجھے سلیکٹ (Select) کر لیا گیا تو سب حیران تھے اور خود مجھے بھی حیرانی ہوئی۔
 آج اخبارات سے پتا چلا کہ جنرل جمشید کیانی نے وزیراعظم اور جنرل کی مداخلت کے
 خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دیدیا ہے۔

بشریٰ بی بی! ایما ڈنکن تو شاید لندن میں ہوگی تم بتاؤ کہ آئیو الی بیورو کر لسی خواہ وہ فوجی
 ہو یا سول دس سال بعد پاکستان کے سیاسی منظر پر اسی طرح چھائی رہے گی جیسے اب ہے؟
 میں سمجھتا ہوں کہ احساس زیاں پیدا ہو چکا ہے یہی احساس قوموں کا سرمایہ ہوتا ہے خدا
 کرے رویوں میں تبدیلی برپا ہونے میں اتنی دیر نہ ہو جائے کہ کہنا پڑے!

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پر اب
 تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

والسلام

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

نا کام ریاست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

3 مئی 2006ء

میسونہ بیٹی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج کی شام بہت اُداس تھی، سوچا آپ سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں، میں کسی اور کو اپنی اُداسیوں میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں تو اپنی اُداسیوں کا دافر حصہ پہلے ہی منتقل کر چکا ہوں۔

آج کل گرمی زوروں پر ہے۔ بجلی چلی جاتی ہے تو رات کے گھنٹا ٹوپ اندھیرے میں دم گھٹتا ہے۔ ویسے بھی میرے کمرے کو جالیوں کے نام پر چاروں جانب سے لوہے کے غلاف میں ڈھانپ دیا گیا ہے جہاں پر ہوا آسکتی ہے اور نہ روشنی۔ بجلی ہو بھی تو اُسکا ہونا نہ ہو نا ایک برابر ہے۔ وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ بلب ٹمٹماتا رہتا ہے اور پنکھا چلنے کی بجائے رینگتا ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے، مگر میری اُداسی کا سبب کچھ اور ہے۔ پچھلے دنوں ایک جھکڑ کی زد میں آکر ہمارا نیم کا درخت زمین بوس ہو گیا۔ مارچ کے مہینے میں اُس کی شاخوں پر کوئلیں پھوٹی تھیں اور دیکھتے دیکھتے وہ ہرا بھرا ہو گیا۔ جنوری فروری میں وہ بالکل ٹنڈ ٹنڈ تھا مگر اب میں اُسکی چھاؤں میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جب وہ گرا تو انکشاف ہوا وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ہمارے عالمی نظام کی طرح چھال کے سہارے صحت مند اور توانا نظر آتا تھا۔ چھلکا اُترتا تو اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔

میری اُداسی کا سبب اخبارات میں چھپنے والی وہ خبر تھی جس میں کہا گیا کہ پاکستان دُنیا کی اُن نو مملکتوں میں سے ہے جو فیل ہو گئی ہیں۔ اس رپورٹ میں باقی ملکوں میں زمبابوے، صومالیہ، آئیوری کوسٹ، جمہوریہ کانگو، ہیٹی، عراق اور سوڈان شامل ہیں۔ جنوبی

ایشیاء میں ناکام ریاستوں میں پاکستان کا نام سرفہرست ہے۔ پہلے یہ نام چونتیسویں (34) نمبر پر تھا۔

ناکام ریاستوں کی ناکامی کا اندازہ کئی عوامل کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ناکام ریاست کی تعریف یہ بتائی گئی ہے۔

- 1- جس ملک کی حکومت کا ملک پر موثر کنٹرول نہ ہو۔
 - 2- جس میں عوام کی بڑی تعداد حکومت کو جابرانہ سمجھتی ہو۔
 - 3- جس میں حکومت اپنے شہریوں کو بنیادی سہولتیں فراہم نہ کر رہی ہو۔
 - 4- جہاں حکومت پر فوج کے علاوہ دیگر مسلح گروہ حاوی ہوں۔
- اس فہرست میں گنی، لائبیریا، بنگلہ دیش اور برونڈی جیسے ملکوں کو پاکستان سے زیادہ مستحکم ملک تسلیم کیا گیا ہے۔

اب تم بتاؤ میری اداسی جائز ہے یا ناجائز۔ ہمارے فوجی حکمرانوں نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ویسے تو موجودہ عالمی نظام میں امیر ترین ملک بھی اپنے عوام کی زبوں حالی کا حل تلاش نہیں کر سکے۔

میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں دنیا کے امیر ترین ملک سویڈن (SWEDEN) کے دار الحکومت سٹاک ہوم میں تھا، جہاں خودکشی کرنے والوں کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ میں ایک ٹھٹھرتی شام کو ہوٹل کے باہر چہل قدمی کیلئے نکلا۔ ایک لڑکی میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی، میں نے دیکھا اُسکے چہرے پر خوف اور استعجاب تھا، (کہیں وہ مجھے دہشت گرد تو نہیں سمجھ رہی تھی) میں واپس مُڑ کر ہوٹل میں داخل ہوا تو لڑکی تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک ڈسٹ بن (DUSTBIN) کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا تو گندگی میں سے چیزیں نکال کر کھانے لگی۔ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ اگلے دن میں نے کانفرنس میں سویڈن کے دوستوں سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے اس طرح کے واقعات معمول کا حصہ ہیں، آپ پریشان نہ ہوں، یہ لوگ اپنی

محمودیوں کا حل اسی طرح نکالتے ہیں۔ دُنیا کی اس کامیاب ترین ریاست کو ناکام کہنے والے کی بات پر کوئی یقین کرے گا؟

اسی طرح ایک مرتبہ نیویارک میں ایک خاتون جس نے اپنا نام ڈورٹی (Dorothy) بتایا، اپنے ناک نقشے سے ہسپانوی لگ رہی تھی۔ میرے پاس آکر بے تکلفی سے کہنے لگی، آپ میرے بھائی ہیں یا LOVER، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میری بچی کیلئے بوتل میں دودھ نہیں ہے، مجھے دودھ کیلئے پیسے چاہئیں اس کے بدلے میں حاضر ہوں۔ میں شدید صدمے سے دوچار ہو گیا۔ امریکہ نے نیوورلڈ آرڈر متعارف کرایا ہے ساری دُنیا کے حقوق کا خدائی خدمت گار اپنے گھر کی خبر لینے کو تیار نہیں۔

جاپان میں قوم کی نوجوان بچیاں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کیلئے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے پاس وقت گزارتی ہیں۔ یہ مناظر آپ کو ٹوکیو (TOKYO) میں عام نظر آئیں گئے۔ کہ ایک مالدار بوڑھا نوجوان لڑکی کے ساتھ جا رہا ہے۔ آپ انھیں باپ بیٹی سمجھیں گے۔ لیکن رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے۔ اب حکومت جاپان نے تنگ آکر قانون سازی کی ہے تاکہ معاشرے کے اس روگ کا علاج کیا جاسکے۔ جاپان کو کون ناکام ریاست ہونے کا طعنہ دے سکتا ہے؟۔ اگر اسی طرح کی حرکت کوئی بوڑھا عرب کرے تو اسے اسلام کی حامی کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

ماسکو کا سارا شہر سر شام قحبہ خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے، روس کی بچیاں پورے یورپ میں، حتیٰ کہ پاکستان اور دبئی میں سمگل کی جا رہی ہیں، ماسکو انسانوں کی خرید و فروخت کی سب سے بڑی منڈی بن چکا ہے۔ کیا ہمارے روشن خیال اسی طرح کی روشنی کے آرزو مند ہیں؟ ابھی ماضی قریب میں دُنیا کے ترقی پسند دانشور، روس کو مکہ اور مدینہ سے زیادہ مقدس سمجھتے تھے۔ وہ نظام جو انھیں بادشاہوں کی ہوسنا کیوں سے بچانے آیا ناکامی و نامرادی کا شکار ہو گیا۔

برطانیہ، جس نے پوری دُنیا پر حکمرانی کی، اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے لوگ اُسے

یورپ کا سعودی عرب کہتے تھے۔ آج اُس کا دارالحکومت لندن ایک تماشہ گاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سیاحت کے نام پر پیسے بٹورنے کیلئے تمام حدود و قیود توڑ دی گئی ہیں، عورت کی تذلیل انتہا کو پہنچ گئی۔ مصر کا بازار بھی لندن کی شاموں سے شرماتا ہے۔ پیٹ پالنے کیلئے انسان اتنی گراؤٹ پر آسکتا ہے۔ یقین کرنے کو دل نہیں مانتا۔ بغیر مانے چارہ بھی نہیں۔

معیشت اور معاشرت کا یہ نظام دھڑام سے گرنے والا ہے۔ جس طرح ہمارے نیم کے درخت کو گرانے کیلئے ہوا کا ایک جھکڑ کافی تھا۔ روس جیسے طاقتور ملک کو کرچی کرچی ہوتے ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے حکمران، درحقیقت، اس مرنے والے نظام کے مہرے ہیں، جو اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ ہمارے حکمران ناکام ہیں، ملک نہیں۔ جبکہ طاقتور ترین ملکوں کو بنیادی تبدیلیوں کا سامنا ہے۔

دُنیا کے کامیاب ملک کہلانے والے غریب ملکوں کے وسائل پر قابض ہو کر احساس برتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ جہان پیر مر رہا ہے اور جہان تازہ اُبھر رہا ہے۔ میری اُداسی اُمید میں بدلنے لگی ہے۔ تپش اور حدت میں کمی محسوس ہونے لگی ہے، ہوا کے جھونکے لوریاں بن گئے ہیں۔ میری آنکھیں بوجھل ہونے لگی ہیں۔ میرے اندر سکون کی لہر نے تھپکیاں دے کر مجھے سُلا دیا ہے مگر میری روح بیدار ہو چکی ہے۔ مجھے پاکستان ناکام ریاست نہیں لگتا بلکہ مجھے تو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آرہی ہے۔

خدا حافظ!

تمہارا والد!

ناقابلِ علاج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 مئی 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

تمہارے گلے کا کیا حال ہے؟ میرا گلہ بھی اکثر خراب رہتا تھا۔ جب سے جیل میں ہوں گلے کی خرابی دور ہو گئی ہے۔ اگرچہ یہ علاج خاصا مہنگا ہے مگر مجھے جس چیز سے افاقہ ہوا ہے اس مجرب نسخہ سے تمہیں محروم نہیں رکھنا چاہتا آزمائش شرط ہے۔

تمہاری ملتان، سرگودھا، نارووال اور لاہور کی تقریریں بس گزارہ تھیں۔ البتہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، جھنگ، فیصل آباد اور گجرات کی تقریریں بہت پسند کی گئیں۔ لندن اور برمنگھم کے خطاب کی بہت اچھی رپورٹس ملی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تمہاری گفتگو سننے کا موقع ملا تو داد دینے کو جی چاہا، کافی متاثر کن تھی۔ تمہاری سرگرمیاں اخبارات کے ذریعے مجھ تک پہنچ رہی ہیں، جسے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔

تمہارا 27 اور 28 مئی کا شیڈول دیکھا تو سوچا بیماری کے حالت میں اس پر عمل کرنا تمہارے لئے خاصا دشوار ہوگا۔ 27 مئی کو وکلاء کنونشن میں شرکت کے بعد تمہیں اسلام آباد پہنچنا ہے۔ وہاں سے 28 مئی کی صبح مردان میں یوم تکبیر کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی تقریب میں حاضری دینا ہے۔ شام کو اسی سلسلے میں اسلام آباد کے منعقد ہونے والے جلسے میں پہنچنا بھی ضروری ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوگی، بلکہ اس روز کی آخری اور بہت اہم تقریب لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ وہاں کی جماعت کا بھی تمہاری شرکت پر اصرار ہے۔ بالکل اگلے روز یعنی 29 مئی کو پشاور میں صوبے بھر کے پارٹی کارکن اور راہنما اکٹھے ہو رہے ہیں۔ وہاں پر بھی تمہارا خطاب ضروری ہے۔ اتنی تقاریر کے بعد اگر گلا جواب نہ دے تو کیا کرے۔ میں نے تیر بہدف علاج بلاوجہ تجویز نہیں کیا تھا، پھر نہ کہنا بزرگوں نے رہنمائی

نہیں کی تھی۔ تم تو جیل کو بری جگہ کہہ ہی نہیں سکتی۔ جہاں تمہارے والد کو بار بار ہنا پڑا ہو تم سے بری جگہ کہہ کر اپنے والد کی شان میں بے ادبی نہ کر بیٹھنا۔ ہم تو نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔ آگے جو مرضی آپ کی۔

بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں تمہیں خط لکھ رہا تھا تو سزائے موت کی کوٹھڑی سے بھیجی گئی سردائی مل گئی۔ تمہیں کیا معلوم سردائی کیا ہے؟ تمہیں تو کوکا کولا اور سیون اپ کا پتہ ہوگا۔ اسی کو تو (Generatio Gape) جنریشن گیپ کہتے ہیں۔

رات کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں ٹیلی ویژن پر جرمنی اور اٹلی کے درمیان فٹ بال کا سیسی فائنل دیکھ رہا تھا؟ دونوں ٹیموں نے شاندار کھیل پیش کیا۔ میری ہمدردیاں اٹلی کے ساتھ تھیں۔ ایسا کیوں تھا؟ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں۔ بہر حال اضافی وقت میں اٹلی نے یکے بعد دیگرے دو گول کر کے میچ جیت لیا۔ جرمن قوم کے چہرے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ میں جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے اپنی پسندیدہ ٹیم کی فتح کا جشن منانے کی بجائے جرمن قوم کی شکست کا حصہ دار بن گیا۔ صف ماتم پچھی تو اس میں میرے آنسو بھی شامل تھے۔ میں اپنے اس رویے پر غور کرنے لگا تو میرا ماضی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے تمام عمر کمزور اور مظلوم لوگ اپنے اپنے سے لگے۔ بلکہ جب میں نے مزید غور کیا تو عجیب انکشافات ہونے لگے۔ میں جیل میں طاقتور بلیوں کے بلا وجہ خلاف ہو جاتا ہوں اور کمزور بلیوں سے دوستی کر لیتا ہوں۔ یہی حال پرندوں کا ہے، جب کوئے کمزور چڑیوں کو دانہ دزکا نہیں چگنے دیتے، میں انہیں بھگاتے بھگاتے ہانپ جاتا ہوں۔

بنگالیوں کو ہم سے جدا ہونے پچھتیس چھتیس سال ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے بنگلہ دیش کا قیام ان کے لئے بہتری کے نتائج لایا ہو۔ ان کی فی کس آمدنی بھی ہم سے زیادہ اور ان کے زر مبادلہ کے ذخائر بھی زیادہ ہیں۔ مگر میں ان پر ہونے والی زیادتیوں پر ابھی تک آنسو بہاتا ہوں۔ ہمارے شاہ دماغ انہیں ہماری معیشت پر بوجھ سمجھتے تھے۔ انہیں بھوکے بنگالی کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب وہ ہم سے زیادہ امیر ہیں، مگر ان پر چلنے والی گولیوں کی آواز

آج بھی میرے سکون کو درہم برہم کر دیتی ہے۔
 میں شاید شروع سے ہی ایسا تھا۔ میرے بچپن کے دوست وہی تھے۔ جنہیں معاشرہ
 دھتکار دیتا تھا۔ گاؤں کے انہی لوگوں سے میرا تعلق زیادہ بن جاتا تھا جن کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔
 دنیا بھر کے غریب، خواہ وہ افریقہ میں ہوں، لاطینی امریکہ میں ہوں یا دنیا کے کسی حصے
 میں، ان کی تکلیفیں یاد کر کے رونے لگتا ہوں۔ فلسطینیوں، کشمیریوں، عراقیوں، پشتونوں
 اور بلوچوں کے بارے میں زیادتی کی خبریں میرے لئے سوہان روح بن جاتی ہیں۔ میں تو
 اہرام مصر اور تاج محل بنانے والے مزدوروں کی اموات یاد کر کے بھی روتا ہوں۔ تمہیں
 علاج تجویز کر رہا ہوں خودنا قابل علاج ہوں۔

خدا حافظ!

تمہارا والد!

موروثیت کی سیاست

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

20 مئی 2006ء

میسونہ بی بی!

السلام علیکم!

میں نے ملاقاتوں میں بارہا آپ سے کہا ہے کہ میری محبتیں اپنی بیٹیوں پر نچھاور ہیں، لیکن آپ کا احترام میرے دل میں اس وقت پیدا ہوگا جب آپ میرے فیصلے اور میری کارکردگی کو ایک نقاد کی حیثیت سے دیکھیں گی۔ اگر آپ میری محبت میں میرے ہر فیصلے پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا شروع کر دیں تو یہ بات مجھے پسند نہ ہوگی۔

میں ایسے نظام کو کبھی پسند نہیں کر سکا، جس میں قیادت نسل در نسل، ایک خاندان میں مرکوز ہو جائے۔ حضور ﷺ نے اپنی خلافت کے بارے میں کسی فیصلے کا اعلان نہیں فرمایا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی واضح حدیث موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی حکمت کا تقاضا تھا۔ اتنا بڑا ضابطہ حیات دینے کے بعد، جس میں معمولی معمولی باتوں کی وضاحت کر دی گئی ہو، خلافت کی تصریح نہ کرنے، میں یقیناً کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔

حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اپنی اولادوں کو اس وراثت میں شامل نہیں کیا۔ حضرت علی علیہ السلام سے جب وقت شہادت پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کسے خلیفہ تسلیم کریں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ آپ زندوں کا کام ہے۔ لوگوں نے حضرت حسن علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے جو کچھ کہا تھا کہہ چکا ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام کے عمل کے برخلاف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید کو اپنی زندگی میں خلافت کے لئے نامزد کر دیا جو کہ ایک ناپسندیدہ عمل ٹھہرا۔ خود یزید کے بیٹے نے یہ کہہ کر خلافت لینے سے انکار کر دیا کہ جس اقتدار کے لئے اتنا خون بہایا گیا، اس کی حیثیت ایک جلی ہوئی رسی کے برابر بھی نہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب یہ کہا کہ میں ایک فاسق و فاجر کی بیعت کرنے کے بجائے عسا کر اسلام میں شامل ہو کر جہاد کرتے ہوئے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دوں گا تو ثابت کر دیا کہ خلافت کے لئے نسب کی بجائے اہلیت اور کردار کی اہمیت زیادہ ہے۔ امام عالی مقام کے اس عمل نے اسلام کو موروثیت کے بدبودار نظام سے بچالیا۔ بلکہ انہوں نے رائے اور ووٹ کے آزادانہ استعمال کے لئے اپنی جان دے کر اسلام کو جمہوریت کا روشن مینار بنا دیا۔

آج کی دنیا میں وہی معاشرے ترقی یافتہ کہلانے کے حق دار ہیں جہاں آزادی اظہار کے ذرائع کو وسعت دی گئی ہے اور حکمرانی کو چند خاندانوں میں محدود نہیں کیا گیا۔ اس عمل سے بہترین دماغوں کا انتخاب کرنے میں مدد ملی ہے اور اجتماعی سوچ پیدا ہوئی ہے۔ جس سے ان قوموں نے بھی تاریخ میں مقام پیدا کر لیا ہے، جو عام طور پر اس امانت کے قابل ہی نہیں سمجھی جاتی تھیں۔

موجودہ دور کا مسلم معاشرہ ابھی تک فرد واحد کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ملوکیت سے خلافت کی طرف واپس نہیں آسکا۔ درحقیقت خلافت ہی جمہوریت ہے۔ اس عہد میں فقط برصغیر ہندو پاک کے مسلمان ایسا استثناء ہیں جنہوں نے سیاست کی ایسی بنیاد رکھی جس میں موروثیت کو ابتداء سے ہی رد کر دیا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے اب تک کسی صدر کا بیٹا صدر نہیں بن سکا۔ اسی روایت کو قائد اعظم نے برقرار رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی مسلم لیگ میں کوئی ایسی مثال قائم نہیں کی جاسکی۔ اگرچہ مسلم لیگی حضرات کا کردار، قیام پاکستان کے بعد، قابل رشک نہیں رہا۔ بلکہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کو اقتدار کی بانڈی بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود مسلم لیگ پر کسی ایک خاندان کی چھاپ نہیں لگ سکی۔ اس کے مقابلے میں آل انڈیا کانگریس کا اگر جائزہ لیں تو ایسے نظر آتا ہے کہ شاید اسے صرف نہرو خاندان کے لئے بنایا گیا ہو۔ محدود وقت کے لئے کچھ لوگ کانگریس کے سربراہ بنے مگر وہ بھی برائے نام موجودہ حالات تو انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ کہ ایک ارب بیس کروڑ کی آبادی میں سونیا گاندھی کے علاوہ کوئی ایک فرد بھی اس لائق نہیں سمجھا

گیا۔ جس کے سر پر کانگریس کی صدارت کا تاج رکھا جاسکے۔ مجھے سونیا گاندھی کی صدارت سے اختلاف نہیں موردِ شیت کے نظام سے چڑ ہے۔ میں اسے انسان کی عظمت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ اُسے نسل، رنگ اور ذات کے حوالے سے اہم یا غیر اہم سمجھا جائے۔

پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں پر موردِ شیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ اس میں مذہبی اور ترقی پسند جماعتوں کی تخصیص بھی نہیں ہے۔ مذہبی جماعتوں میں جمعیت علماء اسلام کے سربراہوں مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق کی اہمیت اپنے والدین کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مفتی محمود نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا مولانا فضل الرحمن کی سیاسی بصیرت مسلمہ ہے۔ اُن سے میری ذاتی نیاز مندی ہے۔ مگر ضروری تو نہیں کہ ان کی جماعت میں کوئی دوسرا فرد اس قابل نہ ہو جو ان کی جگہ سنبھال سکے۔ ابھی مولانا شاہ احمد نورانی کی جگہ ان کے صاحبزادے انس نورانی کو اُن کی گدی پر بٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح اہلحدیث اور اہل تشیع کی جماعتوں میں ان کی اولاد کو قیادت سونپی گئی ہے۔

سیاسی اور جمہوری جماعتوں کا حال بھی مختلف نہیں ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی بھٹو خاندان کی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ کوئی غیر بھٹو پیپلز پارٹی کا سربراہ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگرچہ محترمہ بے نظیر نے اپنی سیاسی جدوجہد اور جاں گسل محنت سے اپنے آپ کو اس مقام کا حق دار ثابت کیا ہے۔ مگر پیپلز پارٹی کو بھٹو کی پارٹی ہی کہا جاتا ہے۔ سرحد میں تحریک آزادی میں نمایاں کردار کرنے والی پارٹی، باچا خان سے لے کر ان کے پوتے اسفندیار ولی تک ایک ہی خاندان کی گود میں ہے۔ میں اسفندیار کا خود کو نہ صرف دوست سمجھتا ہوں بلکہ اُس کی سیاسی فراست کا بھی قائل ہوں۔

صرف جماعت اسلامی، مسلم لیگ کے بعد ایک ایسی جماعت ہے جس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا اور آئندہ بھی کوئی ایسے آثار نہیں کہ جماعت اسلامی میں موردِ شیت جگہ پاسکے۔

گزشتہ چھ سو سال کی بات ہے، چنگیز خان اور کولمبس، دو ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے دنیا کی نہ صرف تاریخ بدلی بلکہ جغرافیہ بھی بدل ڈالا۔ ان دو افراد کے چھوڑے

ہوئے نقوشِ امنٹ ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا اب تک چنگیز خان اور کولمبس کی قبروں کی تلاش جاری ہے مگر تادم تحریر دونوں کا مدفن مل نہیں سکا۔ جس نے امریکہ دریافت کیا اس کی قبر دریافت نہیں ہو سکی اور جس نے پوری دنیا کو اپنے پاؤں تلے روند دیا اس کی روندی ہوئی لاش کا نام و نشان بھی نہیں مل رہا۔ کولمبس کے وارث آج کس حال میں ہیں؟ اور چنگیز کے وارث کہاں کے حکمران ہیں؟۔

آپ میری اُس جائیداد کی وارث ضرور ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے آپ کو بطور حق دی ہے، لیکن میری سوچ کی نہیں۔ سوچ کی وارث تب ہی بن سکیں گی، جب جدوجہد کو زندگی کا مقصد بنا لیں گی۔

مجھے یہ معلوم کر کے دکھ ہوا کہ تم نے سپریم کورٹ کے رویے سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو کمرے تک محدود کر لیا ہے۔ اپنی جماعت کے ساتھیوں کے رویے سے تمہارا دلبرداشتہ ہونا بھی مجھے پسند نہیں آیا، تمہارا پریشان حال ہونا بھی اچھا نہیں لگا۔ میں کسی کے کردار کی معمولی خامیوں سے تو درگزر کر سکتا ہوں مگر موقف کی کمزوری ناقابل برداشت ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری ساڑھے چار سال کی قید نے آپ کو ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا دیا ہے۔ آپ نے جس صبر اور جو صلے سے یہ تکلیفیں برداشت کیں اُن کی وجہ سے میں نے خندہ پیشانی سے جیل کاٹ لی۔ اگر آپ نے تکلیفوں کو اپنے سر پر سوار کر لیا تو میری قید تکلیف دہ ہو جائے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میرے بارے میں زیادہ پریشان ہو گئی ہو مگر اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ میری راتیں تمہاری بیماری کی وجہ سے بے خواب ہو گئی ہیں۔ اگر حالات سازگار ملتے جائیں تو کامیابیاں ضرور حاصل ہوتی ہیں مگر صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ جب کوئی مشکل ترین حالات میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے دراصل تو وہی حاصل زندگی ہوتا ہے۔ سازگار حالات میں ہر کوئی کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ زندگی کا مزہ تو اس میں ہے کہ آدمی عزم، جو صلے اور کردار کی پختگی سے مشکلات کی چوٹی سر کرے۔

میرے والد صاحب مجھے کہا کرتے تھے، بڑا بننے کا شوق ہے تو پہلے روڑی (کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ) بنو۔ تاکہ ہر کوئی اپنی ناکامیوں کو آپ کے سر ڈال دے اور اپنے غم و

غصہ کا غبار بھی آپ پر نکال سکے، اپنے دکھوں اور تکلیفوں کا ذمہ دار بھی آپ کو قرار دے، آپ ان ساری باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں، اور ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھیں، بد خوئی سے بچیں، اگر آپ یہ کر سکتے ہیں۔ تو آپ بڑے ہیں، اگر یہ نہیں کر سکتے تو بڑا بننے کا مہنگا شوق مت پالیں۔ تمہیں تو قدرت نے بڑا پیدا کیا ہے۔ اپنے سے چھوٹوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ آپ نے اٹھانا ہے۔ تکلیف میں مسکرانا، بلند حوصلہ لوگوں کا کام ہے۔

والسلام!

تمہارا والد

تہذیبوں کی ناکامی اور نوشتہ دیوار بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

5 جون 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم

آج شمالی کوریا نے بلیسٹک میزائل کا تجربہ کیا۔ کوریا کا دعویٰ ہے کہ امریکہ بھی اس میزائل کی زد میں آ گیا ہے۔ اس دعوے میں کتنی صداقت ہے؟ یہ تو وقت بتائے گا، مگر بین الاقوامی رد عمل سے دھماکے کی شدت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

امریکہ کو دریافت ہوئے پانچ سو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ اس کو آزاد ہوئے دو سو سال ہو گئے ہیں۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر اس کی اہمیت پہلی جنگ عظیم کے بعد ابھر کر آئی۔ دوسری جنگ عظیم میں اسے فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی۔ بیسویں صدی کے خاتمے پر امریکہ واحد عالمی طاقت کے طور پر اپنے آپ کو منوا چکا تھا۔ اکیسویں صدی کا آغاز بھی امریکی بالادستی سے ہوا۔

گزشتہ پانچ سو سال سے سفید فام اقوام کی گرفت دنیا کے معاملات پر انتہائی مضبوط تھی۔ ان اقوام نے اپنے علم، اپنی محنت اور اپنی جرات سے تمام تہذیبوں کو زیر نگین کر لیا۔ تجربے کی دولت سے مالا مال ہو کر ان اقوام نے دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ ان کے مقابل آنے کی کسی میں سکت نہیں تھی۔ چونکہ مغربی تہذیب کا دامن نظریے سے خالی تھا، لہذا ان کا باہمی ٹکراؤ نوشتہ دیوار تھا۔ لوگوں کو غلام بنانے اور نوآبادیات پر قبضے کی خواہش نے انہیں دنیا کے بڑے قبضہ گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ انہیں اپنی پیداوار کی فروخت کے لئے منڈیاں درکار تھیں، جہاں پر وہ مصنوعات کو منہ مانگے داموں بیچ سکیں اور اپنی رعایا کی جبری محنت کو سستے داموں خرید سکیں۔ غلاموں کی بہتر کارکردگی کے لئے انہوں نے جو نظام بنایا اور جو تعلیمی نظام دیا، وہ بھی استحصالی تھا۔ اس نظام کے خلاف چلنے والی تمام تحریکیں دم توڑ گئیں

اور سفید فام قومیں بلا شرکت غیرے کرہ ارض پر چھا گئیں۔

یورپ، جو پانچ سو سال پہلے تاریک دور (Dark Ages) میں رہ رہا تھا، اب اس کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ قرطبہ کے مسلمانوں کے مدرسہ سے فارغ التحصیل طالب علم نے آکسفورڈ کے دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جو آج دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔

یورپی اقوام کو بندوق سے گولی چلانا آیا تو انہوں نے پوری دنیا کو علمی طاقت، اور اسلحے کی طاقت سے لیس ہو کر اپنی مرضی سے چلانا شروع کر دیا۔ ممالک محروسہ کی آمدنی سے یورپ کے پڑمردہ چہرے پر رونق آگئی۔ نت نئی ایجادات ہونے لگیں۔ مادی ترقی نے یورپ کو لامحدود کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ اہل یورپ نے خطہ ارضی پر موجود علوم کو یکجا کیا اور تحقیق کے بند دروازے کھول دیئے۔ بجلی، ٹیلی فون، ریل اور جہاز نے انسان کو پر لگا دیئے۔ اب وہ چاند اور ستاروں پر کامیابی سے اپنے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ ان کامیابیوں نے انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے اندر غربت اور بیماری کے خلاف جنگ لڑنے کی سکت آئی، انسانوں کی زندگی بہتر ہو گئی۔

انقلاب فرانس ایک ایسا بڑا واقعہ تھا جس نے یورپ کی سوچ کے دھارے تبدیل کر دیئے۔ یقیناً اس کے پیچھے اس وقت کے فلسفیوں کی سوچ کا فرما تھی سوچ کی تبدیلی سے یورپ کے عام آدمی کے گلے سے غلامی کا طوق اترنے لگا تو یورپ کے حکمرانوں نے انہیں نسلی تفاخر کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اسی وجہ سے پہلی جنگ عظیم جیسا سانحہ پیش آیا۔ یورپ کے حکمرانوں کی تو سبب پسندی کی ہوس نے انہیں ایک دوسرے کے سامنے لاکھڑا کیا اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہنے والوں نے انسانی لاشوں کے انبار لگا دیئے، ان کے سامنے چنگیز اور ہلاکو کے مظالم بھی بچ نظر آنے لگے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی اس خواہش کے بطن سے دوسری جنگ عظیم نے جنم لیا۔

ان دو ہولناک جنگوں کے بعد امریکہ اور یورپ نے مل کر ایک نئی بساط بچھائی۔ وقت کے ساتھ ساتھ، روس اور امریکہ کی اہمیت باقی یورپی اقوام سے بڑھ گئی۔ دنیا کو اس طرح

تقسیم کیا گیا کہ کوئی ملک بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا۔ ہر قوم امریکہ یا روس کی دست نگر ہو گئی۔ امریکہ نے آزاد دنیا کا راہنما بن کر اپنا اثر و رسوخ بڑھایا اور روس نے انقلاب کے نام پر دنیا کو اپنا محکوم بنا لیا۔ یورپ کے دوسرے ممالک صدیوں کی لُٹنی ہوئی دولت پر اکتفا کر گئے باقی دنیا کے ملک بظاہر آزاد کر دیئے گئے مگر ان کی معیشت غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہ ہو سکی۔

آج لاطینی امریکہ پر نظر ڈالیں یا افریقہ، مشرق وسطیٰ، وسط ایشیا، جنوبی ایشیا، یا مشرق بعید پر، تو میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شمالی کوریا، جنوبی کوریا اور جاپان کی کشیدگی کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ ویت نام اور کمبوڈیا، تائیوان اور چین کے درمیان اختلاف کے بیج کس نے بوئے؟ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کی تلوار کس نے رکھی؟ افغانستان اور ایران، کویت اور عراق میں مسائل کس نے پیدا کیے؟ اسرائیل کا قیام کون عمل میں لایا؟ افریقہ میں لاگوس، گنی بساؤ، نیسیا، کینیا میں کون سی اسلامی تحریک چل رہی ہے؟ لاطینی امریکہ میں وینزویلا، چلی، کیوبا، برازیل میں کون سا اسلامی انقلاب آرہا ہے؟ کیا وہاں کے غیر مقبول حکمرانوں کو مغربی طاقتوں، اور خاص طور پر امریکہ، نے مسلط نہیں کیا ہوا؟۔

امریکہ اور یورپ، اگر جمہوریت میں ایمان رکھتے ہیں تو وہ پاکستان میں فوجی حکمرانوں کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟ وہ نائیجیریا میں انتخابی نتائج کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ انہیں حماس کی جیت کیوں پریشان کر رہی ہے؟ یہ تو میں جمہوریت اپنے لئے پسند کرتی ہیں، یہ آزاد معیشت کا نعرہ بھی اپنے لئے پسند کرتے ہیں، دوسرے ممالک کی درآمدات پر کوٹا سسٹم نافذ کر کے معیشت کو پابند کر دیتے ہیں۔ اب وہ اپنے ممالک میں کام کرنے والے مسلمانوں کو پابندیوں میں جکڑ رہے ہیں۔ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ محمد، احمد یا محمود نام والے افراد کو اپنی کمائی گھر بھیجنے میں بھی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ آزاد معیشت اور آزاد دنیا کے نعرے دم توڑ رہے ہیں۔ جب تک روس میدان میں موجود تھا، مغربی تہذیب کے داغ دھبے چھپے ہوئے تھے۔ انہیں روس کے مقابلے میں آزاد معاشرے کا راہنما ہونے کا اعزاز

حاصل تھا۔ مگر اب ان کی خامیاں ظاہر ہونے لگی ہیں۔

دنیا کو تقسیم کرتے وقت امریکہ اور مغربی اقوام نے انتہائی سوچ بچار سے اپنے مفادات کا تحفظ کر لیا تھا۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ قدرت کے پاس اس نظام کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے کئی ظاہری اور خواہیدہ طاقتیں ہیں۔ جس کا ادراک انسانی ذہن نہیں کر سکتا۔ جو نئے عوامل ظاہر ہوئے ہیں، انہوں نے طاقت کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کے معلوم تھا کہ گزشتہ صدی کے آخر تک روس، کرغزستان، صحرائے گوپی، افغانستان، ایران، پاکستان، سعودی عرب، وینزویلا، نائیجیریا، انڈونیشیا، عراق، آذربائیجان، تاجکستان، ابو ظہبی، کویت، ازبکستان، تاتارستان کے تیل اور گیس کے ذخائر امریکہ اور یورپی اقوام کے کنٹرول میں نہیں رہیں گے، اور اس کے حصول کے لئے جنگیں لڑنا پڑیں گی، اور ان جنگوں کو دہشت گردی کا نام دینا پڑے گا۔ انہیں آزاد معیشت کا نعرہ لگاتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ چین، بھارت، ملائیشیا، برازیل سستی اشیاء پیدا کر کے انہیں عالمی تجارت میں بے دست و پا کر دیں گے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور مغربی اقوام جمہوریت میں یقین رکھتی ہیں نہ آزاد معیشت میں اور نہ سول سوسائٹی کی بالادستی میں۔ وقت نے ان کے چہروں سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ مغربی تہذیب ایک استحصالی قوت تھی، اب اس کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ مغربی ممالک کی تیز رفتار ترقی نے پوری دنیا کے ماحولیات کو خراب کر دیا ہے۔ ان کے صنعتی اور ایٹمی فضلے نے اوزون کی تہوں میں سوراخ کر دیا ہے۔ دنیا میں Pollution پھیلانے والے ممالک میں ستر فیصد حصہ ان ممالک کا ہے۔ جس کی وجہ سے نئی نئی بیماریاں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن رہی ہیں۔

پانچ سو سال کی یلغار کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔ بے مقصدیت نے یورپ اور مغربی تہذیب کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ وہ صرف اپنی ذات کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تمام رشتے دم توڑ چکے ہیں۔ ترجیحات میں سب سے پہلے بھی ان کی ذات ہے اور سب سے آخر میں بھی ان کی ذات۔ خاندان، ملک، معاشرہ، انسان یہ سب ترجیحات

خلط ملط ہو چکی ہیں۔ جس معاشرے میں ماں بچے کو بوجھ سمجھے اور باپ اس کا باپ ہونے سے انکار کر دے وہ معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اسی دن کے لئے کہا تھا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ کیسے ممکن ہے کہ پورے ماحول میں گندگی پھیلا دی جائے اور اپنے گھر میں پھول اگا کر کہا جائے کہ آپ صاف و شفاف ماحول میں رہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ دنیا میں جمہوریت کو کامیاب نہ ہونے دیں، اور اپنی جمہوریت پر فخر کریں۔ دنیا کی غلط تقسیم کی وجہ سے جنگیں ہوتی رہیں اور کمزور ممالک غیر محفوظ ہو کر اپنے دفاع کے لئے ان سے ہتھیار خریدیں۔ ہندوستان بھی دفاع کے لئے امریکہ کی تجوریاں بھرے اور پاکستان بھی، اسرائیل کو مضبوط کریں اور سعودی عرب کو دفاع کے نام پر لوٹیں۔ چین کے دروازے پر تائیوان میں ہتھیاروں کا ڈھیر لگا دیں، شمالی کوریا کا سامنا کرنے کے لئے جنوبی کوریا کی معیشت پر ہتھیاروں کا بوجھ لا دیں، خطہ ارضی کو جنگ کے دہانے پر لا کر اگر امریکہ اور یورپ یہ سمجھتے ہیں کہ تیسری جنگ ایشیا میں لڑی جائے گی یا لاطینی امریکہ اور افریقہ اس جنگ کا ایندھن بنیں گے تو یہ ان کی بھول ہے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اب ان ممالک کے عوام کا اتحاد استحصالی قوتوں کا مقابلہ کرے گا۔ طلوع صبح کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ متوسط طبقوں میں اتنی قوت آگئی ہے کہ وہ اپنی قیادت پیدا کر سکیں۔ ایران سے احمدی نژاد نے طبل جنگ بجا دیا ہے۔ یورپ کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ نئی ابھرنے والی قوت کا ساتھ دے کر اپنی معیشت اور معاشرت کو محفوظ کرتا ہے یا ٹکراؤ کی صورت اختیار کر کے دنیا کے امن کو تباہ کرنے کے عاقبت نااندیشانہ فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یورپی اقوام جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتیں۔ چونکہ امریکہ کو بیرونی حملوں کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا اس لئے امریکی قیادت کے اندر اس احساس کی اتنی شدت نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں پرل ہاربر پر جاپانی حملہ اور اب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی، دو ایسے واقعات ہیں، جس کے تناظر میں امریکی قوم کو ساری دنیا سے لڑانے کی تیاری کی جا رہی

ہے۔ اگر عالمی برادری کے متفقہ فیصلوں کو قبول نہ کیا گیا تو طاقت ور ترین تہذیبوں کا سراغ لگانے کے لئے بھی آثار قدیمہ کے ماہرین کے فیصلوں کا انتظار کرنا پڑے گا۔

غیر منصفانہ معاشی تقسیم کی وجہ سے تیسری دنیا غربت، بیماری اور جہالت کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہی ہے۔ ستر فیصد قدرتی وسائل کے مالک عوام قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی صنعت کا پیہ چلانے کے لئے تارکین وطن کی محنت بنیادی عامل کا کردار ادا کر رہی ہے۔ اتنی غیر متوازن معیشت کب تک زندہ رہ سکتی ہے؟ مغرب پچھلے پچاس سال میں کوئی مدد برپیدا نہیں کر سکا جو ان حقائق کو سمجھ کر وسائل کی تقسیم کا کوئی فارمولا پیش کر سکے، چھینا جھٹی سے یہ معیشت کب تک چلتی رہے گی؟۔

تازہ ترین اہم پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ ”مقبوضہ“ تیسری دنیا اب دوسری دنیا بن گئی ہے۔ اب ان میں مناقشہ کی جگہ مفاہمت کو اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ پاکستان ہندوستان، چین تائیوان مخالفت کے باوجود مل کر معاشی تعاون پر مبنی پروگرام بنا رہے ہیں۔ اسی طرح جنوبی کوریا کی ہمدردیاں شمالی کوریا کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے ساتھ ہیں۔ نفرت کی دیواریں گر رہی ہیں۔ وینزویلا کاشاویز، جنوبی افریقہ کانیلین منڈیلا اور ایران کا احمدی نژاد لبنان کا حسن نصر اللہ اور مغاؤ دیشو کی قیادتیں ایک صف میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ تیسری دنیا کی معیشت اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ اگر اعتماد کی فضا پیدا ہو جائے تو مغرب کی ایجادات پر انحصار کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔ مغرب کی پیداواری لاگت اسے آزاد مارکیٹ ”اکانومی“ میں سستی اشیاء کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ مغربی اقوام کو پہلے ہی بیروزگاری کا سامنا ہے۔ اگر معاشی مقاطعوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو ایسی کساد بازاری پیدا ہو سکتی ہے جس کا مغربی اقوام نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ مغرب کی معیشت کا آخری سہارا ہتھیاروں کی فروخت ہے۔ جب تیسری دنیا کی اقوام بالغ نظری سے اپنے اختلافات ختم کر دیں گی تو مغرب کا یہ سہارا بھی چھن جائے گا۔

پانچ سو سال کے بعد تاریخ کروٹ لے رہی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس عمل میں تیزی آتی جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا ہوگا۔ مگر جو بات پہلی

مرتبہ ہو رہی ہے وہ زیادہ خوفناک ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ گذشتہ پانچ صدیوں میں جن لوگوں کے پاس کرہ ارضی کو چلانے کا اختیار تھا، انہوں نے ایک ایک جنگ میں لاکھوں انسان مارے ایسے مہلک ہتھیار تیار کیے جن کے استعمال سے بڑے بڑے شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اب یہ خدشات حقیقت کا روپ دھا رہے ہیں کہ سمندر زمین پر چڑھ دوڑیں گے، پہاڑوں سے پانی کی آمد ختم ہو جائے گی، اوزون میں سوراخ ہونے سے ہوائیں زہرا لود ہو جائیں گی، آکسیجن کی مقدار میں کمی ہو جائے گی اور اگر، خدا نخواستہ، ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو میزائلوں، ایٹموں کے ٹکراؤ سے کوئی ذی روح سطح زمین پر باقی نہیں رہے گا۔

خطہ ارضی کو اتنے خطرات سے دوچار کر دینے والی تہذیب نہ صرف خود مٹ جائے گی بلکہ پورے انسانی تمدن کو مٹا کر رکھ دے گی۔ تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نظریہ پیش کرنے والے پہلے اسی تہذیبی ورثہ سے چھٹکارا حاصل کر لیں جو بنی نوع انسان کو ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کی قیادت اب ان خطرناک لوگوں سے لے کر ذمہ دار لوگوں اور قوموں کو دے دی جائے، جو انسانیت سے پیار کرنے والی ہوں۔ فطری طور پر وہی تو میں انسانیت کو بچا سکتی ہیں جو انسان کی عظمت اور برابری میں یقین رکھتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل تیزی سے جاری ہے۔ اس کے راستے میں جو رکاوٹیں یا دشواریاں آئیں گی وہ خود بخود دور ہوتی جائیں گی۔

والسلام!

تمہارا والد!

پیران حرم موجود ہیں۔ علامہ اقبال نے شاید اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا

ہر خرقتہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

جس طرح آج پاکستان کا جغرافیہ پاکستان کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اسی طرح ملتان بھی اپنے محل وقوع کی وجہ سے اس خطہ کا ہمیشہ زندہ رہنے والا شہر بن گیا۔ صحرائے تھل اور صحرائے راجپوتانہ، ملتان کے مغربی اور مشرقی دروازوں کے قریب آکر مل جاتے ہیں اور ملتان شہر کے دفاع میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ حملہ آوروں کو ہزاروں میل ریگستان کو عبور کر کے اسے فتح کرنا آسان نہ تھا۔ شہر کی مشرقی تفصیل کے ساتھ دریائے اردوٹی جسے دریائے راوی کہتے ہیں، بہتا تھا اور مغربی سمت میں دریائے چناب، صحرائے تھل اور صحرائے راجپوتانہ کے درمیان، حد فاصل تھا۔ دونوں اطراف کے دریا اور صحرا ملتان کے لئے بہت بڑی دفاعی حیثیت کے حامل تھے۔

انہی صحراؤں میں گھاگھرا، بیاس اور سرسوتی جیسے دریا گم ہو گئے۔ دریاؤں کے باپ (اباسین) سندھ کو جب اس صحراء کو عبور کرنا پڑا تو اس نے اکلاپے کے خوف سے، جہلم، چناب، راوی اور ستلج کے پانی کو اپنا ہمسفر بنایا۔ پھر کہیں جا کر وہ سمندر سے ملاپ کر سکا۔

ملتان، صدیوں تک سندھ کا دار الحکومت رہا۔ اس وقت ملک کی سرحدیں شمال میں جہلم اور کلر کہار کی پہاڑیوں پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ اور وہاں سے کشمیر کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ کشمیر کے تاریخی رشتے ہندوستان سے نہیں تھے بلکہ وہ چین سنٹرل ایشیا اور ایران سے زیادہ قریب تھا وہ ایشاء کو چک کہلاتا تھا۔ عربوں سے اس کا رابطہ بذریعہ دریائے سندھ ہوتا تھا۔

یونانیوں نے پہلی مرتبہ ملتان اور کشمیر کے درمیانی علاقے کو پانٹنا پوتانیہ، یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین کہا۔ اور بعد میں یہی نام فارسی کے لفظ پنج آب (پنجاب) کے نام سے مشہور ہوا۔ پنجاب، یعنی پانچ پانی۔ اسی طرح یونانیوں کے دریائے سندھ کو انڈس کہنے کی وجہ سے دریا کے پار کے علاقے کو انڈیا کہا گیا اور وہاں رہنے والوں کو انڈوکھا گیا جو بگڑ کر ہندو ہو گیا اور اہل فارس نے اسے ہندوستان کہنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم

جناب پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند (Discovery of India) میں کہا ہے کہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ایک خاص فکر کو ہندو مذہب کے نام سے مخصوص کر دیا گیا۔

اس مختصر سی تحریر میں سارے پس منظر کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے میں چند بنیادی باتوں پر بات ختم کر دوں گا۔ ملتان کی ہمسائیگی میں ایران کی عظیم تہذیب موجود تھی۔ اس کے اثرات کا ملتان تک پہنچنا ایک فطری امر تھا۔ جنوب سے محمد بن قاسم کی قیادت میں عربوں اور شمال مغرب سے محمود غزنوی کی آمد نے اسے اسلامی تہذیب کا مرکز بنا دیا۔ یہ ایک ایسا دار الخلافہ تھا جس کی قلمروں میں موہنجوداڑو، ہڑپہ، ماٹھی گھاگھر اور دریائے سرسوتی اور بیاس کے اردگرد کی تہذیبیں موجود تھیں۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود نے لاہور کو پہلی مرتبہ پایہ تخت بنا لیا۔ داتا گجوری رحمۃ اللہ اسی دور میں لاہور میں تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں اپنا پتہ لکھا کہ میں لاہور میں رہتا ہوں۔ جو ملتان شہر کے مضافات میں ہے۔

مسلمان حکمرانوں نے دلی کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ اس کے باوجود ملتان کو خصوصی توجہ دی گئی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر شمال سے ان کا کوئی بھائی بند حملہ آور ہو تو ملتان ہی اہمیت کا حامل ہوگا اس لئے مشہور ہو گیا جس کا ملتان مضبوط ہے اس کی حکمرانی ہندوستان پر مستحکم رہے گی۔ کہا جاتا تھا جس کا ملتان مضبوط ہے اسی کا ہندوستان مضبوط ہے۔

ملتان پر یونانیوں، ایرانیوں، عربوں، منگولوں اور ساسانیوں نے کئی حملے کیے۔ یہاں قرامطیوں نے بھی حکمرانی کی حملہ آور یہاں کی تہذیب کے نمونے اپنے ہاں لے گئے اور اپنی ثقافت کے نمونے یہاں چھوڑ گئے یہاں کافن تعمیرات سنٹرل ایشاء اور سندھ کے علاقوں پر اثر انداز ہوا۔ تاج محل کی تعمیر کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں ایران سے لے کر تاشقند اور بخارا کے کاریگر موجود ہیں مگر سب سے زیادہ کاریگر ملتان سے تعلق رکھنے والے تھے۔

مغلوں کے دور میں ملتان کو خصوصی توجہ دی جاتی رہی۔ بادشاہ اپنے دلی عہد کو رموز

سلطنت سیکھنے کے لئے ملتان بھیجتے تھے۔ جب مغل کمزور ہوئے تو ملتان میں پٹھانوں نے مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جب سکھوں نے مغلوں سے بغاوت کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا تو انہیں سب سے زیادہ مزاحمت ملتان کی طرف سے ہوئی۔ یہ تاریخ کا دلچسپ پہلو ہے کہ سکھوں نے شمال مغرب میں نہ صرف پشاور پر حکومت قائم کی بلکہ کابل کو بھی فتح کر لیا۔ ہزارہ میں شہروں کے نام ہری پور اور مانسہرہ ان کے جرنیلوں ہری سنگھ اور مان سنگھ کے نام پر رکھ دیئے گئے، مگر ملتان کے لئے انہیں ساٹھ سال تک جنگ لڑنا پڑی۔ 1760ء کے قریب پہلی جنگ ہیرا سنگھ کی قیادت میں لڑی گئی ملتان کی فوجوں نے 1818ء تک سکھوں کا مقابلہ بڑی بے جگری سے کیا 1818ء میں راجہ رنجیت سنگھ نے ملتان پر قبضہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ سکھوں کو اس لئے بھی ملتان کی فتح میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ لاہور کے جنوب میں ملتان تک سکھ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی ان علاقوں میں صرف مسلمان رہتے تھے یا ہندو۔

ملتان کی اسلامی ریاست لاہور کے مضافات رائے ونڈ سے شروع ہو جاتی تھی دیرپا پور کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا شمال میں یہ ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ آخری جنگ میں مظفر خان سدوزی میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے تیرہ بیٹے اور حافظ قرآن بیٹیاں بھی لڑتے ہوئے شہید ہوئیں۔ سکھوں نے وہاں کی ہندو آبادی کو اپنے ساتھ ملایا اور ملتان پر براہ راست حکومت کرنے کی بجائے ایک ہندو دیوان ساون مل کو وہاں کا حاکم (گورنر) بنایا۔ ساون مل کا دور امن کا دور تھا اس کی وفات پر سکھوں نے اس کے بیٹے مولراج کو حاکم ملتان مقرر کیا جس نے ظلم اور نا انصافی کی انتہا کر دی۔ اسے بعد میں قتل کر دیا گیا، اس طرح ستر 70 سالہ سکھوں کے دور کا مزہ بیس 20 سال تک ملتانیوں نے بھی چکھا۔ سکھ بہاولپور کی طرف پیش قدمی نہ کر سکے اور وہاں کی مسلمان ریاست سکھوں کے باغی مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بن گئی۔

سکھوں نے انگریزوں سے پے در پے شکستیں کھائیں اور گجرات میں چیلایا نوالے کے مقام پر انگریز کی بالادستی مکمل ہو گئی۔ ملتان بھی انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔ مگر ذہنی طور پر

وہاں کے عوام انگریز کی غلامی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لہذا 1857ء کی جنگ آزادی میں ملتان کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے تخت دہلی سے وفاداری کے لئے بہادر شاہ ظفر کی حمایت میں بغاوت کر دی۔ ان کی منصوبہ بندی شاندار تھی مگر اپنوں کی جاسوسی اور غداری نے جنگ کا پانسہ انگریزوں کے حق میں پلٹ دیا۔ ہزاروں لوگ شہید ہو گئے۔ کچھ انگریز بھی مارے گئے۔ سکھوں کے قبضے سے پہلے طوائف الملوکی کے دور میں ملتان اندرونی طور پر خود مختار ریاست تھی۔ سکھوں نے اسے اپنی قلمرو کا صوبہ بنا لیا۔ انگریز نے ملتان اور پشاور کو لاہور سے ملا کر اسے صوبہ پنجاب کے کنٹرول میں دے دیا۔ 1901ء میں پشاور کو دار الحکومت بنا کر صوبہ سرحد کو پنجاب سے الگ کر دیا گیا۔ لاہور اور ملتان کو ایک اکائی رہنے دیا گیا۔ جب نہری نظام آیا تو ملتان کو کالونی ایریا بنا کر لاہور اور امرتسر کے لوگوں کو وہاں آباد کیا گیا۔ ان آباد کاروں میں سکھ بھی کافی تعداد میں موجود تھے جو قیام پاکستان کے بعد وہاں سے مشرقی پنجاب چلے گئے۔ پاکستان بنا تو روہتک حصار، جالندھر، فیروز پور اور امرتسر کے لوگوں نے ملتان کی ثقافت کے رنگوں میں اضافہ کیا۔ یہ اس قدیم اور عظیم شہر کی خوش قسمتی ہے کہ وہاں پر ہر زمانہ میں زبان اور ثقافت کے رنگوں کی قوس قزح موجود رہی ہے۔ اس عمل کی وجہ سے وہاں کے صحراؤں اور موسموں کی تلخیاں بھی مٹھاس میں بدل جاتی ہیں۔ باہمی احترام کا منظر دیکھنا ہو تو قلعہ قاسم باغ اس کا مظہر ہے۔ قدیم مندر پر ہلا د اور حضرت بہاؤ الدین ذکریا کے مزار اور مسجد کی دیوار ایک ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں مسجد بنانے کے لئے ہندوؤں کے مذہبی مقام کے تقدس کو پامال نہیں کیا گیا۔ اب قلعہ پر روہتک و حصار کے رہنے والے لوگوں کے مرشد خانہ کے مرد جری حضرت مولانا جامد علی خان صاحب کے مزار کا اضافہ ملتان کی عظمت کا مظہر ہے۔ اسی جگہ ملتان پر حملہ کے دوران مارے جانے والے انگریزوں کی یادگار بھی ایستادہ ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ملتانیوں میں قوت برداشت کی کمی ہے؟

ملتان کو مدینۃ الاولیاء کہتے ہیں۔ امیر خسرو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ملتان جنت اعلیٰ کے برابر ہے۔ یہاں پر پاؤں سنبھال کر چلو کیوں کہ فرشتے قدم قدم پر سجدہ کر رہے ہیں۔

ملتان ما بخت اعلیٰ برابر است

آہستہ پابنہ کہ ملک سجدہ می کنند

چین کے سیاح ہیون سانگ نے اسے تہذیبوں کا مرکز کہا۔ ابوریحان البیرونی یہاں علم کی پیاس بجھانے آیا۔ سعدی شیرازی کو اس شہر کی شیرینیاں کھینچ لائیں۔ سکندر اعظم کے جسم میں پیوست تیر نے فاتح عالم کی جان لے لی۔ ملتانی محنت کرنے والے ہیں۔ رکھ کھاؤ ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا ہے۔ یہ چرب زبان بھی ہیں اور تر دماغ بھی۔ یہاں پر پیدا ہونے والے احمد شاہ ابدالی نے دنیا کے خطے پر ایک نیا ملک بنایا، جس کا نام افغانستان ہے۔ ملتان کے ایک شاعر ارشد ملتانی نے ملتان کی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

ڈھونڈے سے بھی نہ پاؤ گے ارشد جہان میں

خوئے وفا و مہر جو ملتانیوں میں ہے

جب سے انسانی تاریخ لکھنے کا رواج ہوا ہے، ملتان کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔

صدیوں سے لوگ یہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔ یہاں پر جنوبی ہندوستان کی ثقافت کے آثار بھی موجود ہیں۔ مشرقی پنجاب کے بھی اور افغانستان کے بھی۔ لکھنواوردلی کی صاف اردو بولنے والے بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتے، یہاں پر راجپوتوں کی روہتکی زبان کا رنگ بھی موجود ہے۔ تمام لہجوں میں گفتگو کر کے محفوظ ہوتا ہوں۔ چاندھری، ماجھے کی پنجابی، گجرات کی پنجابی، اس دھرتی کو اپنے اپنے رنگوں سے گل رنگ کرتی ہے۔

تمہارے خاندان سمیت 90 فیصد لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ہزاروں سال پرانے لوگ آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے ہیں۔ باہر سے آنے والے آہستہ آہستہ مقامی ثقافت کا حصہ بن گئے ہیں ملتان کا دامن فراخ ہے۔ اس نے تمام جو اہر پارے اپنے دامن میں بھر لیے ہیں۔ اسی لیے تو ہر مورخ نے ملتان کو تہذیبوں کا سنگم کہا ہے۔

والسلام!

آخری ملاقات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

23 جولائی 2006ء

السلام علیکم! مزاج بخیر

میں آج کل روزنامچہ لکھ رہا ہوں کنول کو ہم سے جدا ہوئے آج تیرہواں دن ہے وہ خیالات پر چھائی ہوئی ہے۔ آج کا دن یوں شروع ہوا۔

تالہ کھلا تو باہر باہر نکل کر صحن میں چلنا شروع کر دیا، ایک گھنٹہ واک کرتا رہا پھر آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جس کی وجہ سے شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے آج نسیم سحر کہاں بھٹک گئی تھی۔ کافی دیر درخت کے نیچے گوتم بدھ کی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ مشقتی نے چائے کی پیالی میز پر رکھی تو ”گیان دھیان“ کی محفل بغیر ”زوان“ کے برخاست کرنا پڑی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے براہ راست خلد بریس سے آنے لگے۔ ماحول خوشگوار ہو گیا۔

میں نے بلی کے بچے سے کھیلنا شروع کر دیا، کبھی پرندوں کے پیچھے بھاگتا، پلاٹ میں تھوڑا پانی جمع ہو گیا تو وہاں لاتعداد چڑیاں جمع ہو گئیں میں انہیں دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں جب کوئی بڑا ہو جائے تو بچوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ کچھ لوگ بڑے ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ بچے بن جائیں۔ اسی طرح کی ایک صبح کو میں ایک خوبصورت تلی کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ ڈیوڈھی سے ملاقات کا سندیہ آ گیا۔ اپریل کے آخری ہفتے کی بات ہے بتایا گیا کہ میری چھوٹی بہن زبیدہ اس کے میاں اقبال حسین شاہ ان کی نو بیاہتا بیٹی کنول اور دوسرے بہنوئی نذیر احمد شاہ جو اقبال حسین شاہ کے بڑے بھائی ہیں، ملاقات کے لئے آئیں ہیں۔ یہ دونوں بھائی میرے فسٹ کزن بھی ہیں۔ ان کی اچانک آمد سے میں پریشان ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کنول کے میاں سلیم شاہ کا ساتھ نہ ہونا خطرے کی علامت ہے چونکہ کنول کو لاڈ پیار سے پالا گیا تھا۔ میرا خیال شادی کے بعد کی عمومی مشکلات کی طرف

چلا گیا۔ سلیم شاہ اگرچہ میرا قریبی عزیز تھا اور شادی خاندان کے اندر ہوئی تھی پھر بھی میں پریشان ہو گیا۔ میں تیار ہو کر ڈیوڑھی پہنچا۔ کنول اپنے گھر والے کے ساتھ اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں وہ شادی کے تیسرے دن اپنے میاں کے ساتھ مجھے ملنے آئے تھی۔ اس روز وہ خاموش بیٹھی رہی مگر بہت با اعتماد لگ رہی تھی۔ میں نے اسے اور سلیم شاہ کو چھوٹے چھوٹے تحفے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اس نے جاتے ہوئے صرف اتنا کہا! ماموں آپ کی کتاب کب مکمل ہو رہی ہے۔

آج کی ملاقات میں انتظار کر رہا تھا کہ اب یہ کسی ناخوشگوار واقعے کا ذکر کریں گے لیکن انہوں نے معمول کی باتیں شروع کر دیں۔ میں کن انھیوں سے کنول کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہاں کوئی اضطراب نہ تھا، وہ وقار اور تمکنت سے خاموش بیٹھی تھی، مجھے ہمیشہ اس میں اپنی والدہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کی سنگنی اور شادی کی تاریخ کے مراحل یہیں بیٹھ کر طے ہوئے تھے۔ اُس وقت وہ فرمانبردار بیوی کے روپ میں یہاں موجود تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے اس سے پوچھ لیا کہ سلیم کیوں نہیں آیا؟ وہ کہنے لگی! انہیں ڈیوٹی پر جانا پڑ گیا، ہم دوبارہ اکٹھے آئیں گے، میری جان میں جان آگئی پھر اس نے اپنے سسرال والوں کے نام لے کر ان کی نیک خواہشات مجھ تک پہنچائیں۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

میں واپس لوٹ آیا تو ڈیلے کے پھولوں کے پاس کھڑا ہو گیا میری نگاہیں تتلی کی تلاش میں تھیں وہ مجھے پھول پر نظر نہ آئی۔ میں نے زمین کی طرف دیکھا تو اس کے پروں میں حرکت نہ تھی، چیونٹیاں اس کی لاش کی طرف رواں دواں تھیں۔ اس دن کا منظر میرے سامنے ہے، ڈیلیا کا پودا گرم ہوا کا ایک جھونکا برداشت نہ کر سکا۔ اپریل کے ختم ہوتے ہی اس نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا مگر اس تتلی کی زندگی اور موت کا سفر میری یادوں میں اب بھی محفوظ ہے۔

دس بجے سے ایک بجے تک مطالعہ کیا، ایک بجے کھانا کھایا اور سو گیا، تین بجے جاگا تو باہر امرت رس کی بوندوں نے سماں باندھا ہوا تھا۔ خشک ٹہنیوں میں زندگی کی ایک لہر نظر

آنے لگی۔ شام تک خوب بارش ہوئی۔ صیاد نے صحن میں آکر چایوں کے گچھے کو ہلایا تو میں
 تربیت یافتہ پرندے کی طرح اپنے قفس کی طرف چل پڑا۔ میری محدود سی آزادی شورِ سلاسل
 میں دب گئی۔

کمرے کے اندر کے معمولات شروع ہو گئے، کھانا گرم کرنا، خبریں سننا، کتابیں
 پڑھنا، گردشِ حالات کا نوحہ اور پھر خوابِ استراحت۔ مگر آج میرے جاگتے خوابوں پر کنول
 کا چہرہ چھایا ہوا تھا، اس کے بچپن کا چہرہ، ایک ننھی پری کا چہرہ، ہر وقت متحرک رہنے والی تلی
 کا چہرہ۔

پہلا قدم بسم اللہ الرحمن الرحیم

24 جولائی 2006ء

میمونہ بی بی! مزاج بخیر!

آج صبح سے ساون رت کی رم جھم نے سماں باندھا ہوا ہے۔ باد شمالی جسم سے مس کرتی ہے تو روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ مگر میری زندگی کے صحرا میں بگولوں کا رقص جاری ہے۔

میں کھڑکی سے آم کے درخت کے پتوں سے پانی کی بوندوں کو گرتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک یوں لگا یہ پانی کی بوندیں نہیں بلکہ لبنان اور اسرائیل کے بچوں کے جسم سے رستا ہوا لہو ہے۔ کوئی اگر اسے زلف یار سے ٹپکنے والے پانی سے تشبیہ دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میری آنکھیں تو گدھا گاڑی میں بیٹھے بچے کے گدھے پر برسنے والے چابک سے سیل رواں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل کے خون سے دیدہ یعقوب کیوں نہ بنتیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں بھی عجیب آدمی ہوں، جیل خانے کی ایک کال کوٹھڑی میں پڑے سارے زمانے کے غموں کو خوشیوں میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چڑیا سے بھی چھوٹے پرندے کو مولہ کہتے ہیں، یہ رات کو سوتے ہوئے ٹانگیں آسمان کی طرف کر لیتا ہے۔ بڑے کہتے تھے وہ سمجھتا ہے اگر آسمان گر گیا تو وہ اسے اپنی ٹانگوں پر روک لے گا۔ ہم کیا ہماری اوقات کیا؟ مگر علامہ اقبال بھی بڑے مزے کی چیز ہیں۔ وہ اسی مولے کو شہباز سے لڑانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کی فکر نہیں کہ باز کا مقابلہ پدی کرے گی تو نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ شہباز کو چیلنج کرنے والا کوئی تو ہو۔ ان کی زندگی میں اسے سب سے زیادہ پسند آنے والا پرندہ باز تھا مگر وہ نہیں چاہتے کہ فضاؤں پر اس کی حکمرانی بھی بلا شرکت غیرے ہو۔

لبنان کی جنگ نے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ ایک طرف دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس سریع الحریکت فوج ہے تو دوسری طرف حزب اللہ کے چند سر پھرے۔ لبنان دنیا کا

ایسا ملک ہے جس کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں۔ اسرائیل کی پشت پر دنیا بھر کا یہودی میڈیا ہے، جب کہ حزب اللہ کی ترجمانی لبنان کی حکومت بھی کھل کر نہیں کرتی۔ ہاتھی کا مقابلہ چیونٹی سے ہے۔ زمانہ پھر ابابیل سے ہاتھی والے کا غرور خاک میں ملتے دیکھ رہا ہے۔ پانسہ پلٹ چکا ہے۔ جنگ کی آگ بھڑکانے والوں کا اپنا دامن زد میں ہے۔ کون کہتا ہے کہ یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ یقین کامل ہو تو آگ کو گلزار میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔

آنگن کے گلابوں اور دل میں پھوٹنے والے شگوفوں کا حال یکساں ہے۔ بارش کے ہوتے ہی گلاب کی پتیوں کا رنگ میرے خون شہیداں کی طرح دکنے لگا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لعل بدخشاں کی فصل آگ آئی ہے۔ چند روز پہلے کی کیفیت عجب تھی۔ جونہی کلی مسکرانے کی کوشش کرتی، سورج کی کرنیں اس کی مسکراہٹ اُچک لیتیں۔ دھوپ کی تمازت اس کا رنگ چاٹ لیتی۔ ایسے لگتا ہے کلی سورج کے خوف سے سہم کر سکر گئی ہے۔ یہ خوف کا سفر اسے موت کی وادی میں لے جاتا اور وہ رزق خاک ہو جاتی۔ پھول پیدا ہوتے ہی مرجھا جاتے، میں پودوں کو زیادہ سے زیادہ پانی دیتا۔ مگر نتیجہ پھولوں کی مرگ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اچھے موسموں کی امید پر بڑی مشکل سے پتوں اور شاخوں کو بچا سکا۔ بارش کی بوندوں نے پودوں کو آب حیات پلا دیا۔ اب گلاب تازگی کا پیغام بن گیا ہے۔ دیواروں سے سبزے نے جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔ سورج کا غصہ بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چمن میں ایسی پتیاں بھی ہیں جن سے ہیرے کے جگر کو کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ طبل جنگ زور سے بج رہا ہے۔ ساز کی دھنیں تیز ہو گئی ہیں۔

اٹھا سا قیا پردہ اس راز سے لڑا دے ممولے کو شہباز سے

میمونہ بی بی! تم نے ہمت نہیں ہارنی!! موسم گل تو دہلیز پر منتظر کھڑا ہے!!!۔

میں نے صحن چمن پر نظر دوڑائی تو نئے پرندوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کوئل کی کوک تو اکثر سنتا ہوں۔ چکور چکویاں، اگن پیسے بھی بے تکلفی سے گھوم رہے ہیں۔ مگر کبھی جب موسم اچھا ہو تو ایسے خوبصورت پرندے بھی آجاتے ہیں جو دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملتے۔ ”دل کا موسم اچھا ہو تو ان ہونی بھی ہونی ہو جاتی ہے۔“

میں نے زندگی میں ایک چیز کا بار بار تجربہ کیا ہے اور اس میں مجھے کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ میرا یقین کامل ہے کہ اگر انسان کسی چیز کا ارادہ کر لے اور اس ارادے پر عمل کرنے کے لئے ایک قدم چل پڑے تو فضا میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو اس کی ساتھی بن جاتی ہے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لئے انسان کی مدد کرتی ہے۔ یہ قوت اللہ کی ذات ہے۔ تم اس بات کو اچھی طرح جانتی ہو کہ گھر کی معاشی حالت کیسی رہی ہے۔ تم بارہا اندیشوں اور پریشانیوں میں گھر جاتی ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ یہی بتایا کہ اللہ تعالیٰ ضرور راستہ نکالے گا اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جس سال تم سمجھتی تھی کہ فاقوں کی نوبت آسکتی ہے، اس سال ہمیں اللہ نے سب سے زیادہ نوازا۔ تمہیں یاد ہے جب آمنہ اور سعدیہ کی شادی کے دن طے کیے تھے، شادی کے دعوتی کارڈ چھپوانے کے پیسے نہیں تھے، لیکن اس کی مہربانی سے وہ شادیاں انتہائی پروقار طریقے سے ہو گئیں۔ تین سال قبل میری گرفتاری کے بعد تم نے گھر میں کفایت شعاری کرتے ہوئے گوشت پکانے پر پابندی لگا دی۔ آج تین سال بعد غور کرو اللہ نے کتنی نعمتوں کی بارش کر دی ہے۔ تم نے اسی سال کتنی بیوہ اور بے سہارا عورتوں کی اپنے ہاتھ سے مدد کی ہے۔ کتنے لوگوں کو اپنے اداروں میں روزگار فراہم کیا ہے، کتنی بے سہارا بچیوں کی تعلیم کا بندوبست کیا ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایات پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

میمونہ بی بی یاد رکھو! یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ پہلا قدم تم خود اٹھاؤ پھر دیکھو تمہارے بوجھ کو بانٹنے والی قوت کیا کرتی ہے۔ تم تو میری زندگی کے نشیب و فراز کے تمام مراحل میں میرے ساتھ رہی ہو تمہارا حوصلہ پہاڑوں سے بلند ہونا چاہیے۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

قیدی کا قیدی سے رابطہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی! مزاج بخیر!

آج خواجہ سعد رفیق نے کیمپ جیل سے میرے نام ایک خط بھیجا، جہاں ڈاکٹر سرفراز نعیمی، سید زعیم قادری اور دیگر مجاہدانہ رسالت مآب ﷺ کے ساتھ حرمت رسول ﷺ کے تحفظ کے جرم میں قید بے گناہی کاٹ رہے ہیں۔ ہمارے حکمران ذاتی انتقام میں اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ وہ گستاخان رسول کے خلاف تحریک کو اپنے خلاف سمجھ کر ایوانوں میں بیٹھے لرزنے لگتے ہیں، حضور ﷺ کی ذات کی اہانت کوئی مسلمان کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دیں ہمہ دوست

اگر باد زسیدی تمام بولہسی است

مغرب کے غیر تہذیب یافتہ دانشوروں کا اس طرح حضور ﷺ کی ذات کو دہشت گردی کے کارٹونوں کے ذریعے بطور نمونہ پیش کرنا، صرف مسلمانوں کی دل آزاری ہی نہیں، ان دانشوروں کی کم علمی اور ذہنی پراگندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سعد رفیق نے اس خط میں جہاں ملکی حالات کا تذکرہ کیا۔ وہاں سیاسی طرز عمل سے پیدا ہونے والے خدشات کا بھی ذکر کیا۔ ذہن میں آیا تمہیں بھی اس سوچ سے آگاہ کروں تاکہ تمہیں زمینی حقائق کا سامنا کرنے میں آسانی ہو۔ تم نے اچھا کیا جو زعیم اور سعد کے اہل خانہ سے مل کر ان کی ہمت بندھائی۔ تم اس درد کو جان سکتی ہو جو کسی گھر کے سربراہ کے جیل جانے پر گھر والوں کو محسوس ہوتا ہے۔ تم گاہے بگاہے ٹیلی فون پر بھی ان کے بچوں کی خیریت معلوم کرتی رہا کرو، زعیم کا بیٹا بہت چھوٹا ہے اسی طرح خواجہ سعد رفیق کا بیٹا اور بیٹی بھی شیر خوار ہیں۔

بہر حال خط پڑھو اور پھر اس خط کے بارے میں اپنی رائے سے بھی آگاہ کرنا۔

برادر محترم ہاشمی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

جب سے کنج قفس رسول ہاشمی ﷺ سے محبت اور مملکت خداداد کی محافظت کے صلے میں پھر سے ہمارا مسکن قرار پایا ہے، دل مضطرب طویل عرصہ کے بعد پرسکون ہوا ہے۔ سید زعیم قادری اور ڈاکٹر سرفراز نعیمی سے روزانہ ملاقات کی صورت بنی ہوئی ہے۔ آپس کے مباحث نے ماحول کو اچھا خاصا گرمایا ہوا ہے۔ تجزیہ نگاری کا فن عروج پر ہے۔ البتہ جب بھی باہم بیٹھتے ہیں، آپ کی قید تنہائی دل فگار ضرور کرتی ہے۔ پھر سوچتے ہیں کہ ہاشمی زادہ الگ تھلگ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ کون سی طاقت ہے جو اسے اپنے اجداد کی ارواح کے جلو میں آزادی کے گیت سننے سے روک سکے؟ کون سا ضابطہ ہے جو اسے اذان حق کا موذن بننے سے باز رکھ سکے اور کون سی دیوار ہے جو اسے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں سن لینے سے دور رکھ سکے؟؟؟

ہونٹ سی دینے سے دہتی نہیں آواز دروں

یہاں کیمپ جیل کے بام و در میں اب تک آپ کی خوشبو رچی ہے۔ خوشبو کا یہ سفر رات گئے کوٹ لکھپت جیل میں آباد آپ کے آشرم تک دراز ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو بن دیکھے، بن سننے ہی ہمیں ایک دوسرے کو محسوس کرنے پر قادر کر دیا گیا ہے۔ الحمد للہ سرکار نے سلمان کو پیغام بھجوایا تھا کہ سعد کا حشر جاوید ہاشمی سا کریں گے۔ 7 سال قید کی سزا کے لئے تیار رہو۔ جو اب سلمان نے کہلا بھیجا ہے کہ ہم خدائے عزوجل سے دعا گو ہیں کہ ہمارے بھائی کو جاوید ہاشمی سا عصائے کلیمی عطا ہو اور پاکستان کے حاکموں سی خراج کی گدا کبھی اس کا مقدر نہ ٹھہرے۔ آمین

فتنہ پرویزی کے دور استبداد میں اگر دوبارہ اسیری کا اعزاز نہ ملتا تو شاید بعد از مرگ بھی اس کا قاتل رہتا۔ ہماری خوش نصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام پاکستان اور جمہور کے دفاع کی جنگ میں پھر سے آپ کی ہمرکابی میسر آگئی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے

کہ پاکستان سے آمریت کے آسیب کا خاتمہ افغانستان، بھارت، کشمیر اور ایران تک مسلم مفادات کے خلاف رو بہ عمل شیطان کی مجلس شوریٰ کی عبرتناک شکست کی بنیاد بنے گا۔ سو آپ اور آپ کے رفیقان سفر، درحقیقت، خطے کے 50 کروڑ سے زائد مسلمانوں کی آزادی و سر بلندی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گو، فی الوقت، یہ جنگ مختلف گروہوں علاقوں اور پرچموں تلے مقامی قیادتوں کے تحت اپنے اپنے انداز میں لڑی جا رہی ہے، لیکن میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ مسلم بقا کی مربوط جدوجہد نہ صرف ہم اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ سکیں گے بلکہ شریک عمل بھی ہو پائیں گے۔

الحمد للہ، پاکستان ابھی تک افغانستان، عراق، چینیا یا کشمیر سی جنگی ہولناکی کا سامنا کرنے سے بچا ہوا ہے۔ بالخصوص افغانیوں، کشمیریوں اور عراقیوں کی تاریخ ساز مزاحمت نے ہمیں وقتی طور پر، براہ راست، جنگ سے ذرا دور تو کر دیا ہے، لیکن کب تک؟؟؟

آج شیطان بٹش کے چیلے چائے ”ذین پرویزی“ کی فتنہ آرائیوں سے لیس ہو کر مملکت خداداد میں طاقت کے متبعوں پر قابض ہیں۔ ملک کو بحرانوں سے بچا کر سلامتی کی راہ پر گامزن کرنا قائد اور اقبال کی وراثت کی علمبردار مسلم لیگ (ن) کی اولین ذمہ داری ہے۔ آپ نے اور آپ کے بعض رفقاء نے بلاشبہ مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے۔ مگر بطور جماعت کیا کچھ کیا جانا چاہیے تھا اور کیا کچھ نہیں ہو سکا؟ ایک توجہ طلب موضوع ہے۔ پس دیوار زنداں بھی آپ کے ترانہ آزادی کی گونج اقتدار کے ایوانوں سے میدانوں اور کھلیانوں تک ہر جگہ سنائی دے رہی ہے۔

میاں نواز شریف کے بے لچک اصولی موقف نے اسے دو آتشہ کر دیا ہے۔ مگر میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ ہمارے اکثر راہنما شاید معجزے کے انتظار میں ہیں۔

”اگلی صفوں میں لڑنے کے عادی کچھ لوگ جنگ لڑتے لڑتے دشمن کے مورچوں تک جا پہنچے ہیں، جہاں چو کھی لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ جب کہ ہمارے بیشتر ساتھی اپنی جگہ کھڑے دور ہی سے جنگ کا نظارہ اور نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

اس حوالہ سے جماعتی قیادت نے میرے متعدد تحفظات اور سوالات کا جواب نہیں دیا۔
 بہر حال مجھے یقین ہے کہ وطن عزیز میں اسلامی اقدار، آئین، انصاف، جمہوریت اور شہری
 آزادیوں کی بحالی کے لئے جاری تحریک مزاحمت کی کامیابی اب بہت دور کی بات نہیں
 رہی۔

خدائے بزرگ و برتر قافلہ حسین رضی اللہ عنہ کو پیش قدمی کرتے رہنے کی تقویت و توفیق

عطا فرمائے۔ انشاء اللہ

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک اس خون میں حرارت ہے جب تک
 اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک
 ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورش برہم و
 وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامہ طبل قیصر و کے

خدا حافظ

آپ کا تحریکی ساتھی

سعد رفیق

کیمپ جیل لاہور

انجیل مقدس سے مشکوٰۃ شریف تک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بشری بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

جیل میں موسم کی سختیاں عام زندگی سے کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ خاص طور پر ہم جیسے لوگ جو آرام دہ زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں ان پر موسم کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جیل سوچ بچار کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔ میں آج کل مذاہب عالم کا تقابلی جائزہ لے رہا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے میں پانچ سو سے زائد کتابیں جمع کر لی ہیں۔ لائبریری کے قیام سے اپنی جہالت میں کچھ کمی لانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ احباب میں سے جو کوئی بھی کتاب لاتا ہے میں اسے بہترین تحفہ سمجھتا ہوں۔ جب تک کتاب کا مطالعہ مکمل نہ کر لوں چین نہیں آتا۔ جونہی کتاب پڑھ لیتا ہوں، دوسری کتاب کے حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرتا ہوں۔

تمام مذاہب خدا کی تلاش کے لئے انسان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ عادلانہ نظام کو تسلیم کرنا اور شہریوں تک اس کے ثمرات پہنچانا حکمران کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے اور اگر وہ کسی سبب سے ایسا نہ کر سکے تو اپنے ساتھ شہریوں کی جہالت کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے قیصر روم کو لکھا: "میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں، اگر اسے مان لو گے تو دنیا میں بھی بچے رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا ڈگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں، ان کے تم ذمہ دار ہو گے۔ ہم نے کوئی راہ عمل متعین نہ کی تو موجودہ ابتلا و مصیبت برداشت کرنا عوام کے نزدیک بے مقصد ہو جا یگا، اور عوامی گمراہی کا سبب صرف قیادت ٹھہرے گی۔ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ نظام عدل

قائم کرنا سیاسی قیادت کی حقیقی ذمہ داری ہے۔ دنیا میں صرف ظالم اور مظلوم طبقات ہی پائے جاتے ہیں۔ بقول شاعر!

غریبوں کے جہاں میں وقت بھی رُک رُک کے چلتا ہے!
کہیں صبحیں نہیں ہوتیں کہیں شامیں نہیں ہوتیں

انسانیت تمام طبقات کی فلاح کے اصول کو اپنانے سے ہی سرخرو ہوگی۔

انجیل مقدس سے مشکوٰۃ شریف تک غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی خدمت کو خدا کی تلاش کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ نفس مضمون دونوں جگہ ایک ہی ہے، اگرچہ پیرایہ مختلف ہے۔ کہیں کہا گیا، میں بیمار ہوا تھا تم نے میری خبر گیری نہ کی، مجھے قرض چاہیے تھا تو نے مجھے قرض نہیں دیا تھا، کہیں کہا گیا کہ "قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم! میں بیمار ہو گیا لیکن تو نے میری خبر تک نہ لی؟ انسان کہے گا، اے میرے پروردگار! تو تو ساری اقوام کا رب ہے، تیری خبر گیری میں کس طرح کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھے خبر نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا لیکن تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر تو اُس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اُسکے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم، میں نے بھوک میں تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ انسان کہے گا، یا اللہ تو ساری دنیا کا پروردگار ہے، تجھے کھانا کس طرح دیتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھے خبر نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے نہ دیا، اگر تو اسے کھانا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے پیاسا ہو کر تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھے پانی نہ دیا۔ انسان کہے گا یا اللہ! تو تمام اقوام عالم کا پروردگار ہے، تجھے پانی کس طرح دیتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اسے دیا نہیں۔ تجھے خبر نہیں کہ اگر تو اسے پانی دے دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ جو انسان خدا کو تلاش کر لیتے ہیں جب وہ دوسرے انسانوں سے اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتے ہیں جو خدا اور ان کے درمیان ہوتی ہے تو حیران کن حد تک ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ خدا انہیں کہتا ہے میں لوگوں میں رہتا ہوں اگر مجھے تلاش کرنا چاہتے ہو تو لوگوں

کے پاس جاؤ میں تمہیں ان کے پاس ملوں گا۔
 حکمرانوں کے بارے میں کہا گیا ہر راعی کو اپنی رعیت کے بارے میں قیامت کے روز
 حساب دینا ہوگا۔

اس کے جواب کیلئے ابھی سے تیاری کرنی ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی۔

والسلام!

تمہارا والد!

انسٹھ سالہ آزادی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

14 اگست 2006ء

میسونہ بی بی! السلام علیکم!

آج پاکستان کو بنے۔ انسٹھ سال ہو گئے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس دن کو خاص اہتمام کے ساتھ منایا۔ آج بھی میں اٹھ کر غسل کیا، کپڑے بدلے، خوشبو لگائی اور بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو کر شکرانے کے نفل ادا کئے۔ آزادی کے حصول میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے لئے فاتحہ پڑھی۔ قائد اعظم، علامہ اقبال اور دیگر راہنماؤں کے لئے بھی دعائے مغفرت کی۔ لبنان، فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق اور چینیا کے مجاہدین کی کامیابی کے لئے خدائے بزرگ و برتر سے نصرت کی التجا کی۔

میسونہ بی بی! گذشتہ سات سال میں، میں چھٹا یوم آزادی جیل کی چار دیواری کے اندر

منار ہا ہوں۔

آج بھی کمرے کی جالیوں سے آزادی کی صبح کا منظر دیکھنے کی کوشش کی مگر میری نظر پھانسی گھاٹ کی دیواروں سے آگے نہ جاسکی۔ میرے سامنے ہر وقت پھانسی کا پھندا لٹکتا رہتا ہے۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر اس کے اوپر سے ڈیوڑھی پر لہراتے پرچم کو دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ سب بے سود تھا پانچ بجے کے قریب صحن میں آیا تو ڈیوڑھی کے کھبے پر لگے پرچم کو ابھی تک نہیں کھولا گیا تھا۔ جیل میں یوم آزادی سرکاری طور پر منایا جاتا ہے، لیکن مجھے کسی ایسی اجتماعی دعا میں شمولیت کی اجازت نہیں۔ میرے پاس جو قیدی کام کرنے آتے ہیں انہیں آزادی کی مبارکباد دیتا ہوں اور وہ مجھے۔ ہم قیدی ہو کر آزادی کی مبارکباد وصول کرتے ہیں اگر پاکستان نہ بنا ہوتا تو شاید کشمیریوں کی طرح جیل سے باہر ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو آزاد ہونے کی مبارکباد پیش نہ کر سکتے۔

لبنان اسرائیل جنگ کی وجہ سے آج کا دن اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ لبنان نے فوج نہ ہونے کے باوجود دنیا کی مضبوط ترین عسکری قوت کا سر جھکا دیا۔ ہمارے پاس دنیا کی منظم ترین فوج ہونے کے باوجود ہمارا سر امریکہ کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ حزب اللہ نے اسرائیل کو شکست دے کر عسکری تاریخ کو نیا موڑ دے دیا ہے۔ اب یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ بڑی فوجیں آزادی کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنی حفاظت کرتی ہیں اور اپنے وجود کو بچانے کے لئے ملک کا وجود گروی رکھ دیتی ہیں۔ خاص کر مسلمان ملکوں میں ایک نئی لہر کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ گزشتہ ساٹھ سال میں افریقہ، لاطینی امریکہ اور دیگر ایشیائی ممالک نے اپنی فوجوں کی بالادستی سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ نیپال جیسے ملک میں بھی فوج نے عوام کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔ صرف مسلمان ممالک اب تک اپنی افواج کے یرغمال بنے ہوئے تھے۔ حزب اللہ کی کامیابی نے انہیں نئی جہتوں سے روشناس کر کے ایک نئے انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میں نے آج صبح دعا بھی مانگی تھی کہ یا اللہ ہماری فوج کو امریکہ کی غلامی سے آزاد کر اور پندرہ کروڑ عوام کو فوج کی غلامی سے۔

ہندوستان نے اسرائیل سے شہ پا کر ہمیں دھمکی دی تھی کہ وہ اسرائیل کی طرح پاکستان کے دہشت گردوں کا پاکستان کی سرزمین کے اندر تک پیچھا کرنے کا حق استعمال کرے گا۔ امریکہ کے دائٹ ہاؤس کے ترجمان رچرڈ باوچر نے ہندوستان کے اس اقدام کی حمایت میں بیان جاری کر دیا تھا۔ ہمارے حکومتی ادارے اپنی بے بسی کا ماتم کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج سے آزادی کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج 14 اگست کو 7 بجے صبح سے جنگ بندی کی قرارداد پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا اور عالمی تاریخ ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ آج کے بعد نہ وہ اسرائیل رہے گا اور نہ وہ مشرق وسطیٰ بلکہ عسکریت کی بالادستی کے قلعہ میں جو شکاف پڑا ہے وہ آگے جا کر عوام کی فتح کی نوید بن جائے گا، جو کام مصر، سعودی عرب، لیبیا، اردن، شام کی افواج مل کر نہ کر سکیں، وہ ایک محدود

سی عوامی قوت نے کر کے دکھا دیا ہے۔ نام نہاد عظیم افواج کی اپنے عوام کے سامنے مٹی پلید ہو گئی۔ یہ اب معیشت پر بوجھ نظر آنے لگی ہیں۔ ان افواج کی وجہ سے عالم اسلام آج کی گرفت میں ہے اور ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے عالمی قوتوں کی گرفت میں۔ عالمی قوتوں کے لئے کسی فوج کے اندر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا نہایت آسان ہوتا ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک ارب سے زیادہ مسلمان قوم کی آزادی سلب کی ہوئی ہے۔ عراق کی روایتی فوج کا بہت بڑا حصہ اپنے عوام سے جنگ لڑ رہا ہے۔ عالمی قوتوں کی قدرتی وسائل والے ملکوں پر گرفت کو موثر بنانے میں روایتی فوجیں کارآمد ذریعہ ہیں۔

امریکہ نے جو، بظاہر، جمہوریت کا چیمپین (Champion) بنتا ہے، ایک صدی تک جنوبی امریکہ میں جمہوریت کے خلاف سازشیں کیں اور وہاں کے ڈکٹیٹرز کی حمایت کی لیکن وہاں اس کی سازشیں دم توڑ چکی ہیں، آخری ضرب ویز ویلہ کے عوام نے لگائی ہے جنہوں نے فوجی انقلاب ناکام بنا کر اپنے منتخب صدر شاویز کو دوبارہ اقتدار کی کرسی پر بٹھا دیا ہے۔ افریقہ میں یورپی ممالک اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ قرآن بتاتے ہیں افریقہ، کافی حد تک بیرونی اثر و رسوخ سے بہت جلد چھٹکارا حاصل کرے گا۔

مشرق وسطیٰ میں امریکہ نے، عراق میں اور آگے بڑھ کر افغانستان میں برائے نام جمہوریت کا شوشہ چھوڑا ہے، جب کہ حقائق اس کے اس دعوے کے خلاف ہیں۔ نائیجیریا، فلسطین، صومالیہ، سوڈان، لبنان، ایران اور پاکستان میں جہاں جمہوری نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور پارلیمنٹ کا ادارہ بھی کام کر رہا ہے، امریکہ ان ملکوں کے عوام کے فیصلے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ دنیا بھر کے عوام، بالعموم اور مسلمان ممالک کے عوام بالخصوص، امریکہ کی پالیسیوں کے سخت مخالف ہیں۔ اس لئے وہ ان ممالک پر گرفت مضبوط کرنے کے لئے، وہاں کی افواج کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ اسے حسنی مبارک، قذافی، سعودی عرب اور اردن کی شہنشاہیت سے خطرہ نہیں ہے۔ اسے وہاں کے عوام سے خطرہ ہے۔ اس لئے وہ غیر مقبول حکومتوں کی سرپرستی کر کے انہیں مسلمانوں

کے مفادات کے خلاف استعمال کرتا رہتا ہے۔ حزب اللہ کی کامیابی نے اس کے خواب چکنا چور کر دیئے۔ آج کا دن دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کی فتح کا دن ہے۔ حزب اللہ اور اس کے راہنما حسن نصر اللہ یقیناً ہمارے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

میمونہ بی بی، میں نے گذشتہ ڈیڑھ سال میں قرآن حکیم کو عربی گرامر سے ترجمہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارا سینہ قرآن سے منور ہے، میں تمہیں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کو سمجھنے کے لئے بھی قرآن مجید سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، دین کی تو اساس یہی منبع فیض ہے، یقیناً اندھیرے سے اجالے کی طرف لے آتا ہے۔ میں آج کے یوم آزادی کے موقع پر تمہیں اس سے بڑی کوئی نصیحت نہیں کر سکتا کہ تمہیں قرآن میں غوطہ زن ہونے کی تلقین کروں۔ قرآن کا چراغ جس دل میں فروزاں ہو جائے تو دنیا بھر کے اندھیرے اس سے بھاگتے ہیں۔ جب بچپن میں تم قرآن حفظ کر رہی تھیں تو مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ قرآن فہمی کتنی ضروری ہے۔ مگر اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قرآن کا حفظ کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ مگر اس کا سمجھنا شاید اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے دینی مدارس نے گزشتہ کئی صدیوں سے صرف قرآن کے حفظ کرنے پر زور دیا۔ شاید یہ اس دور کی ضرورت بھی تھی۔ مگر قرآن کے اندر چھپے ہوئے علم کے خزانوں تک پہنچنے کے لئے اب یہ بہت ضروری ہے کہ قرآن کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اسوہ رسول ﷺ کو سامنے رکھ کر زندگیوں کو نمونہ بنانے میں کافی محنت کی اور سیرت رسول ﷺ کو قرآن کا عملی نمونہ سمجھتے ہوئے اپنے کردار کو ایک خاص رخ پر چلایا۔ مگر حضور ﷺ نے قرآن فہمی پر بار بار زور دے کر یہ نکتہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ قرآن پر عمل کرنے میں ہی امت کی فلاح ہے۔ عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان کو کسی کام کی سمجھ آچکی ہو۔

میں واپس اپنے گاؤں کے سکول میں پہنچ گیا ہوں، جہاں گرمی کی چھٹیوں میں 14

اگست کو سکول بند ہونے کی وجہ سے تقریب آزادی منانے کا رواج نہ تھا۔ میں نے رات دن محنت کر کے کچھ اساتذہ کو اس دن کے لئے اپنے اپنے گاؤں سے سکول آنے پر آمادہ کر لیا۔ پہلے سال چھوٹی سی تقریب ہوئی، اس روز سبز ہلالی پرچم لہرانے کا نشہ آج تک نہیں اتر سکا۔ دوسری تقریب اس سے کہیں بڑھ کر تھی میں نے سکول سے کالج کا سفر کیا۔ آخری سال کی تقریب بہت حسین تھی۔ اس وقت بھی میرے سامنے وہ پرچم ہوا میں لہرا رہا ہے۔ میں کنول کے جنازے میں شرکت کے لئے گیا تو وقت بہت مختصر تھا۔ میں اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ بھی نہ پڑھ سکا۔ سکول کے گراؤنڈ میں کنول کا جنازہ پڑھتے ہوئے میں نے دیکھا وہ سٹیج اسی طرح موجود تھا جس پر میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کا پرچم لہرایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آج اس وقت جب میں جیل کی ڈیوڑھی پر پاکستان کا پرچم لہراتے دیکھ رہا ہوں، سکول کے گراؤنڈ میں معصوم بچے اس پرچم کو تھام کر قومی ترانے گا رہے ہوں گے۔

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں

جس وطن کے پاسبان عوام بن جائیں، اُس ملک کی آزادی کو اسرائیل اور امریکہ مل کر بھی نہیں چھین سکتے۔

والسلام!

تمہارا والد

زندہ دلوں کا شہر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

27 جولائی 2006ء (جمعرات)

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج ہسپتال گیا تھا لاہور کے کوچہ و بازار سے گزرا تو ماضی سامنے آ گیا لاہور کی تاریخ پر پھر کبھی لکھوں گا فی الحال آج کی ڈائری کا کچھ حصہ پیش نظر ہے۔

صبح نماز کے بعد دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا پھانسی کی وجہ سے جیل کی بیروں کے تالے دیر سے کھولے جاتے ہیں مجھے بھی کافی دیر بعد کمرے سے نکلنے کی اجازت ملی۔ ساری رات کا جاگا ہوا تھا اس کے باوجود ایک گھنٹہ واک کی سوا سوات بچے سو گیا دو گھنٹے بعد اٹھ کر دانتوں کے علاج کے لئے ہسپتال جانے کی تیاری کی دس بجے کے قریب پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ چراگاہ میں بھینسیں اور گائیں گھاس چر رہی تھیں دو چرواہے آپس میں گتھم گتھا ہو کر زور آزمائی کر رہے تھے ہمارے دیکھتے دیکھتے دو بھینسے بھی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے معلوم نہیں ان پر انسانوں کا اثر ہو گیا تھا یا چرواہوں کی زندگی پر ان کے اثرات تھے جس گھاس کو وہ چرنا چاہتے تھے وہ ان کے پیروں تلے روندی جا رہی تھی شاید ان کے پیٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ اس گھاس کو دوسرے جانوروں کے کھانے کے قابل نہیں رہنے دینا چاہتے تھے یہ انسانوں والی عادتیں جانوروں میں کب سے آگئیں؟

ریلوے کا پھانک پار کیا تو ایک بڑھیا جس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا ہاتھ میں لاٹھی لئے بکریوں کے ریوڑ کی رکھوالی کر رہی تھی وہ بہت ضعیف تھی مگر بکریوں پر اس کا مکمل کنٹرول تھا وہ جدھر لاٹھی کا اشارہ کرتی بکریاں اسی سمت چلنا شروع کر دیتیں میں سوچنے لگا

یہ بڑھیا کا کمال نہیں لاٹھی کا کمال ہے ہمیں ایسے حکمران بھی ملے ہیں جو فالج زدہ تھے ان کی زبان بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی محض مگر لوگ ان کے مطیع و فرماں بردار تھے جب حکمرانوں کے کاندھے پر بندوق ہو تو ہمارے بڑے بڑے مشیر بھی ان کے سامنے بکری بن کر میاں لگتے ہیں۔

جیل شہر کے ایک سرے پر ہے اور دانتوں کا ہسپتال دوسرے سرے پر درمیان کا راستہ پندرہ بیس کلومیٹر کا ہے میں نے لاہور شہر کے ان علاقوں میں پارٹی انتخابی مہم چلائی ہے یہ حسن اتفاق ہے کہ لاہور شہر سے میں کبھی انتخاب نہیں ہارا میں ہسپتال جاتے ہوئے ایک ایک دکان اور ہر ایک عمارت کو غور سے دیکھتا رہا ایک ایک اینٹ سے کوئی نہ کوئی میری کہانی وابستہ ہے چونکہ پولیس وین کے شیشوں پر کالا رنگ کیا گیا ہے میں باہر کے لوگوں کو دیکھ سکتا ہوں مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا اندر کون ہے میں روال دواں زندگی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں مگر آج یہ دیکھ کر پریشان ہوا کہ تمام شہر کچڑ میں لت پت ہے اور سوائے قرطبہ چوک کے کوئی حکومتی ادارہ صفائی کے لئے متحرک نظر نہ آیا۔ ایم، اے، او، کالج کے سامنے ایک خاکروب تیلیوں سے بنے ہوئے کمزور جھاڑوں سے سڑک پر چلنے والے پانی کے سیلاب کا رخ موڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ہسپتال میں ایک گھنٹہ تک زیر علاج رہا واپسی کا سفر مال روڈ کے راستے طے کیا جب شاہی مسجد کی دیواروں کے قریب سے گزرے تو ماضی کی فلم چلنے لگی مینار پاکستان پر پارٹی جلسوں سے خطاب کے مناظر میرے سامنے تھے مسجد کے اندر جھانکا تو علامہ اقبال محو خواب تھے سامنے شاہی قلعہ کا دروازہ تھا جہاں مجھ پر تشدد کیا گیا بعد میں شاہی محلہ اور شاہی قلعہ میرا انتخابی حلقہ بنا تو ہر طوائف کے دوازے پر ووٹ کی بھیگ مانگی اسی محلے میں جماعت اسلامی کے حافظ سلیمان بٹ، جمعیت علماء السلام کے حضرت مولانا عبید اللہ انور اور قاضی حسین احمد کو بھی ووٹ مانگتے دیکھا بلکہ ان کے ساتھ مل کر اس علاقے میں جلسہ عام سے خطاب کر کے ووٹ کے لئے جھولی بھی پھیلائی اسی جگہ (ترنم چوک) پر ذوالفقار علی بھٹو میاں نواز

شریف اور محترمہ بینظیر بھٹو کے خطاب بھی سنے۔

موڑ مڑتے ہوئے موہنی روڈ، نکسالی اور داتا گنج بخش سے گزرتا ہوا بھائی گیٹ کے قریب پہنچا تو اندرون بھائی گیٹ سے سید مٹھا بازار کی طرف نظر اٹھ گئی جہاں سے گزرتے ہوئے مجھ پر ہر گھر سے پھولوں کی بارش ہوئی تھی پھر اسی جگہ گولیوں کی بارش بھی ہوئی جس میں مشکل سے جان بچی۔ لوہاری گیٹ کی مسلم مسجد کے مینار نظر آئے تو ان پھلیروں کی یاد آئی جو اندرون شہر داخلے پر ہر مرتبہ پھولوں کے گجرے پیش کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اندرون لوہاری کی ایک ایک دکاندار کے چہرے کی مسکراہٹیں یاد آئیں، سوتر منڈی سے پہلے خواجہ رفیق کا گھر ہے ان کی شہادت کے موقع پر ان کی بیگم صاحبہ کی پر عزم تصویر نظر آئی پھر لاہور شہر کا ہر کوچہ و بازار مصور کی تصویروں کی طرح بانہیں کھولے کھڑا تھا جدھر جاتا ہر شخص شناسا نظر آتا اور ہر عمارت اپنی لگتی مسجد وزیر خاں کی رنگا رنگ مچھلیاں آنکھوں کو طراوت بخشتیں، حضرت سید صاحب صوف کا مزار، اندرون شیرانوالا گیٹ میں تنگ گلیوں میں گاڑی کا پھنس جانا، مولانا عبید اللہ انور کے خدام الدین کا دفتر، گٹھی بازار، سوہا بازار، بازار حکیمان، چوک نواب صاحب، اعظم مارکیٹ، کوچہ چابک سواراں، موچی دروازہ اور ان کے سامنے برصغیر پاک و ہند کی عظیم جلسہ گاہ جس میں عظیم مقررین نے خطابت کے جوہر دکھائے سامنے تھا یہ بات مشہور تھی کہ کوئی شخص برصغیر کا لیڈر کہلا نہیں سکتا اگر اس نے موچی دروازہ کی جلسہ گاہ میں تقریر نہیں کی یہاں سے مسجد شب بھر کو تصور کی آنکھوں سے دیکھا اندرون شہر کی سنہری مسجد، پرانی کوتوالی، کشمیری بازار، چوک رنگ محل، پانی والا تالاب سامنے تھے۔ نظر دوسری طرف ڈالی تو گوالمنڈی، بانساں والا بازار، ریلوے روڈ، لکشمی چوک، نکلسن روڈ پر نوابزادہ نصر اللہ کے ڈیرے سے ہو کر ریلوے اسٹیشن سے آگے دوسریہ سے نکل کر مصری شاہ جا پہنچا۔ وہیں سے انجینئرنگ یونیورسٹی اور تاریخی شالا مار باغ سے ہوتا ہوا محمود بوٹی بند تک جا پہنچا۔ شمالی پنجاب کے اپنے حلقہ انتخاب کے ایک ایک فرد سے ملاقات کی ان سے کہا جو امانت مجھے آپ نے سونپی تھی میں جان کی

بازی لگا کر اس کی حفاظت کر رہا ہوں میں نے آپ سے کیا عہد نہیں توڑا۔ مجھے اردو بازار کی دکانیں نظر آئیں جہاں میں کتابوں کی تلاش میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ اچھے پہلوان کی دودھ کی دکان سامنے تھی، بھائی کے ارد گرد کا علاقہ لاہور کے روایتی کھانوں کا مرکز ہے یہاں کی باقر خانی کا کہیں جواب نہیں یہاں کے گردے کپوروں کی ڈش کہیں اور نہیں مل سکتی۔

بھائی گیٹ چوک سے لوڑ مال کی طرف گاڑی مڑی تو دائیں ہاتھ کر بلا گامے شاہ کا مزار تھا جہاں میں یوم عاشور کو آیا کرتا تھا دائیں ہاتھ پر سنٹرل ماڈل سکول کی عمارت تھی جس میں داخلے کے خواب میں گاؤں میں بیٹھ کر دیکھا کرتا اگلے مرحلہ عجیب تھا دائیں ہاتھ ضلع کچہری تھی جس کی عمارت میں بارہا گرفتاری کے بعد جسمانی ریمانڈ کے لئے پیش کیا گیا۔ رہائی کے بعد مقدمات کی سماعت کے لئے اتنی مرتبہ حاضری دی کہ اس کا شمار کرنا لا حاصل ہے بائیں ہاتھ پر برصغیر کا شہرت یافتہ گورنمنٹ کالج ہے جو طالب علمی کے زمانے میں میری سرگرمیوں کا مرکز رہا مجھے وہاں کی تقریبات میں کی گئی تقریروں کا ہر لفظ یاد آنے لگا، آگے ناصر باغ تھا جس کے درختوں تلے میں امتحان کی تیاری کے لئے کتابوں میں گم ہو جایا کرتا تھا پھر بطور سیاستدان یہاں پر کی گئی تقاریر ذہن میں آنے لگی لوڑ مال سے مال روڈ کی طرف مڑے تو یادوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

دائیں ہاتھ پر ٹاؤن ہال تھا مجھے یاد آیا 1972ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت طالب علموں کو خوش کرنے کے لئے ان کے کرائے کم کرنا چاہتی تھی ٹاؤن ہال میں وزیر ٹرانسپورٹ افضل وٹو کی صدارت میں طلبہ اور ٹرانسپورٹروں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ دیا گیا۔ حکومت کی تجویز تھی کہ بیس کلومیٹر کے فاصلے سے شہر آنے والے اسٹوڈنٹس کو 10 پیسے ادا کرنے پر سفر کا حق حاصل ہو میں نے تقریر میں اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی ٹرانسپورٹ اپنی پچاس سیٹوں والی بس کو صرف پانچ روپے وصول کر کے شہر تک نہیں لائے گا اس طرح کئی طلبہ مارے جائیں گے یا پتھر اور اینٹ ہاتھ میں لے کر بسوں کو روکیں گے۔

اس طرح کے ٹکراؤ سے ایک ایسی نسل تیار ہوگی جو چھینا جھٹی سے اپنے مسئلے کا حل تلاش کرے گی، وزیر موصوف کہنے لگے آپ تو طلبہ کے نمائندہ ہیں آپ کو اس رعایت کی حمایت کرنی چاہیے۔ میں نے کہا میں طلبہ کے قتل عام کے منصوبے کا حامی نہیں ہو سکتا آج بھی دوسرے تیسرے دن اخبارات میں کسی طالب علم کی ٹرانسپورٹر کے ہاتھ سے ہلاکت کی خبر پڑھتا ہوں تو اس میٹنگ کا سارا منظر سامنے آ جاتا ہے اسی ٹاؤن ہال میں 1977ء کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے درخواست دینے آیا تو ریٹرننگ آفسر نے میرے مخالف امیدوار کو جو ایک وزیر تھا اندر بیٹھا کر کنڈی چڑھائی ہوئی تھی کاغذات نامزدگی پیش کرنے کا وقت ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے دھاندلی کر کے بلا مقابلہ منتخب کرانا چاہتا تھا میں دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا میرے ساتھ ایک بہت بڑا جلوس تھا انہوں نے عدالت کو گھیر لیا تو ریٹرننگ آفسر کو میرے کاغذات قبول کرنا پڑے جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی واقعات کی فلم تیزی سے چلنے لگی۔ نیشنل کالج آف آرٹس، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کی انتخابی معرکہ آرائیاں، ٹولٹن مارکیٹ کا چائے خانہ کپیری اور کونے پر اخبارات کی دکان۔ پھر بائیس ہاتھ نئی انارکلی تھی جس کی ایک ایک دکان پر میں نے دفاعی فنڈ جمع کرنے کے لئے 1971ء میں جھولی پھیلائی۔ دائیں طرف دیکھا تو پرانی انارکلی سے رانا چیمبرز تک اور دائیں سے جین مندر کے ساتھ ہیلی کالج کی دیواروں تک ہزاروں واقعات کا تسلسل تھا۔ رانا چیمبرز میں مجیب الرحمن شامی اور رانا نذر الرحمان کے ساتھ مل کر پاکستان کی سیاسی زندگی کے نقوش بنانے اور مٹانے کی کوششوں کی تصویر واضح ہوتی چلی گئی۔ پرانی انارکلی پر تھڑوں پر بیٹھے بالا برف والا، شریف مرغ جھولے والا، رانا مٹھائی والا اور سید رشید شاہ یاد آئے جو سیاسی ورکر تھے اور ایئر مارشل اصغر خان کی جماعت میں شامل تھے۔

چوک سے بائیں طرف دیکھا تو مکی کے بھٹے بیچنے والا چاچا چراغ دین یاد آیا جو کہتا تھا کہ اس نے تیس سال میں نئی انارکلی سے پرانی انارکلی کی سڑک عبور نہیں کی نہ ہی اس کو روزی

روٹی سے اتنی فراغت ملی۔

16 دسمبر کو اسی چوک پر کھڑے ہو کر یحییٰ خان کو پھانسی دینے کا مطالبہ اور عوام کی پرزور تائید یاد آئی تھوڑا سا آگے چلنے سے نیلہ گنبد آ گیا پاک ٹی ہاؤس اور چائینز لنچ ہوم میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنس آغاز شورش کاشمیری اور مجید نظامی (چیف ایڈیٹر نوائے وقت) کی محفلیں پیچھے چھوڑ آیا۔ اسی چائینز لنچ ہوم سے اسلامی کانفرنس برائے دن بنگلہ دیش نامنظور کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا تو لوگوں کا جم غفیر ساتھ ہو گیا تھا نیلہ گنبد سے تحریک نظام مصطفیٰ کے لئے نکلنے والے سارے جلوس یاد آگئے چند قدم آگے دائیں ہاتھ پر ہائی کورٹ کی عمارت تھی یہ عمارت بھی میری زندگی میں اہمیت کی حامل رہی ہے اس عدالت کے کمروں میں انصاف کی بھیک مانگنے کے لئے سینکڑوں مرتبہ آیا کئی مرتبہ یہاں دکھانے بار سے مجھے خطاب کرنے کا اعزاز بخشا عدالت کے برابر آغا شورش کاشمیری کے گھر کی طرف جھانکنے کی کوشش کی اگلہ چوک مسجد شہدا کا تھا بائیں ہاٹھ پر بیڈن روڈ اور ہال روڈ تھے اس چوک کو ریگل چوک کہتے ہیں بیڈن روڈ سے ایک مرتبہ ہمارے جلوس پر فائرنگ کی گئی ایک ایسے ہی جلوس سے واپس جا رہے تھے کہ اطلاع ملی ہمارے جلوس کے راہنماؤں میں سے خواجہ رفیق کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے

اسی علاقے سے 1977ء انتخاب لڑ رہا تھا۔ یہاں کے مکینوں نے میری حمایت ووٹ اور نوٹ دونوں سے کی میں یہاں اکثر مولانا بخش کے پان کھانے آتا تھا مسجد شہدا بننے سے پہلے بھی میری اس علاقہ سے شناسائی تھی اس سے اگلا چوک لاہور شہر کا اہم ترین علاقہ ہے جسے چیئرنگ کر اس کہتے ہیں اسی چوک میں پنجاب اسمبلی کی عمارات ہے جہاں اکثر ہمارے جلوسوں کا اختتام ہوتا تھا اسی اسمبلی کی سیڑھیوں پر تارا سنگھ نے کرپان لہراتے ہوئے کہا تھا کہ جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا اس کی زبان کو اس کرپان سے کاٹ دیں گے یہ بھی مشہور ہے کہ لاہور سے ایک بہت بڑے جلوس میں سر سکندر حیات کے خلاف اپنے مخصوص انداز سے نعرے لگائے جا رہے تھے سر سکندر کے قائد اعظم سے جاری مذاکرات کامیاب ہو گئے۔

جلوس میں جب یہ خبر آئی تو جو لوگ دشنام طرازی کر رہے تھے کہنے لگے نویں خبر آئی اے تے سکندر ساڈا پائی اے۔ یعنی نئی خبر آگئی ہے آج سے سکندر ہمارا بھائی ہے۔

چیسرنگ کر اس پر پہنچنے تک ہر جلوس نکتہ عروج پر پہنچ جاتا ہے بہت کم جلوس گورنر ہاؤس تک جاتے ہیں۔ جیپ میں میرے ساتھ بیٹھا ہوا ڈی ایس پی اونگہ رہا تھا مگر میرے ذہن میں یادوں کی ریل تیز ہوتی جا رہی تھی گورنر ہاؤس کے سامنے پہنچ کر مجھے یاد آنے لگا کہ کس طرح ہم گورنر ہاؤس کے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے میں نے گورنر ہاؤس کی دیواروں پر لگی ہوئی بجلی کی تاریں دیکھیں تو ندامت ہونے لگی میرے جلوسوں سے تنگ آ کر ملک مصطفیٰ کھرنے یہ تاریں قومی خزانے سے خطیر رقم خرچ کر کے لگوائیں۔ حالانکہ اس سے پہلے انگریز گورنروں کو بھی کبھی اپنی حفاظت کے لئے ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ میں نے آج صبح کے اخبارات میں پڑھا کہ اب گورنر ہاؤس کی دیوار مزید دس فٹ اونچی کی جا رہی ہے یہ عجیب بات نہیں کہ ہمارے محبوب حکمران اپنے عشاق سے چھپنے لگے ہیں مگر اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے یہ تو شان محبوبی ہے اگر پردے حائل نہ ہوں تو دیدار عام کا منظر کہیں دھول دھپے میں نہ بدل جائے۔

چیسرنگ کر اس سے گورنر ہاؤس کے درمیان آداری ہوٹل (AVARI HOTEL) وزیر اعلیٰ کا دفتر، باغ جناح اور پرل کانٹیننٹل (PERL CONTINENTAL) بھی موجود ہے۔

وہاں سے وابستہ یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ چڑیا گھر کو دیکھنے کے لئے بچپن سے ملتان کا دور دراز سفر کر کے آتا تھا۔ باغ جناح کی روش روش میرے پاؤں کی چاپ سے آشنا ہے اگلے چوراہے پر دائیں ہاتھ وزیر اعلیٰ کے دفتر کا راستہ ہے اسی علاقہ میں پاکستان کے مستقل حکمرانوں کے ٹھکانے ہیں اس علاقے کو G.O.R کہتے ہیں لاہور کا حسین ترین ٹکڑا ہے مگر عام آدمی اس کو چچے کے سربستہ رازوں سے نا آشنا ہے بائیں طرف ایک سڑک مسلم لیگ ہاؤس تک جاتی ہے ”زاغوں کے تصرف میں ہے شاہین کانشین“ اسی

چوک سے بائیں جانب ایچی سن کالج شروع ہوتا ہے جس کا پرانا نام چیفس کالج تھا یعنی سرداروں کا کالج اس ادارے نے نہ ہی کوئی بہت بڑا سائنس دان پیدا کیا ہے اور نہ ہی عالمی سطح کا انجینئر، نہ ہی کوئی بہت بڑا ادیب اور نہ ہی کوئی بہت بڑا مفکر اس کے باوجود وسائل اور طاقت کے لحاظ سے ہر بڑا آدمی اپنے بچوں کو اسی کالج میں تعلیم دلانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اب ہم لاہور کی مشہور نہر کے پل پر پہنچ گئے ہیں یہاں سے جیب فرائے بھرتی ہوئی فیروز پور روڈ کی طرف روانہ ہو گئی ہے ننگ دھڑنگ بچے نیم برہنہ جوان اور بوڑھے گرمی سے ستائے لوگ نہر میں غوطے لگا رہے ہیں پانی پر پھسل رہے ہیں میں نہر کے دونوں اطراف بنی ہوئی عمارتوں کو دیکھ رہا ہوں کوئی بھی اجنبی یہاں آ کر دیکھے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ پاکستان دنیا کا امیر ترین ملک ہے دونوں طرف سڑک پر فرائے بھرتی ہوئی بڑی بڑی کاروں سے اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی جن علاقوں کا میں ذکر کر چکا ہوں یہ میرے انتخابی حلقوں کا حصہ رہے ہیں اگر وہ اجنبی مال روڈ کی دکانوں کے ذرا پیچھے چلا جائے تو وہ ایک..... کوٹھڑی میں پانچ پانچ مکینوں کے رہنے کے طریقے دیکھ کر دنگ رہ جائے گا ایک کمرے کو کپڑا اتان کر کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے گلی کے درمیان گندے اور بدبودار پانی کی بہتی نہر ہوتی ہے جس کی سڑاند برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے یہاں پر رہنے والے کم غذا اور ناقابل برداشت ماحول کی وجہ سے بیمار ہو کر جلد مرتے ہیں۔

میں اب فیروز پور روڈ پر پہنچ گیا یہاں سے جیب موٹر کاٹ کر بائیں طرف چلنے لگی ہے مگر میرا ذہن ابھی تک نیوکیمپس کو بھولنے کے لئے تیار نہیں میں اپنی مادر علمی کے واقعات میں کھو گیا ہوں جیل کے راستے میں کلمہ چوک سے ہوتے ہوئے ناڈل ٹاؤن آجاتا ہے میری نظر میاں نواز شریف کے گھر کی طرف اٹھ جاتی ہے جس گھر کی طرف سارا پاکستان دیکھتا تھا آج اس کے میکس وہاں پر قدم رکھنے کا حق بھی نہیں رکھتے دو بچے کے قریب واپس جیل پہنچ گیا ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا کہ بتایا گیا باہر ملاقاتی آئے ہوئے ہیں واپس جا کر ان سے ملاقات کی جب ان کی تسلی تشفی ہو گئی تو واپس آ گیا سات بجے تک سوتار ہاٹھ کر ایک

گھنٹہ واک کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کہ تالہ بندی کا اشارہ ہوا رات کو جلد سو گیا میں نے خواب میں دیکھا کہ بڑھیا کی ساری بکریاں شیر بن گئی ہیں لاشی سے بھی نہیں ڈرتیں بڑھیا بے بسی کی تصویر بنی ہوئی ہے خوف سے اس کی ٹانگیں کان رہی ہیں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ چراو ہے ابھی تک ایک دوسرے سے اسی طرح لڑ رہے مگر بھینسوں نے صلح کر لی ہے انہوں نے کمزور جانوروں کو چراگاہ سے بھگا دیا ہے وہ آرام اور سکون سے گھاس پر منہ مار رہے ہیں میری آنکھ کھل گئی سوچ رہا ہوں صبح ہوتے ہی کسی تعبیر بتانے والے سے اس کی تعبیر پوچھوں گا۔

والسلام

الوداع..... اکبر بگٹی

بسم الله الرحمن الرحيم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

27 اگست 2006ء (جمعرات)

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج اخبارات پر نظر پڑی تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ شہ سرخیاں اکبر بگٹی کی ہلاکت کا اعلان کر رہی تھیں۔ میں کل تم سے مل کر کتنا خوش تھا، مجھے خوشیاں کیوں راس نہیں آتیں۔ نواب اکبر بگٹی کی موت مشرقی پاکستان کے سانحہ کے بعد بہت بڑا واقعہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا گھاؤ گہرا ہوتا جائے گا۔ یہ زخم پاکستان کے لئے جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی ہلاکت پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ (Establishment) کی ذہنت کی عکاس ہے۔ جو کسی قیمت پر اپنے اوپر ہونے والی نکتہ چینی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اکبر بگٹی اور جاوید ہاشمی کو عبرت کی مثال بنا دوں گا۔ کاش! آج اکبر بگٹی کی جگہ مجھے تابوت میں بند کر کے اس پر تالے لگا کر دفن کیا جا رہا ہوتا تو پاکستان کو اتنا نقصان نہ پہنچتا۔ میں سمجھتا ہوں پاکستان کے دشمن بھی پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے، جتنا نادان دوستوں نے پہنچایا۔ اکبر بگٹی کو جس طرح مارا گیا ہے کسی تہذیب یافتہ معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا امریکہ نے بھی صدام حسین کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو ہمارے حکمرانوں نے اپنے ملک کے ایک بارسوخ سیاستدان کے ساتھ کیا۔

اس کا جسم سنگ مرمر سے تراشا ہوا کسی مجسمہ ساز کا شاہکار لگتا تھا وہ جب ٹینس کے لئے میدان میں اترتا تو ایسے لگتا کوئی یونانی دیو مالائی کردار اولمپک کی شمع روشن کر کے پہاڑوں کی چوٹی سے اتر رہا ہے۔ اسی کوٹ لکھپت جیل میں ہم نے کئی مہینے ایک ہی بارک میں

اکٹھے گزارے یہ ذوالفقار علی بھٹو کا آخری دور تھا۔ جب میں جیل میں پہنچا تو معلوم ہوا نواب اکبر بگٹی کو سزائے موت کی کوٹھڑی میں الگ بن کیا گیا ہے۔ علامہ احسان الہی ظہیر اور میں نے اس کوٹھڑی کا تالہ توڑا اور نواب صاحب کو اپنی بیرک میں لے آئے۔ یہاں پر محمود علی قصوری، خورشید محمود قصوری، ایس ایم ظفر، جسٹس عامر رضا اے خان اور دیگر قائدین تحریک بند تھے۔

اکبر بگٹی کی نیند کئی سالوں سے غائب تھی، جیل میں وہ رات دن جاگتے رہتے اور رات کو سونے والوں کی دلچسپ حرکات سے دوسرے دن آگاہ کرتے اور ہم مزے لے لے کر داستانیں سنتے۔ محفل میں نواب اکبر بگٹی سے ان کے ماضی کے بارے میں سخت سوالات کرتا تو وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں کہا کہ آپ کو بوچر آف بلوچستان (بلوچستان کا قصائی) کیوں کہتے ہیں؟ انہوں نے برا نہیں مانا اور اس کا تفصیلی جواب دیا کہ مریوں اور میننگلوں نے ان کے بھائی احمد نواز کو ان کی مرضی کے بغیر کابینہ میں شامل کیا مجھے اس وقت اس بات میں کوئی منطق نظر نہ آئی۔ مگر جب احمد نواز بگٹی ہمارے ساتھ MNA تھے۔ انہیں وزارت عظمیٰ کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے ٹھکرادی ہم نے اصرار کیا تو کہا! آپ نواب صاحب سے بات کر لیں۔ ہم نے کہا! آپ وزیر اعظم ہو گئے تو نواب اکبر بگٹی صاحب کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے، کہنے لگے! وزارت عظمیٰ کے بعد میں نے سردار کے علاقے میں رہنا ہے، آپ کیوں میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نواب اکبر بگٹی کے صاحبزادے سلیم بگٹی کے ساتھ MNA تھا، پھر نواب صاحب MNA بن کر آئے تو ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ان کا داماد ہمایوں مری میرے بہترین دوستوں میں سے ہے۔ ان کا بھانجا طارق کھیتراں طالب علمی کے دور سے میری قیادت میں کئی تحریکوں میں حصہ لے چکا ہے، اب ان کے داماد شاہد بگٹی سے بھی پارلیمنٹ میں مل کر کام کیا ہے۔

میں نے پہلی مرتبہ نواب اکبر خان بگٹی کو لاہور کے میوہسپتال کی ڈیوڑھی میں سٹریچر پر

لیٹے ہوئے دیکھا تھا یہ 1968ء کی بات ہے ایوب خان کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ اکبر بگٹی کو سانس کی نالی کے ذریعے خوراک پہنچانے کے لئے ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں جو ناک کے ذریعے اندر کو جا رہی تھیں معلوم ہوا انہوں نے جیل میں بطور احتجاج بھوک ہڑتال کی ہے اور اڑسٹھ روز سے منہ سے خوراک لینے سے انکار کیا ہوا ہے اس وقت یہ شخص مجھے بہت پر اسرار لگا تھا بعد میں وہ رہا ہو گیا میں اس کے بیانات پڑھتا رہتا تھا وہ صوبائی خود مختاری سے بڑھ کر مطالبات کرنے لگا اور پھر اس نے ڈھا کہ جا کر شیخ مجیب الرحمن کو اپنی ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا جس پر اس کے اپنے صوبے کے ساتھیوں عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری اور غوث بخش بزنجو میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ جب غوث بخش صوبے کے گورنر اور عطاء اللہ مینگل وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے اکبر بگٹی کے چھوٹے بھائی احمد نواز بگٹی کو اپنی کابینہ میں وزیر بنا لیا یہ بات قبیلے کے سردار کے ناقابل برداشت تھی انہوں نے صوبائی حکومت کی بھرپور مخالفت شروع کر دی اور بطور احتجاج لندن میں جلا وطنی اختیار کر لی۔ جب قبیلے کے عمائدین انہیں منانے گئے تو انہوں نے کہا پہلے احمد نواز کا سر لاؤ تو میں واپس پاکستان آنے کو تیار ہو جاؤں گا۔ اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کی حکومت کو برطرف کر دیا سردار پہاڑوں پر چلے گئے فوج نے ان کی بغاوت کچلنے کے لئے آپریشن شروع کیا اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو نے نواب اکبر بگٹی کو صوبے کا گورنر بنا کر گورنر راج قائم کر دیا۔ یہ اشتراک زیادہ دیر نہ چل سکا بھٹو اور بگٹی میں اختلاف شدید ہو گئے۔ اکبر بگٹی نے گورنر شپ سے استعفیٰ دے دیا اور بھٹو کے سیاسی حریف ایئر مارشل اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی میں بھی تحریک استقلال کی مرکزی مجلس عاملہ کا رکن تھا اس طرح نواب اکبر بگٹی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

نواب اکبر خاں بگٹی شروع دن سے ہمارے ملک کا متنازعہ سیاسی کردار رہا ہے۔ ان پر بارہ سال کی عمر میں قتل کا الزام لگا جس کی انہوں نے کبھی تردید نہیں کی لگ بھگ اسی عمر میں انہوں نے قائد اعظم سے ملاقات کی اور قیام پاکستان کے وقت اپنا ووٹ دے کر بانیان

پاکستان میں شمار کیے گئے۔ 1952ء میں ان کے علاقے میں گیس کی تلاش کے لئے کنویں کھودے گئے تو انہوں نے دیگر سرداروں کے برعکس رکاوٹ بننے کی بجائے بھرپور تعاون کیا۔ آج اس گیس پر پاکستان کی معیشت کا دارومدار ہے وہ اپنے قبیلے کے لئے سخت گیر ہوتے گئے۔ مگر آخری دو سالوں کے علاوہ کوئی فرد گیس کی پائپ لائن کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا نہ ہی وفاقی حکومت کو اس پائپ لائن کی حفاظت کا سوچنا پڑا یہ ذمہ داری اکبر بگٹی کے کندھوں پر تھی اور انہوں نے بھرپور ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ بلوچستان کے سرداروں کی سیاست میں پاکستان کے بارے میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، جب ڈھا کہ میں فوجوں نے ہتھیار ڈالے اکبر بگٹی نے سخت بیان جاری کیا جب کہ عطاء اللہ مینگل نے کہا اگر خدا نخواستہ پاکستان ٹوٹ گیا تو ہم بلوچستان کا نام پاکستان رکھ دیں گے چند روز بعد اکبر بگٹی وفاق کی حمایت کر رہا تھا اور عطاء اللہ مینگل غداری کے مقدمے میں جیل میں تھا۔ پھر منظر بدلا سردار بخش مری، عطاء اللہ مینگل روسی انقلاب کو خوش آمدید کہنے افغانستان میں روسی فوجوں کی جنگ میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے اور اکبر بگٹی پاکستان میں وفاق کی حمایت کر رہے تھے اکبر بگٹی کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کو اپنے قبیلے اور صوبے کی سیاست میں زور آور کہہ سکتا ہے لیکن اسے پاکستان دشمن کا نام نہیں دے سکتا وہ عطاء اللہ مینگل کے ساتھ سکندر مرزا کی پارٹی میں رہے اکبر بگٹی وزیر دفاع اور وزیر داخلہ کے طور پر کام کیا گوادر کو پاکستان میں شامل کرانے کے لئے ان کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا تھا ورنہ قطر کے حکمرانوں نے ہندوستان سے گوادر کا سودا کر کے کچھ رقوم بھی وصول کر لی تھیں اکبر بگٹی نے عرب حکمرانوں سے ذاتی اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ سودا ختم کرایا۔ اکبر بگٹی کی بلوچستان کے سرداروں سے نہ بن سکی وہ اپنے سمیٹی نی بخش زہری کی جماعت جیوے پاکستان کو پیو لے پاکستان کہتے تھے جمالی سرداروں کے بارے میں بھی ان کی رائے اچھی نہ تھی ان پر خان عبدالصمد اچکڑی کے قتل میں معاونت کا الزام بھی برسر عام دہرایا جاتا تھا۔ میری قلات کے حکمران نواب احمد یار خان صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں وہ بھی نواب اکبر بگٹی کو پسند

نہیں کرتے تھے ان کا خیال تھا ان کی ریاست کے خاتمے کے وقت بگٹیوں کا کردار درست نہیں تھا نواب احمد یار صاحب کے بیٹے شہزادہ محی الدین بھی میرے ساتھ رہے ہیں وہ بہت محتاط گفتگو کرتے ہیں میں نے ان کے ہاں بھی اکبر بگٹی کے لئے کوئی نرم گوشہ محسوس نہیں کیا۔ اپنے قبیلے کے ساتھ ان کے بڑھتے ہوئے تنازعات ان کی سب سے بڑی غلطی تھی مگر عوام کے ووٹ پر ان کی گرفت آخری عمر تک قائم رہی۔ حکومت پاکستان نے ان کی آسائشات کا ہر طرح سے خیال رکھا، عوام سے ملاقاتوں کے لئے انہیں عمارتیں بنا کر دیں اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیا۔ آخری مرحلے میں حکمران جماعت کے صدر اور سیکرٹری جنرل نے ان سے تحریری مطالبات کی دستاویز حاصل کی مگر اس کے بعد بات چیت کے دروازے بند کر دیئے۔ اکبر بگٹی کا مطالبہ یہ تھا کہ ترتالیس چوکیدار گیس کے چھپاسی کنوؤں پر بھرتی کیے جائیں اور 142 بیروں (Waiters) کو جو بیس سال سے کام کر رہے ہیں مستقل کیا جائے۔

اکبر بگٹی کے بقول ذوالفقار علی بھٹو کو لہو کے مقام پر چوہدری ظہور الہی کو قتل کرانا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ چوہدری صاحب ہمارے مہمان ہیں۔ چوہدری ظہور الہی نے بھی بارہا اس واقعہ کی تصدیق کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج چوہدری شجاعت حسین کی حکمرانی کے دور میں نواب اکبر بگٹی سے ایسا سلوک روا رکھا گیا جس کا جواز تلاش کرنا بہت مشکل ہوگا۔

اکبر بگٹی کی سیاست سے اختلاف ممکن ہے مگر ان کی سیاسی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کیا جاسکتا، خاص طور پر ایسے حالات میں جب بلوچستان کو آگ و خون میں نہلا دیا گیا ہے۔ شاہراہیں محفوظ نہیں، ریل کی پٹریاں اور فوج کی چھاؤنیاں راکٹوں کی زد میں ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے ناعاقبت اندیشانہ فیصلوں نے ملک کی چولیس ہلا کر رکھ دیں ہیں۔ میں 26 اور 27 اگست کی درمیانی رات کو جلد سو گیا تھا اگر میں بیدار بھی ہوتا تو کیا کر لیتا۔ جیل میں خبر ایک دن کی تاخیر سے ملتی ہے۔ اگر خبر رات کو مل جاتی تو اکبر بگٹی کے غم کا جگراتا میرا ساتھ دیتا۔ وہ شخص چالیس سال نہیں سوسکا، اب ایسا سویا ہے کہ صرف شور محشر ہی اسے جگا

سکے گا۔ ایک اسی سالہ بوڑھے کو گرفتار کرنا اتنا مشکل کام نہ تھا، مگر حکمران تو اسے ڈاکٹر شازیہ کی عصمت درمی کرنے والے فوجی میجر پر تنقید کا مزہ چکھانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ملک بے شک ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے، قوم کی بیٹیوں کی عصمتیں لوٹی جائیں مگر وردی اور اس کی عصمت کا تحفظ تو ہو گیا۔

میمونہ بی بی شاید یہ نومبر 1971ء ہے میں ڈھا کہ شہر کے علاقے دھان منڈی میں ایک کوٹھی کے اندر کھڑا ہوں شیر جوان ہمیں سیڑھیوں پر لگے خون کے دھبے دکھا رہے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ کس طرح انہوں نے شیخ مجیب کے باڈر گارڈز کو زخمی کر کے شیخ صاحب کو فرار ہونے سے پہلے دبوچ لیا ویران گھر کے تمام رہائشی یا تو فرار ہو چکے ہیں یا گرفتار کر لیے گئے ہیں میں اپنے بہادر سپاہیوں کی داستان جرات سن رہا ہوں ان کے چہرے فتح مندی سے تمنا رہے ہیں صرف ایک ماہ بعد ان کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔

90 ہزار فوجی ہندوستان کی قید میں جان کی امان مانگ رہے تھے مجھے اکبر بگٹی کا مورچہ فتح کرنے پر ڈھا کہ کی دھان منڈی کیوں یاد آرہی ہے بظاہر ان واقعات میں کوئی تسلسل نظر تو نہیں آتا۔

میمونہ بی بی تم نے اچھا کیا جو کوئٹہ جا کر ان کی خواتین کو پرسہ دیا تمہاری اس بات نے تو مجھے بھی دلا دیا کہ اکبر بگٹی کی بوڑھی بہنوں اور بیٹیوں کی آنکھیں ازگاروں کی طرح سرخ تھیں ان کے آنسو خشک ہو چکے تھے آنسو ہوتے بھی تو اس آگ کو کیسے بجھا سکتے۔

والسلام

تمہارا والد

ہیرو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

14 اکتوبر 2006ء

میسونہ بی بی!

السلام علیکم!

ڈاکٹر قدیر کی بیماری کا سن کر پہلے ہی بہت دکھی تھا اب پرویز مشرف صاحب نے جس طرح اپنی کتاب میں ان کی تضحیک کی ہے میرے زخموں پر نمک لگ گیا ہے معلوم نہیں اس احسان فراموشی کا عذاب کس کس کو لے ڈوبے گا۔

میری ڈاکٹر عبدالقدیر سے پہلی ملاقات ایک دوست کے توسط سے ان کے گھر پر 1977ء میں ہوئی وہ اتنے معصوم اور بھولے لگے کہ میں شک میں پڑ گیا کہ یہ شخص ایٹم بم بنا کر نہیں دے سکتا۔ ہم کسی کے خلاف فیصلے کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ جب دوسری تیسری ملاقات ہوئی تو اس پر عزم شخصیت کے اسرار مجھ پر کھلنے لگے۔ میں آہستہ آہستہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا اور وہ اندرونی مشکلات اور رکاوٹوں کے بارے میں کھل کر مجھ سے بات کر لیتے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا ذوالفقار علی بھٹو کا دور ختم ہو گیا اب ملک پر ضیاء الحق کی حکمرانی تھی شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب کو ان سے معاملات میں پریشانیاں آئیں پھر حالات صحیح ڈگر پر چلنے لگے۔

ضیاء الحق جن دنوں ایٹمی دھماکے سے گریز کر رہے تھے ڈاکٹر صاحب کو سخت تشویش لاحق تھی یہ ایسے ہی تھا کہ کسی ماں کو بچہ کی پیدائش سے روک دیا جائے اور اسے اپنا بچہ پیدا ہونے سے پہلے موت کی وادی میں جاتا نظر آئے ڈاکٹر صاحب حکومت کے ڈیلیوری سسٹم کے بارے میں تساہل کے بھی شاکی رہے۔ محمد خان جو نیجہ کے دور میں امریکہ کو صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور ایٹمی پروگرام پر سوالیہ نشان لگ گیا۔

1988ء میں جب سرد جنگ کے خاتمہ کے قریب ضیاء الحق ایک فالتو چیز تھے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا گیا اور محترمہ بینظیر بھٹو نے عنان حکومت سنبھالی ان دنوں امریکی دباؤ اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا اور ڈاکٹر قدیر کی جھنجھلاہٹ دیدنی تھی یورینیم کی افزودگی کے بارے میں اٹھنے والے سوالات سے پراسنگ ست روی کا شکار ہونے لگی تو غلام اسحاق خان نے اسے سنبھالا دیا۔

محترمہ کی حکومت ختم ہو گئی میاں نواز شریف وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ N.P.T پر دستخطوں کے لئے امریکہ کا اصرار بڑھ گیا اور ساتھ ہی پاکستان پر دہشت گردی کی تلوار لٹکا دی گئی اس وقت کے صدر غلام اسحاق کی امریکی سیکرٹری ٹالبوٹ سے تلخ کلامی ہو گئی میاں نواز شریف نے بھی امریکی دباؤ کا مقابلہ جرات مندی سے کیا اس طرح امریکی عزائم کو شکست ہو گئی اور ڈاکٹر عبدالقدیر ملاقاتوں میں خوش خوش نظر آئے۔

محترمہ بے نظیر کا دوسرا دور شرع ہوا تو (ڈلیوری سسٹم) کے حصول میں مزید پیش رفت ہوئی جب اسٹبلشمنٹ کو محترمہ کی حکومت کھلنے لگی تو انہیں اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا اور ایک غیر سیاسی نظام متعارف کرانے کی کوشش کی گئی جس کی ناکامی پر عام انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں میاں نواز شریف دوبارہ برسر اقتدار آ گئے۔ ہندوستان نے اسی دوران ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان کے لئے راستہ کھول دیا۔ میاں نواز شریف نے بین الاقوامی دباؤ کا دلیری اور جرات سے سامنا کیا انہیں اپنے ساتھیوں کی مخالفت کا بھی سامنا تھا لیکن انہوں نے تمام دشواریوں کو عبور کر لیا اور پاکستان دنیا کے نقشے پر ساتویں ایٹمی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آ گیا۔ ڈاکٹر قدیر کی محنت پھل ہو گئی۔

اس تمام عرصے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں دنیا بھر کے میڈیا کا ہدف بنے رہے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے مگر وہ مشن کی کامیابی کی طرف رواں دواں رہے انہیں بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جان سے مار دینے کی دھمکیاں ملتی رہیں اپنوں کی بے اعتنائی نے حسد کی صورت اختیار کر لی مگر انہوں نے کسی چیز کی پرواہ نہ کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ان کا نام صرف پاکستان میں ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے محسن کے طور

پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

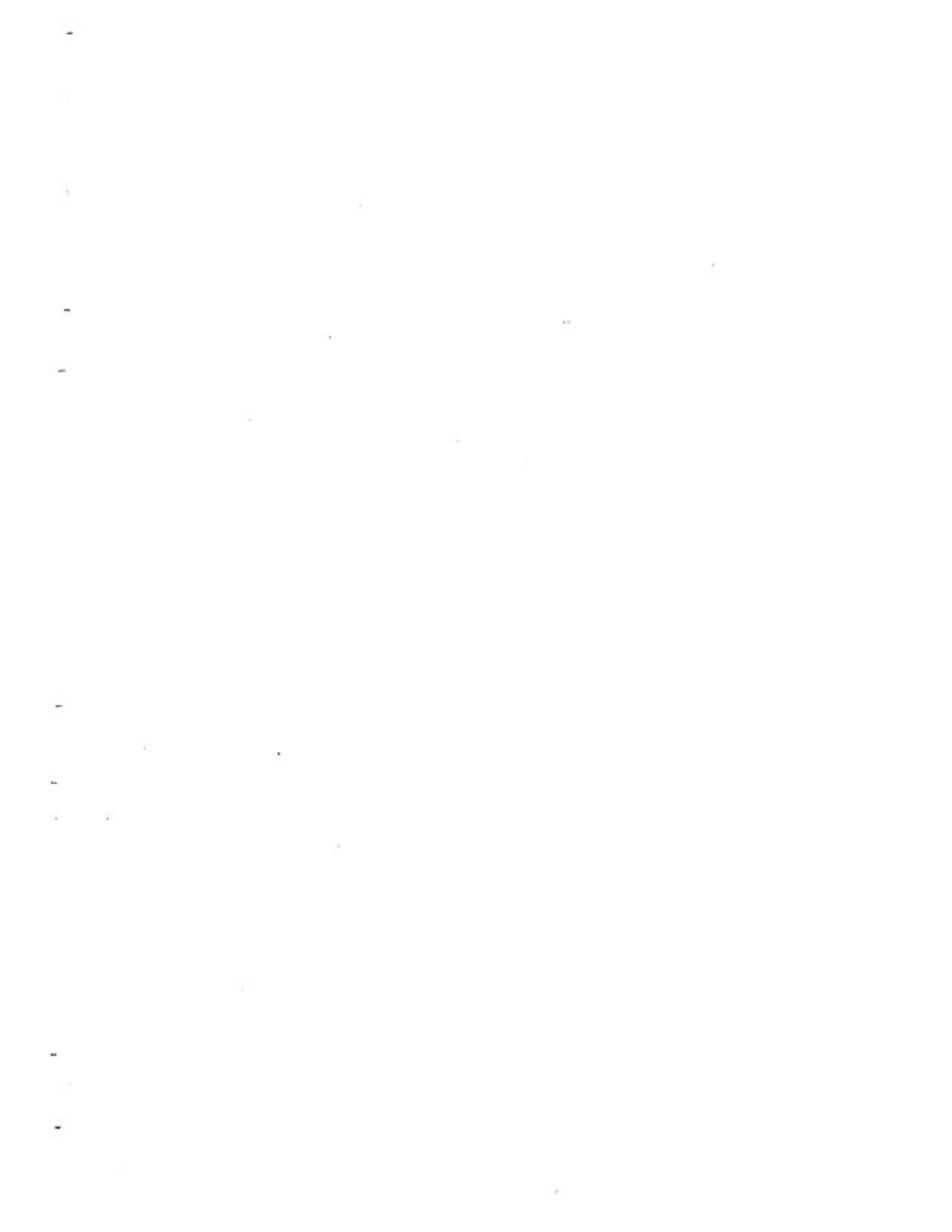
میری ان سے آخری ملاقات 2001ء کو اسلام آباد کے فائیو سٹار ہوٹل میریٹ میں ہوئی یہ سعودی عرب کے قومی دن کی تقریب تھی۔ سعودی عرب کے سفیر نے افطار ڈنر کا اہتمام کیا ہوا تھا جس میں ملک بھر کے سیاسی، سفارتی اور فوجی زعماء شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان، مشاہد حسین سید اور اس وقت کے بحریہ کے سربراہ عزیز خاں اور میں اتفاقاً اکٹھے ہو گئے ڈاکٹر صاحب نے ہمارے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیا میں نے پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر مایوسی اور خوف کے سائے دیکھے وہ کہنے لگے مجھے دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ اگر تم ٹھیک نہ ہوئے تو تمہاری زندگی کی خیر نہیں انہوں نے ایک حساس ادارے کے افسر کا باقاعدہ نام لے کر کہا کہ اس نے کہا ہے ڈاکٹر قدیر کو میرے حوالے کر دیں میں ایک ہفتے میں اسے سیدھا کر دوں گا۔ ہم ایڈمرل عزیز خان کی طرف دیکھنے لگے انہوں نے اپنے لب سی لیے یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی تک امریکہ نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کسی قسم کے خدشات کا اظہار نہیں کیا تھا وہ اپنوں کے ستم سہہ رہے تھے امریکہ کا مطالبہ بعد میں آیا یہ ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات تھی میں جیل میں آ گیا۔ میری گرفتاری کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب کو بھی حراست میں لے لیا گیا ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے ان کی بیٹیاں اور اہل خانہ کو حوادث کے حوالے کر دیا گیا کوئی اتنا احسان فراموش بھی ہو سکتا ہے یہ بات ناقابل یقین ہے۔

اب تو شمالی کوریا نے ایٹمی دھماکہ کر دیا ہے ان کی بنیاد پلوٹونیم کے ذریعے افزودگی پر ہے جو پاکستان کے پروگرام سے بالکل مختلف پروگرام ہے۔

کل امریکہ نے ایک بیان جاری کیا ہے کہ ڈاکٹر قدیر کی ان کو مزید ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی وہ انہیں کسی تفتیش کے لئے مطلوب ہیں، امریکہ تو ان کی صفائی میں بیان دینے پر مجبور ہو گیا اپنوں نے ان پر مزید پابندیاں لگا دی ہیں ان کی بیٹیاں ان سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ محسن کش قیادتیں کب تک مکافات عمل سے بچی رہیں گی۔

والسلام

قند مکرر بشریٰ کے نام



ناقابل معافی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

20 جنوری 2004ء ایک بجے رات

میمونہ بی بی السلام علیکم! اُمید ہے مزاج بخیر ہونگے!

آج میں نے خط کے ذریعے، زندگی میں پہلی مرتبہ، آپ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمام عمر میری ایک شخص سے جنگ رہی ہے، اس کا نام جاوید ہاشمی ہے۔ اسکے علاوہ میں نے پوری انسانیت سے محبت کی ہے۔ انسان تو انسان میں ایک چیونٹی کے مرنے پر افسردہ ہو جاتا ہوں اور کٹے ہوئے درخت دیکھ کر تو میری آنکھوں سے جھڑی لگ جاتی ہے۔ مجھے تمام مذاہب خوبصورت لگتے ہیں۔ اسلام، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، ہندومت، میں سمجھتا ہوں کہ سبھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور انسان کے ذہنی ارتقا میں مجموعی طور پر ان مذاہب نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان مذاہب کے پیروکاروں کے ایک طبقے نے انسانی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹیں بھی کھڑی کی ہیں اور یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا گیا، شاید روئے زمین پر کسی اور تنازعہ پر نہ بہایا گیا ہو۔ مگر اسکے باوجود مذاہب نے معاشروں کو حیوانیت سے نکال کر اعلیٰ و ارفع مقاصد کیلئے Refine اور Define کیا اور اسے حدود و قیود کے اندر رہ کر آزادی، جرأت اور بے باکی کے اوصاف سے مزین کر کے منظم کیا۔

دُنیا کی تمام تہذیبیں میری وراثت ہیں۔ میں نے، بالواسطہ اور بلاواسطہ ان تہذیبوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ انسان کی معلوم تاریخ تو صرف چار ہزار سال تک محدود ہے۔ اس سے پہلے نامعلوم معاشروں کے آثار بھی میری رہنمائی کرتے ہیں۔ میں ان تہذیبوں کی اہمیت اور افادیت کا قائل ہوں، کسی ایک تہذیب کی بالادستی کا نہیں۔ رنگ و نسل اور علاقے پر تفاخر بڑی جہالت کی بات ہے۔ ہر تہذیب نے دوسری تہذیب اور ہر رنگ و نسل نے

دوسرے رنگ و نسل، حتیٰ کہ انسان نے جانوروں، پرندوں اور چرندوں کے طرز معاشرت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رنگوں کے امتزاج، نباتات کی بو قلمونی، سمندروں کی وسعت اور گہرائی، پہاڑوں اور دریاؤں نے انسانی مزاج کو ڈھالنے اور تراشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے میں کرہ ارض کے ہر ذرے سے محبت کرتا ہوں اور اس کا مقروض ہوں۔

میری زندگی کے تجربات اور مطالعہ نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ اسلام معراج انسانیت، انسانی مساوات، انصاف، امن اور معاشی و معاشرتی بہبود کا سب سے بڑا ضابطہ حیات ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی کمزور ترین لمحات میں بھی میرے لئے قوت اور طاقت کا منبع ہے۔ اس جنون نے مجھے ہمیشہ منزلوں سے ہمکنار کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عرفان (VISION) اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی استقامت میرا سرمایہ حیات ہیں۔ پاکستان نہ صرف میری محبت ہے بلکہ کمزوری بن گیا ہے۔ میں اس سرزمین کو نئے دور کے انسانوں کی آرزوں اور امنگوں کی تکمیل کا مرکز سمجھتا ہوں۔ غریب اور مظلوم طبقات کی سر بلندی کیلئے جدوجہد ہی میرے ایمان کو مکمل کرتی ہے۔ میں جہد مسلسل کو زندگی سمجھتا ہوں۔ جب میں ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ میں کم کوشی، کم نظری اور کوتاہی پاتا ہوں تو اس شخص سے جنگ میں شدت آجاتی ہے اور احتساب کے اس عمل میں معافی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ میں ہر دوسرے انسان کی غلطی فوراً معاف کر دیتا ہوں لیکن صرف ایک شخص ناقابل معافی ہے، جو تمہارا باپ ہے۔

والسلام!

تمہارا باپ!

فیوڈل ازم اور بلدیاتی نظام، ایک چہرہ دورخ بسم اللہ الرحمن الرحیم

25 اپریل 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشری بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

فیوڈل ڈھانچے میں بلدیاتی نظام کو اہم مقام حاصل ہے۔ غیر نمائندہ حکومتوں کیلئے یہ نظام نعمتِ غیر مترقبہ بن جاتا ہے۔ میں بلدیاتی نظام کا حامی ہوں لیکن تقسیم اختیارات کا (Decentralization) کا جو فارمولا موجودہ حکومت نے دیا ہے اس سے متفق نہیں ہوں۔ موجودہ نظام، اختیارات کو صوبے میں رہنے دیتا ہے نہ مرکز میں۔ یہ صرف ایک شخص کو مضبوط کرتا ہے۔ اس طریقہ کار سے بلدیاتی نظام کی افادیت ختم ہو گئی ہے اور اقتدار پر فیوڈل لارڈ اور فوجی حکمران کی گرفت مضبوط۔

میں اختیارات کو نچلی سطح پر لے جانے کا پرزور حامی ہوں۔ میں نے ستمبر 1986ء میں تقریباً 18 سال پہلے عدم مرکزیت کا جو فارمولا پیش کیا تھا وہ اسمبلی کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”تیسرا فارمولا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ضلع پر مقامی حکومت قائم ہونی چاہئے اور اس کا براہِ راست منتخب (Directly Elected) نمائندہ ہونا چاہئے۔ جس میں ڈی سی اور ایس پی کو اس کا ماتحت کیا جائے تاکہ ذمہ داری براہِ راست عوامی نمائندہ پر آسکے۔ ہر ضلع کے اندر اگر ہم اس طریقے سے انتخاب کروائیں گے تو جو نمائندگی ملے گی، اس کے حوالے سے مقامی سطح پر امن و امان کی صورتحال کو کنٹرول کیا جاسکے گا۔“

یہ اٹھارہ سال پہلے کا فارمولا ہے۔ چودہ سال پہلے 90ء کی اسمبلی میں وزیراعظم نے

مقامی حکومتوں کو اختیارات کی منتقلی کے لئے میری سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی۔ ہم نے اپنی سفارشات میں لکھا کہ ضلع حکومت میں ضلعی گورنر کا براہ راست انتخاب کیا جائے اور ضلع اسمبلی قائم کی جائے۔

موجودہ حکومتی نظام برٹش راج کا تسلسل ہے۔ عوام کو اختیار منتقل نہیں کیا گیا۔ ہمارے فوجی حکمران ہمیں 2 ہزار سال پہلے والی یونان اور روم کی جمہوریت دینا چاہتے ہیں، اگر ضلع گورنر کو اختیار مل جائیں تو فیوڈل مضبوط ہونے کی بجائے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی زرعی ترقی پر توجہ دے گا اور متوسط طبقے کی قیادت جنم لے گی۔ فیوڈل ازم کے خاتمے سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ جیسے امریکہ اور دوسرے ملکوں کے بڑے فارم موجود ہیں مگر اب انہیں لوگوں کو غلام بنانے کیلئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

بد قسمتی سے شہری آبادی اور دانشوروں کا طبقہ فیوڈل اور ان کی طرز زندگی سے نفرت کی وجہ سے پورے زرعی نظام کو مسترد کر دیتا ہے۔ ہمارے دانشوروں، کالم نگاروں، شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں کی بھاری تعداد کا تعلق دیہی معاشرے سے ہے۔ شہروں کی چکا چوندا نہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ اپنی محرومیوں اور ناراضگیوں کی وجہ سے اپنے دیہی ماضی کو بھول جانا چاہتے ہیں اور پورے دیہی معاشرے سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور یہ لاتعلقی دیہات کے رہنے والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے۔ ان کے علاقے کا کوئی فیوڈل ان کیساتھ عزت سے پیش آئے تو وہ انہیں فرشتہ لگتا ہے۔ متوسط طبقے کی قیادت دانشوروں کی تنقید کی زد میں ہوتی ہے، اس کی کسی غلطی کی معافی نہیں ہوتی۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

چھوٹا زمیندار اور کسان زراعت میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کی محنت پر پورا ملک چل رہا ہے اور وہ خود قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیج سکتا۔ اس کا تمام خاندان عورتوں اور بچوں سمیت صبح و شام کھیتوں میں کام کرتا ہے مگر وہ پھر بھی خط

غربت سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ انگریزوں اور اس کے بعد آنے والے آمروں نے بلدیاتی نظام اور جاگیرداری کے ذریعے غلامی کی زنجیریں مضبوط کیں، حالانکہ یہی نظام کاؤنٹی سسٹم کے نام پر برطانیہ میں جمہوریت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نئی قیادت پیدا کرتا ہے، جمہوری عمل کی بالیدگی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے ذریعے تمام اختیارات نچلی سطح پر پہنچ جاتے ہیں اور "تقسیم اختیارات (Decentrali Zation)" کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

امریکہ میں بھی اس نظام کی برکت سے خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور امن و امان قائم ہوا۔ اس سے ذمہ دار شہری (Responsible Citizen) کا تصور اُجاگر ہوا۔ تمام پاکستانی آمروں نے بلدیاتی انتخابات کرائے اور جمہوری حکومت نے حتی الوسع اس سے احتراز کیا۔ انگریزوں اور آمروں نے اس نظام آمریت کو مضبوط کرنے کیلئے بلدیاتی اداروں کو سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور تابعدار قیادت پیدا کی۔ دیسی حکمرانوں نے انگریزوں کے اس نسخہ کو کامیابی سے استعمال کیا۔ ضلعی سطح کی قیادت کو ڈپٹی کمشنر کے ذریعے کنٹرول کرنا آسان تھا اور یہ ضلعی قیادتیں، اپنے مخالفین کو کنٹرول کرنے کیلئے ڈپٹی کمشنر، علاقائی کور کمانڈر اور کمشنر کی سرپرستی کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتی تھیں۔ کمشنران اداروں کو توڑنے کا قانونی حق رکھتے تھے۔ اس جکڑ بندی میں کوئی قومی قیادت جنم کیسے لے سکتی تھی؟

120 سال سے ہر ضلع میں ایک یا دو خاندان سیاسی منظر پر چھائے ہوئے ہیں، جن کے پاس انگریز کی دی ہوئی جاگیر اور خطاب ہیں اور جنگ عظیم اول اور دوم میں جبری بھرتی کے ذریعے فوجی فراہم کرنے کا سرٹیفکیٹ اور اس بھرتی کی وجہ سے ان کے پاس کرنل یا میجر کا اعزازی عہدہ ہو تو یہ نجیب الطرفین ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

پاکستان کے قیام نے بھی اس غلامی کی جکڑ بندی کو نہ صرف برقرار رکھا ہے، بلکہ اسے اور مضبوط بنا دیا ہے۔ انگریز چونکہ یہاں کارہنہ والا نہیں تھا، ایک حد تک اپنے آپ کو برتر

(Superior) اور حاکم رہنے کا بھرم قائم رکھتا تھا۔ آزادی کے بعد دیسی افسر شاہی، دیسی فوج اور دیسی فیوڈلز کے اتحاد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ عام آدمی کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے روح پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ انہوں نے دیہی اور شہری ترقی کا تڑکا لگا کر انگریزوں کی دی ہوئی ترقی کی بھونڈی نقل اتارنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ بلدیاتی انتخابات کا اصل مقصد ضلعی سطح کی قیادت کے ذریعے قومی قیادت کے ابھرنے کا راستہ روکنا تھا۔

فوجی حکمران، سیاسی پارٹیوں سے خوفزدہ ہو کر ان پر پابندی لگاتے ہیں اور سیاسی عمل کو روک دیتے ہیں۔ لیکن بلدیاتی انتخاب اور بلدیاتی قیادت کو حقیقی جمہوریت کا نام دے کر قومی سوچ پیدا ہونے کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کے پاس ذہنی غلام پیدا کرنے کا یہ مجرب نسخہ انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ اسے استعمال کر کے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ دنیا میں قومی اور بلدیاتی انتخاب ایک دوسرے کے متبادل نہیں سمجھے جاتے بلکہ ایک دوسرے کے معاون سمجھے جاتے ہیں۔ بلدیاتی انتخاب کو نئی قیادت پیدا کرنے کی نرسری کہا جاتا ہے۔

اسی طرح نا تجربہ کار جمہوری قیادتیں بلدیاتی انتخابات سے خوفزدہ ہو کر انہیں اختیارات نہیں سونپنا چاہتیں اور تجربہ کار ڈکٹیٹران اداروں کو اپنی آمریت کی مضبوطی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں ہر غیر آئینی اقدام کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ریفرنڈم کرانا ہو، اپنی حکومت کا جواز فراہم کرنا ہو، ان اداروں کی قیادت اور مالی وسائل بے دریغ استعمال کئے جاتے ہیں اور انہی وفاداروں کو اسمبلیوں کی سیٹیں اور وزارتیں دے دی جاتی ہیں اور ان کی کامیابی کیلئے تمام حکومتی مشینری سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان تینوں نظاموں یعنی فوجی حکمرانی، افسر شاہی اور فیوڈل ازم کا بانی انگریز ہے، یہ تینوں اس کے ممنون احسان ہیں اور ذہنی طور پر نوآبادیاتی نظام کے جانشین۔ نوآبادیاتی نظام کا کل پرزہ ہونے کی وجہ سے

انہیں صرف کنٹرول کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ معاشرتی اصلاحات اور معیشت کے جدید تقاضے ان کے ذہن کے کمپیوٹر میں فیڈ نہیں کئے جاتے، نہ ہی یہ اسے اپنی ذمہ داری کا حصہ سمجھتے ہیں۔ تم نے اپنے تھیسز (Thesis) کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ مجھے، تفصیلاً، تمام امور سے آگاہ کرو۔

والسلام!

تمہارا والد!

افسر شاہی نوکر شاہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

2 مئی 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشری بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

لارڈ میکالے نے ہندوستان پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کیلئے تعلیمی نظام کا نصاب تیار کیا تھا۔ جس کے مقاصد میں لارڈ میکالے نے کہا کہ "برٹش راج کی مضبوطی کیلئے مقامی لوگوں کو ایک حد تک شامل کرنا ہماری مجبوری ہے، اس لئے انہیں ایک محدود سوچ کی تعلیم دے کر اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے۔" اس مقصد کیلئے ایک غلام ذہن کی بیورو کریسی تیار کی گئی، جو اپنے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کر کے خود کو بالادست سمجھتی تھی۔ انگریزوں نے تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے اس سول اور ملٹری بیورو کریسی کو خوب استعمال کیا۔ یہ صرف اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے جو ابده سمجھتی تھی۔ آزادی کے بعد بیورو کریسی اپنے آپ کو کسی کالے وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا ضلعی قیادت کے سامنے جو ابده نہیں سمجھتی، بلکہ اپنے آپ کو ان سے برتر (Superior) سمجھتی ہے۔

لارڈ میکالے نے 2 فروری 1835ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں جو تقریر کی، وہ مختصر، مگر جامع تھی۔ انہوں نے کہا! "معزز اراکین پارلیمنٹ میں نے ہندوستان کے طول و عرض میں بار بار سفر کیا ہے۔ دنوں اور راتوں میں گھومنا اور پھرا ہوں میری آنکھیں آج تک ایسے شخص کو دیکھنے کیلئے ترستی ہیں جو یہاں بھکاری ہو یا جو لٹیرا ہو۔ اس ملک میں ایسی دولت دیکھی ہے، ایسی بلند اخلاقی قدریں دیکھی ہیں اور اتنی بڑی ہستیتوں سے ملا ہوں کہ مجھے پختہ یقین ہو گیا ہے کہ ہم کبھی اس ملک کو فتح نہ کر سکیں گے، جب تک کہ ہم اس قوم کی ریڑھ

کی ہڈی نہ توڑ دیں، اس قوم کی ریڑھ کی ہڈی کیا ہے؟ انکار روحانی اور تہذیبی ورثہ! یہی وجہ ہے کہ میں با آواز بلند تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہم انکا نظام تعلیم اور انکی ثقافت بدل کر رکھ دیں۔ دیکھنے میں خواہ کہ یہ لوگ گندی یا سانولی رنگت رکھتے ہوں لیکن انکے سینوں کے اندر سفید فام انگریز کا دل دھڑکتا ہو، اگر ہم انہیں یہ یقین دلا سکیں کہ ہر وہ چیز جو غیر ملکی اور ہر وہ چیز جو انگریزی ہے وہ انکی چیزوں سے بہتر ہے تو ہندوستانی بہت جلد اپنی نظروں میں گر جائیں گے اور اپنے قدیم کلچر کو چھوڑ دیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طرح جلد ایسا وقت آجائیگا اور وہ ایسے بن جائیں گے، جیسے ہم چاہتے ہیں وہ "براؤن صاحب" کہلانے میں فخر محسوس کر سکیں گے اور اس طرح وہ صحیح معنوں میں ہماری مفتوحہ اور باج گزار قوم بن کر زندگی کے دن پورے کرنے لگیں گے۔

چند مستثنیات کو چھوڑ کر فوج اور افسر شاہی عموماً لوئر ڈل کلاس سے آتی ہے۔ اس لئے اقتدار پر اس کی نگاہیں حریصانہ ہوتی ہیں۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو انگریزی ثقافت میں رنگ کر حکمران نظر آئیں۔ اعلیٰ طبقے میں شمولیت کیلئے زمین اور جاگیر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ چونکہ بلدیاتی سطح کے فیوڈلز سے بالادست ہوتے ہیں۔ فیوڈلز روایتی چا پلوسی سے انہیں اپنی کلاس کا حصہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ گلی ڈنڈا کھیلتے کھیلتے ایک دم لان ٹینس اور گالف کے گراؤنڈ میں پہنچ جاتے ہیں۔ قوم کے خزانے کو لوٹنے کے قواعد بناتے ہیں، آرام دہ بنگلوں میں مغل شہزادوں کی طرح رہتے ہیں، پلاٹ اور زمینیں الاٹ کراتے ہیں، حتیٰ کہ آغا شاہی جیسا دانشور بھی فیوڈل لارڈ بن جاتا ہے۔

تمام بیوروکریٹس، چند مستثنیات کو چھوڑ کر، اپنے بچوں کو باہر کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلواتے ہیں۔ ان پرائٹھنے والے اخراجات کہاں سے آتے ہیں۔ اس کے لئے وہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ ان میں سے اکثر بچے دیہی رہ جاتے ہیں۔ نوآبادیات ان کے ذہن سے نہیں نکل سکی۔ لندن ابھی تک ان سب کا محور و مرکز ہے۔ سال میں گرمیوں کی چھٹیاں سرکاری خرچ پر مغرب میں منانے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتے

ہیں۔ اس طرح فیملی کو اکٹھے مل بیٹھنے کا (Reunification) موقع بھی مل جاتا ہے۔

اسلام آباد کے سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر کام کرنے کی بجائے، بیورو کریٹ اپنے اپنے بچوں کے مستقبل بنانے پر زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ باقی وقت اپنی پروموشن اور بہتر سیٹ پر تبادلے کیلئے پبلک ریلیٹنگ پر خرچ کرتے ہیں۔ پھر بھی وقت بچ جائے تو اسے ملکی سیاست میں کیڑے نکالنے پر لگاتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سادھو اور اللہ لوگ بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مافوق الفطرت ثابت کرنے کیلئے مضامین اور کتابیں لکھواتے ہیں۔ قوم کی بد قسمتی ہے کہ اتنے "ماہرین" کی موجودگی میں خزانے کا ماہر باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ ہر فن مولا کا محاورہ انہی کیلئے گھرا گیا ہے۔ ایک دن سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل حل کر رہے ہوتے ہیں، دوسرے دن امورِ حج اور زراعت کے انچارج ہوتے ہیں، تیسرے دن ملکی تجارت چلا رہے ہوتے ہیں، چوتھے دن قوم کی صحت کے نباض ہوتے ہیں، پانچویں دن امورِ داخلہ میں سریر آرائے حکومت ہوتے ہیں اور چھٹے دن کھیلوں اور ثقافت کا قبلہ درست کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر اتوار کی چھٹی نہ ہو تو ایٹم بم بنانے کا نیا فارمولا تیار کر کے دے سکتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے والے بھی ان کے زیر دست ہوتے ہیں۔ آئین میں ترمیم ہو سکتی ہے یا اسے توڑا جا سکتا ہے مگر انگریز کے دیئے ہوئے سول سروس کے ڈھانچے میں تبدیلی ناممکن ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور اساتذہ کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

جمہوری نظام میں اسمبلیوں کے بعد یونیورسٹیوں کا پالیسی ساز اداروں میں کنٹرول ہوتا ہے۔ پاکستان میں عملاً بیورو کریسی ہی پالیسی ساز بن گئی ہے۔ سول سروس کا اردو ترجمہ عوام کا نوکر یا عوام کا خادم ہے۔ انگریز قوم اور ان کے افسروں کو یہ لفظ منہ سے نکالتے ہی اپنی حیثیت کا احساس ہو جاتا ہے۔ مگر غلاموں کی دنیا میں عوام غلام ہیں اور دفتر میں بیٹھا ہوا "صاحب بہادر" ہے۔ یہ ٹیڑھے منہ سے انگریزی بول کر منہ میں سگار دبا کر اور مہنگے ترین لباس اور جوتے پہن کر اپنے آپ کو اصل حکمران، یعنی انگریز، سمجھتے ہیں۔

بیورو کرٹس سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر 100 سال پرانی بنائی گئی سمری پرائگریزی میں مکھی پر مکھی مارتے رہتے ہیں اور اسی کو صلاحیت اور قابلیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ جدید خیالات، جدید معاشی اصلاحات اور جدید معاشروں کی تشکیل سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

فیوڈل، جنرل اور بیورو کریٹ تینوں اپنی بقائے باہمی کے اصول پر کار بند رہتے ہیں، ملک اور عوام ان کی آماجگاہ ہوتے ہیں، ملک آزاد رہے یا غلام، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں، انہیں معلوم ہے کہ ہر فاتح کو ان کی ضرورت ہوگی، عراق میں صدام چلا گیا، اس کی فوج پولیس اور بعث پارٹی امریکہ کی ضروریات پوری کر رہی ہیں۔ بیورو کریسی کا رویہ بدلنے کیلئے بھی جمہوریت کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ تمہاری والدہ کیسی ہیں، مجھ سے اُن کا کوئی رابطہ نہیں۔

والسلام!

تمہارا والد!

فیوڈل مسٹر کلین (Mr Clean) ہوتا ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

25 مئی 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم!

مزاج بخیر!

تم کہتی ہو متوسط طبقے کے سیاستدانوں پر الزامات کیوں لگتے ہیں؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ متوسط طبقے کے لیڈر عوام میں سے آتے ہیں۔ اسلئے ان کی کوئی چیز بھی عام آدمی سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی، وہ اگر سائیکل سے پجارو پر اور چھوٹے سے بڑے مکان میں آجائے تو تنقید کی زد میں ہوتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے، اسے اپنے طرز زندگی کی جو ابد ہی کرنا پڑتی ہے اور وہی قیادت اُبھرتی ہے جو عوام کو اپنے اعمال کے بارے میں مطمئن کرتی ہے۔ متوسط طبقے کی قیادت ہی ملک کو دلدل سے نکالتی سکتی ہے، اسے معاشرے کے سخت احتسابی شکنجے کا سامنا کرنے کیلئے خود کو تیار کرنا چاہئے۔

سول اور ملٹری بیورو کریسی اور فیوڈل کی زندگی سینکڑوں پردوں کے اندر ہوتی ہے۔ ملک کے تمام قوانین ان کی معاشی بد اعمالیوں کی پردہ پوشی کرنے کیلئے بنائے جاتے ہیں، اسلئے ملک کو صحیح قیادت نصیب نہیں ہو سکی۔ فیوڈل تو پیدائشی طور پر ہی مسٹر کلین (Mr. Clean) ہوتا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد نے قوم کو بچ کر جو جاگیریں حاصل کی ہوتی ہیں، وہ اس کے گناہوں میں شمار نہیں کی جاتیں۔ متوسط طبقے کے لوگ یا وہ نسلیں جنہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی تھی، ہر سال اپنی محدود زمینوں سے بھوک کی فصل اٹھاتے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی کا صلہ پانے والے ہر سال پہلے سے زیادہ سونے اور جواہرات سے اپنی تجوریوں کو بھرتے ہیں، انہیں بھلا کون مورد الزام ٹھہرا سکتا ہے۔

فیوڈل کے تمام جرائم ضلعی انتظامیہ کی سرپرستی میں پروان چڑھتے ہیں۔ ضلعی انتظامیہ اسے مضبوط اور محفوظ کرنے کیلئے رات دن کام کرتی ہے۔ اس کا ٹکراؤ مقامی انتظامیہ سے نہیں ہو سکتا۔ اپنے لوگوں پر جبر کرنے کیلئے وہ ضلعی انتظامیہ کی تابعداری کرتا ہے۔ فیوڈل زرعی اصلاحات کی زد میں آئی ہوئی غریب کسانوں کی زمینیں اپنے اگلے بیس سال میں پیدا ہونے والے بچوں کے نام کراتا ہے۔ اس میں وہ کوئی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا۔ قانون اس طرح بنایا جاتا ہے جو فیوڈل ازم کا مددگار ہو۔ اپنی زمینوں کو سرکاری مشینری سے آباد کرتا ہے۔ یہ مشینری، بظاہر، غریب کسانوں کیلئے قومی خزانے سے خریدی جاتی ہے۔ خزانے میں رقم بیرونی قرضوں کے ذریعے آتی ہے، قرضوں کا بوجھ غریب پر آجاتا ہے۔ اپنی فصلوں کی ڈگنی قیمت سرکار سے وصول کرتا ہے؟ منڈی کاریٹ مصنوعی طور پر بے تحاشا بڑھا دیا جاتا ہے۔ عام کسان بیچارہ یہ ریٹ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ سیاسی اثر و رسوخ سے نہری پانی، ناجائز ذرائع سے، حاصل کر کے بے آباد زمینوں کو کوڑیوں کے مول خرید کر کروڑوں کی ملکیت میں بدل دیتا ہے۔ سرکاری ناجائز پانی سے باغات پیدا کرتا ہے اور ناجائز ذرائع سے سونے کی کان میں بدل لیتا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں ٹیل والے کسانوں تک پانی نہیں پہنچتا۔ سڑکیں اپنی زمینوں پر بنواتا ہے، ہسپتال اپنی زمین پر بنوا کر جانوروں کے باندھنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ اپنے حلقے پر گرفت رکھنے کیلئے تھانہ، کچہری اور عدالت میں چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی کرنا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اختلاف رائے رکھنے والے مظلوموں کو اتنا خوفزدہ کر دیتا ہے کہ ان کی نسلیں بھی اس کے مخالف کو ووٹ دینے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔

جب حکومت میں ہوتا ہے تو سرکار کے تمام وسائل اپنے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے۔ سرکاری نوکریاں بغیر میرٹ کے تقسیم کرتا ہے اور اس طرح کی بھرتی سے مقامی انتظامیہ کا حسن بن جاتا ہے، ان کی ترقی اور تبادلہ اسی کی سفارش پر ہوتا ہے۔ ان تمام مفادات کے تحفظ اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کیلئے اقتدار میں رہنا اس کی مجبوری ہوتی

ہے۔ اپنی معاشی حیثیت کو مستحکم کرنے کیلئے فیوڈل اب سیڈ مافیا (Seed Mafia) کا حصہ بن گیا ہے۔ سرکاری محکمے اپنی تحقیق کی تکمیل کے آخری مراحل میں کسانوں کی یہ امانت بڑے زمینداروں کو دے دیتے ہیں۔ بازار میں نایاب ہو جانے کی وجہ سے فیوڈل اسکا خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور وہ سو روپے کی لاگت سے چار ہزار روپیہ منافع کماتا ہے اور کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ جب تک لوگوں کو حقائق کا علم نہ ہو وہ اپنی شیریں گفتاری اور درباری آداب کی تربیت کی وجہ سے فرشتہ نظر آتا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا شریک ہلاکتا ہے۔ اسی لئے فیوڈل روشنی کا دشمن ہوتا ہے۔ اپنے علاقے میں تعلیم کو نہیں آنے دیتا، ترقی نہیں ہونے دیتا، اس کے حریف فیوڈل بھی اسی طرح کے فیوڈل ہوتے ہیں، وہ اس کی ان خامیوں پر انگلی نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ یہی ”کار خیر“ وہ بھی اپنے علاقوں میں سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ باہر کی دنیا میں وہ مسٹر کلین ہوتا ہے اور اسکا حریف بھی مسٹر کلین! فیوڈل اول و آخر فیوڈل ہوتا ہے۔ سیاستدان بننا اسکی مجبوری ہے۔ سیاست میں اسکا کوئی نظریہ ہوتا ہے نہ مقصد۔ وہ صرف اور صرف اپنی بالادستی چاہتا ہے، اوپر والے بالادست کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ وہ اقتدار کے بغیر اسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا، جس طرح پانی کے بغیر مچھلی۔ لوٹے کا لفظ اس کی توہین نہیں بلکہ تو قیر کا باعث بنتا ہے۔

ایک فیوڈل نے ہی کہا تھا کہ ہم نے کبھی پارٹی نہیں بدلی، ہماری پارٹی حکومتی پارٹی ہے۔ اگر کوئی ہماری پارٹی سے نکل جائے تو لوٹا وہ ہے یا ہم؟۔

چونکہ دانشور طبقہ اتنی باریکیوں میں نہیں جاسکتا۔ فیوڈل اس کی کمزوریوں کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ قوم کے سامنے اس کا چہرہ اور ہوتا ہے اور محکوموں کے درمیان اور..... فیوڈل ازم کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوتا ہے کہ فیوڈلز کی باہمی چپقلش سے ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، مگر اس دشمنی کا کمزور طبقات کو ایک فائدہ ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ عام آدمی کو فیوڈلز کے اختلافات کی وجہ سے زندہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ فیوڈل کے جرائم پر گرفت نہ ہونے کی وجہ سے دیہاتی معاشرے میں جرائم سے نفرت ختم ہو جاتی ہے، عام

آدمی سمجھتا ہے کہ زور آور کو قانون توڑنے سے روکنے والا کوئی نہیں اور قانون کی بے وقعتی جرائم کی دنیا کو آباد کر دیتی ہے۔ تھانے جرائم کا اڈہ بن جاتے ہیں۔ انتظامیہ کھلے عام رشوت لیتی ہے۔ لوگ قومی سوچ سے لاتعلق ہو کر ذاتی انتقام، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت میں ملوث ہو کر قومی دھارے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ فیوڈل ان کے جھگڑوں کو بڑھاتا ہے، صحت مند معاشرہ قائم ہونے کی بجائے لوگ ایک دوسرے سے دشمنیاں پالتے ہیں۔ چونکہ اسی فیصد آبادی دیہاتوں میں ہے، یہ کلچر شہروں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ عدالتیں سفارش اور رشوت کی زد میں آجاتی ہیں "جس کی لاشی اس کی بھینس" کا اصول پورے ملک کا طرز زندگی (Way of life) بن جاتا ہے۔ تم خود فیوڈل ازم کی بالا دستی والے معاشرے میں پیدا ہوئی ہو، مجھے یقین ہے میری بات سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی ہوگی۔

والسلام!

تمہارا والد!

کیا میں غدار ہوں؟ بسم اللہ الرحمن الرحیم

2 جون 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

جیل حکام نے میری چار پائی کوزنجیر سے باندھ کر دروازوں کی سلاخوں سے تالا بند کر دیا۔ جیل کے اعلیٰ حکام کا دورہ تھا اور مجھے بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنا کر پیش کرنا مقصود تھا۔ طبیعت پر اس کا کافی اثر رہا، شاید یہی وہ چاہتے تھے۔

آج تین بجے اٹھا تو سلاخوں کے سامنے حسب معمول پہرے دار کھڑا تھا۔ شروع میں میں اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ یہ ساری رات میری کروٹوں کا حساب کیوں رکھتے ہیں لیکن اب میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ کچھلی ملاقات پر تمہارے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب لکھوں، لیکن شدید گرمی اور جس نے بے چین کئے رکھا۔ اب آہستہ آہستہ طبیعت اس کی بھی عادی ہو گئی ہے۔ آج خود کو تازہ دم محسوس کر رہا ہوں۔

انسان میں اللہ تعالیٰ نے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں۔ مگر اس کے باوجود انسان ماحول کے مطابق ڈھلنے کی بجائے ماحول کو اپنے مطابق ڈھالتا رہتا ہے اور اپنی مرضی کے ماحول کے لئے بہشت کے قیام کو بھی اپنی آزادی پر قدغن سمجھتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر میں عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوں۔ قید کے اس دوزخ میں ضمیر کی آزادی کی نعمت کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ مجھے اس بے پناہ مسرت کی منطق سمجھ نہیں آتی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ ماہ کا عرصہ ہو گیا، تنہائی کا زہر بھی میرے لئے کارِ تریاق بن جائے تو پھر اسے دماغ کے خلل کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔

میں نے تمہیں بتایا تھا، میری ذہنی ساخت و پرداخت میں میرے گھریلو ماحول کا بہت اثر ہے۔ گھر کی چار دیواری میں میں نے سعدی رومی، حافظ شیرازی، نظامی گنجوی، اقبال لاہوری، ارسطو، افلاطون، سقراط، بقراط جیسے نام اپنی والدہ اور والد سے سنے۔ بڑے بھائی نے فارسی سے اردو کی طرف سفر کرایا۔ نسیم حجازی، مقدمہ ابن خلدون، ابن جریر طبری کی مل ملا کر پچاس کے قریب جلدیں پڑھنے کے بعد نہج البلاغہ، بخاری، موطا، قدوری، مشکوٰۃ، ماجہ، ترمذی سے گذر کر ابن تیمیہ، امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام مالک، امام ابو یوسف کی شد بدھ ہونے لگی۔

میٹرک کرنے سے پہلے تفاسیر اور فتاویٰ کو سمجھنے کیلئے کوشاں ہو گیا۔ تفسیر ابن کثیر سے، مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ، مولانا احمد رضا خان، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ عالمگیری زیر مطالعہ تھے۔ انہی دنوں میں تاریخ بنو امیہ، بنو عباس، تاریخ انگلستان، تاریخ فرشتہ اور مغلوں کی تو زکیں پڑھنے کا موقع ملا۔ عصر حاضر کے لکھنے والوں میں مولانا نمودودی کی خلافت و ملوکیت سے مقدمہ تفہیم القرآن تک اور تفسیر تفہیم القرآن سے صاحب تفہیم القرآن تک پہنچا۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادب کے صحن چمن کے چند گوشوں کی سیاحت کر سکا۔ ذہن میں ایک ملغوبہ تیار ہو گیا۔ اب نہ اردو آتی ہے، نہ فارسی اور نہ انگریزی۔ بس کام چل رہا ہے.....

اردو میں اساتذہ کے کلام کے بعد اقبال اور فیض اچھے لگے۔ انگریزی میں بھی ورڈز ورثہ (Words Worth)، کیٹس (Keats) اور شیلے کالریج (Shelley Coleridge) بیرن (Byron) سے آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ فارسی میں رومی، حافظ شیرازی، عمر خیام، فردوسی سے پروین اعتصامی تک گرتا پڑتا پہنچ ہی گیا۔ سادہ عربی سمجھ لیتا ہوں لیکن عربی ادب سے بالکل کورا ہوں۔

ابھی میٹرک کے امتحان میں دو مہینے باقی تھے کہ 17 مارچ 1966ء میں میری شادی ہو گئی۔ تمہاری والدہ مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نے اشاروں کنایوں میں

بزرگوں تک پیغام پہنچایا کہ دومی کو میرا پہلا پرچہ ہے۔ مگر آزادی نسواں کے اس دور میں مردوں کی کون سنتا ہے۔ میری خالہ اور والدہ یعنی آپ کی دادی اور نانی کا فیصلہ تقدیر مبرم کی طرح صادر ہو چکا تھا۔

میں چھوٹی عمر کی شادی کے سخت خلاف ہوں۔ لیکن میری ذات کے حوالے سے نتائج مختلف ہیں مجھے چھوٹی عمر کی شادی راس آگئی۔ مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے تمہاری والدہ پوری زندگی میری ذمہ داری نہیں رہی اب تو مشترکہ خاندان کی ذمہ داریاں بھی اسکے کندھوں پر ہیں۔

گھر کی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کے لئے میرے پاس کافی وقت تھا۔ جب میں یونیورسٹی پہنچا تو تمہاری بہن میمونہ پیدا ہوئیں۔ وہ سارے خاندان کی آنکھ کا تارا تھیں۔ خاص طور پر، دادا، دادی اور نانا، نانی کی محبتیں اس پر نچھاور تھیں۔ ہر مرحلے پر مجھے خاندان کی مدد مل رہی تھی اور میرے لئے حق اور سچائی کے راستے پر چلنا اتنا دشوار گزار نہیں لگتا تھا۔ ذہنی پختگی کیلئے پنجاب یونیورسٹی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میں کالج سے فلسفہ کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی میں فلسفہ کی وسیع دنیا آباد تھی۔ اس دنیا میں نہ خود کو تلاش کر سکا ہوں اور نہ حق اور سچائی کو بالادست کر سکا ہوں۔ لیکن سچائی کے پرچم کو سرنگوں بھی نہیں ہونے دیا۔ جو میرے خیالات کو پابند سلاسل نہ کر سکے، وہ میری چار پائی کوزنجیروں سے باندھ کر تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اقبال نے "فلسفہ زدہ سیدزادے" کو مطعون کیا تھا، جو زنجاری برگساں ہو گیا تھا۔ اقبال کو ہیگل کا صدف بھی گوہر سے خالی نظر آتا ہے۔ وہ ہابز (Hobbes)، روسو (Rousseau)، لاک (Locke) اور کانٹ (Kant) کا پیچھا کرتا ہے۔ راستے میں اسے انقلاب فرانس اور نیست پینمبرو لے دارد کتاب والا کارل مارکس بھی ملتا ہے۔ وہ دانٹے کی Divine Comedy تک حکیم نطشے کو ذہن میں رکھ کر پہنچتا ہے۔ آخر میں کہتا

”سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف“

میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں کارل مارکس کو کوئی برگزیدہ شخص تو نہیں مانتا، نہ ہی ماؤزے تنگ جیسے عظیم مصلح کو صرف ردِ کنفیوشس اور لوٹزے (Laozte) کا پیروکار کہہ کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمام پیغمبرِ غریبوں، مظلوموں اور روندے ہوئے طبقات کے محافظ تھے۔ تمام پیغمبروں نے ظالموں کا مقابلہ کیا ہے۔ فرعون، نمرود، شداد اور اہلِ مدین جبر کے نمائندے تھے۔ پیغمبرانِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو درکھان کا بیٹا، حضرت ادریس علیہ السلام کو جولا ہے کا بیٹا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غلامِ ابنِ غلام کہا گیا۔

پیغمبرِ علیہ السلام کے بارے میں بھی کہا گیا کہ اگر نبوت نے آنا تھا تو وہ قریش کے سرداروں کے گھر آتی۔ ایک ایسے شخص کے پاس کیوں آئی جو ایک خاتون کے ہاں روزگار کیلئے کام کر رہے تھے۔ اسی طرح اپنے دور میں کارل مارکس اور ماؤزے تنگ نے غریب طبقات کی بات کی ہے۔ میں اُن کا پیروکار اس لئے نہیں بن سکا کہ ان کے فلسفہ میں جبر کو کچھ مقامات پر بالادستی حاصل ہو جاتی ہے۔

جہاں انسان کی آزادی پر قدغینیں زیادہ ہوں، وہ نظامِ خود اپنے بوجھ کے نیچے دب کر ختم ہو جاتا ہے اور یہی کمیونزم کے ساتھ ہوا ہے۔ ورنہ کارل مارکس اور ماؤزے تنگ کی ادائیں تو پیغمبرانہ تھیں۔

برطانیہ کا میگنا کارٹا، فرانس میں روسو کا معاہدہِ عمرانی اور امریکہ کا (Bill of Rights) حقوقِ کامل انسانی تہذیب کے ارتقاء میں اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ انقلابِ فرانس نے انسانی آزادیوں کی جدوجہد کو نیا رخ دیا ہے۔ روسو نے کہا! انسان آزاد پیدا ہوا تھا۔ اب وہ ہر جگہ زنجیروں میں پابند ہے۔ گونے اور نطشے نے انقلابِ فرانس کو عالمِ انسانی پر ایک قوسِ قزح کی طرح دیکھا اور ولشیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آدھا انقلابِ فرانس ہے۔

یہ سارے انکشافات یورپ پر اڑھائی تین سو سال پہلے ہوئے، سوائے میکنا کارٹا کے، جو تقریباً آٹھ سو سال پہلے ہوا تھا۔ وہ صرف بادشاہ اور برطانیہ کے زمینداروں کے حقوق کا تعین کرتا تھا۔

14 سو سال پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا "تم نے کب سے انہیں غلام بنا رکھا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جتنا تھا"۔

میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول تمہارے دادا کے ڈیرے کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ مجھے روسو کی آواز میں انسانیت کی بالادستی کی وہی روح جلوہ گر نظر آتی ہے جس کا درس اسلام نے دیا ہے۔

میں سب سے زیادہ ٹاں پال سارتر کے فلسفہ وجودیت سے متاثر ہوا ہوں۔ وہ کہتا ہے!

I am committed Therefore I am

ویت نام اور الجزائر کے مسئلہ پر سارتر کے علاوہ برٹینڈرسل نے بھی مجھے متاثر کیا ہے اور مشرق کے دوبارہ بیدار ہونے کی اس کی پیشگوئی سو فیصد صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن ٹاں پال سارتر کی اپنے عقائد کے ساتھ عملی وابستگی نے اسے میرا ہیرو بنا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے "اچھائی اور برائی کے معرکے میں کوئی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ خیر و شر کی معرکہ آرائی میں محض تماشاخی کا کردار ادا کرنے والے یا تو بزدل ہوتے ہیں یا غدار"۔

میں ایسے فلسفہ کا پیروکار ہوں، جس میں سب کا خلاق اور سب سے طاقت ور یہ کہتا ہے کہ میں اپنے حقوق معاف کر سکتا ہوں، لیکن بندوں کے حقوق معاف نہیں کر سکتا، یا نہیں کرونگا۔ یہ وہ مقام بندگی ہے۔ جسے دیکر انسان شان خداوندی نہیں لینا چاہتا۔

محسن انسانیت کا دیا ہوا یہ درس، تاقیامت، ہمارے لئے مشعل راہ ہے، شہیدوں میں سے بہتر حمزہ بن عبدالمطلب ہیں، پھر ان کے بعد وہ شخص ہے جو کسی حاکم کے سامنے کھڑا ہو اور حاکم کو امر و نہی کی تلقین کرے، جس کی پاداش میں وہ حاکم اسے ہلاک کر دے۔ ہمیں لیڈر سے زیادہ ریفارمر (مصلح) کی ضرورت ہے۔ ایسا مصلح جو آج کی ناقابل علاج

معاشرتی بیماریوں کا دارو بن سکے اور اپنے کردار کے نشتر سے فاسد مادوں کو قوی وجود سے پاک کر دے۔

میری سوچ، عمل اور قول و فعل میں تضاد ہے۔ سوچتا کچھ ہوں اور کرتا کچھ اور ہوں۔ یہی قول و فعل کا تضاد ہی ہماری سب سے بڑی بیماری ہے۔ دعا کرو کہ تمہارا والد اور پوری قوم اس بیماری سے شفا یاب ہو جائے۔

والسلام!

تمہارا والد!

متوسط طبقے کی قیادت

بسم الله الرحمن الرحيم

15 جون 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اوڈیالہ راولپنڈی

بشوبی بی!

مزانج بخیر!

السلام علیکم!

میرا سیل تنہا کی طرح تپ رہا ہے، راتیں بھی کروٹیں بدلتے گذرتی ہیں۔ کیمپ جیل لاہور میں ہمیں اڑکولز کی سہولت حاصل تھی، یہاں وہ بھی نہیں ہے۔ گوانتانامو بے بھیجنے اور وہاں سے آزاد ہو کر آنے والے قیدیوں کو الگ رکھنے کیلئے جیل میں ایک ویران گوشہ تلاش کیا گیا، جسے جیل میں، گوانتانامو بے سیل یا کیوبا سیل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسکے حفاظتی انتظامات کئے گئے، دیواروں کو اور بلند کیا گیا، بجلی کی تاریں لگا کر اسے محفوظ کیا گیا۔ اسکے ارد گرد کے علاقے بھی خالی کر دیئے گئے، گویا میں ایک ویران جزیرے میں رہتا ہوں۔ جہاں خود رو پودوں اور پرندوں کی آوازیں، جنگلی چوہوں اور بلیوں کا بسیرا ہے۔ انسانی شکلیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں اور انسانی آوازیں سننے کو کان۔

جب مجھے اس سیل میں بھیجا گیا تو میں نے احتجاج کیا، مگر ”باغی اور غدار“ کی بات پر کون توجہ دیتا ہے۔ ایک لوہے کی پلیٹ اور ایک پلاسٹک کا گلاس، مجھے کھانے پینے کیلئے دیا گیا۔ یہ اس سیل میں میری کل کائنات تھی۔ کوٹ لکھپت جیل میں تو ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پینا پڑتا تھا، ہاں! یہاں ایک عدد لوٹا بھی تھا، سچی بات ہے کہ مجھے یہاں آ کر لوٹے کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔ مجھے لگتا ہے یہی احساس دلانے کیلئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ جس طرح میرے جیسے دیہاتی کا ایک میلے میں کھیس (گرم کبیل) چوری ہو گیا تو اُس نے کہا! میلہ تو میرے کھیس کو چرانے کیلئے لگایا گیا تھا۔

اب رہا تمہارا سوال کہ متوسط طبقے کی قیادت کیوں نہیں ابھری؟ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے متوسط طبقے کی قیادت اور جمہوریت کی تین علامتیں تھیں۔ موچی گیٹ لاہور، لالو کھیت کراچی، اور پلٹن میدان ڈھا کہ۔ ہمارے حکمران پنجابی بیوروکریسی فوجی جرنیل اور نیوڈل لارڈ، ان تینوں علامتوں کو مٹانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

مشرقی پاکستان کی قیادت متوسط طبقے سے آتی تھی، وہاں کی 80 فیصد زمینوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور روٹ پر مسلمانوں کا۔ ہندو وہاں اپنی بقا کی جنگ لڑنے کیلئے مسلمان قیادت کو استعمال کرتا تھا، لیکن براہ راست اسمبلیوں تک پہنچنا اس کیلئے ناممکن تھا۔ آہستہ آہستہ وہاں کی قیادت پر ہندو مارواڑیوں کی گرفت کمزور ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنی دولت کلکتہ منتقل کر رہے تھے اور مقامی آبادی کے غیظ و غضب کا نشانہ بن رہے تھے۔

مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو مستحکم کرنے کی بجائے بے توقیر کر دیا۔ ان کی 200 سال کی جدوجہد کو انگریزوں کے کاہلے مذاق کا نشانہ بناتے تو ان کے زخم ہرے ہو جاتے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ملک میں "جمہوریت کا ایک جزیرہ" رہ گیا تھا جس سے متوسط طبقے کی قیادت جنم لیتی تھی۔ پورے ملک کی امیدوں کا مرکز کراچی اور حیدرآباد کو سمجھا جاتا تھا، اسے ختم کرنے کیلئے پھر نئی منصوبہ بندی کی گئی۔ وہاں سے متوسط قیادت تو آتی ہے مگر اس کی سوچ کا دھارا بلدیاتی حدود سے آگے نہیں نکل سکا۔

دنیا میں بے شمار ملک ہیں، جن کی ترقی کا دروازہ متوسط طبقے کی قیادت نے کھولا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بار بار انتخابات ہوں اور اداروں کو مستحکم ہونے کا موقع ملے تو صرف پاکستان ہی نہیں پوری ترقی پذیر دنیا میں سیاسی استحکام کی وجہ سے معاشی انقلاب آجائے گا۔ متوسط اور غریب طبقات کی قیادت کا دروازہ اسمبلی میں کھلتا ہے، جب اسمبلی کا دروازہ سالہا سال تک بند کر دیا جائے یا اسمبلیوں کو کٹھ پتلیاں سمجھ لیا جائے تو عوام قومی دھارے سے کٹ جاتے ہیں۔ اسمبلیاں صرف مراعات یافتہ طبقے کے کلب بن جاتی ہیں اور عوام کی نفرت کا مرکز۔

تمہیں بتانا تھا، سعدیہ اور عمران ملنے آئے تھے، محمد اور ماہ نور فاطمہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جیل والوں نے ایک سالہ محمد اور دو سالہ ماہ نور فاطمہ کے ہاتھوں پر بھی مہریں لگائی ہوئی تھیں۔ اپنے نانا سے ملنے کیلئے ان بچوں کو جن پابندیوں کا سامنا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہیں اور میرے لئے زادِ سفر!

والسلام

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

قوت برداشت بسم الله الرحمن الرحيم

20 جون 2004ء

گوانتانا مو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشو بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

برداشت کی طاقت زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ سیاست میں تو خاص طور پر اس کی بہت اہمیت ہے۔ میمونہ میں حوصلہ اور برداشت مجھ سے کہیں زیادہ ہے، وہ حادثاتی طور پر سیاست میں نہیں آئی بلکہ حادثہ اس کی ذات کی تکمیل کیلئے انتظار کر رہا تھا۔

برداشت کی دوسری انتہا میں نے جیل میں دیکھی ہے۔ میں صبح و شام پرندوں اور بلیوں کے سامنے اُن کی خوراک ڈال دیتا ہوں۔ ہم سارے ایک دوسرے سے ایسے مانوس ہو گئے ہیں جیسے ایک ہی خاندان کے فرد۔ نہ میں پرندوں کو شکار کرنے کا سوچتا ہوں اور نہ بلیاں ان پر جھپٹتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی سوچ سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ رزق کی بہم رسانی اور قید نے جہتوں پر کنٹرول کر لیا ہے۔ اسی طرح گلوبل ویلج کے چودھری ہمیں بھوکا مار کر اپنے کنٹرول میں لے آتے ہیں اور ہماری قوت برداشت کا امتحان لیتے ہیں۔ جب ہم بھوک سے بلبلا تے ہیں تو قرضوں کی صورت میں ہمیں قوت لایموت فراہم کر دیتے ہیں تاکہ ان کی معیشت کا پہیہ چلتا رہے۔

میں نے زندگی بھر کوشش کی ہے کہ ذاتی دشمنیاں نہ پالوں۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا، یہ وقت فیصلہ کرے گا۔ سکول کی زندگی سے لے کر اب تک جب بھی کوئی انتخاب ہارا ہوں میں نے فریق مخالف کو مبارک باد ضروری دی۔ ذاتی طور پر جا کر بھی اور اخبار کے ذریعے بھی۔

میں قبائلی دیہاتی ماحول میں پلا ہوں۔ میری یہ حرکت میرے حامیوں نے کبھی پسند نہیں کی، مگر میں نے یہ سب والد محترم سے سیکھا۔ وہ کہا کرتے تھے ”دوسرے کو مٹانے کی خواہش کو اپنے دل سے مٹا دو اور اس خواہش کو معاشرے سے برائی مٹانے کی خواہش میں بدل دو“۔ وہ کہا کرتے تھے ہر انسان ایک شخصیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ قدرت کا منشاء بھی یہی ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو اہم سمجھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انسان دو دعائیں کبھی نہیں مانگتا، ایک مزید عقل کیلئے اور دوسری شکل کو بہتر بنانے کیلئے۔ وہ اپنے آپ کو خوبصورت بھی سمجھتا ہے اور عقل مند بھی۔

میں سکول میں پہلی مرتبہ تقریری مقابلے میں صدارت کا عہدہ دو نمبر سے ہار گیا۔ منصفین نے کہا تقریر تو ٹھیک ہے، مگر اس نے وردی نہیں پہنی ہوئی۔ پتہ نہیں میں شروع سے ہی وردی سے کیوں الر جک تھا۔ آخر کار پہنانے والوں نے مجھے وردی پہنا کر ہی دم لیا، خواہ قیدی نمبر 6496 کی وردی ہی کیوں نہ ہو۔ خیر میں بات کر رہا تھا برداشت کی، میں نے پھول صدر بننے والے اور بنانے والوں کو پہنا دیئے، مگر سکول والے انہیں دو نمبر صدر کہہ کر پکارتے، حالانکہ وہ وردی والے صدر تھے، فرسٹ ایئر میں الیکشن ہارا تو سارے پھول جیتنے والے کو پہنا دیئے۔

عملی زندگی کے انتخاب میں جب ہارا تو حریفوں کو گھر جا کر مبارکباد دی۔ ایک مرتبہ عجیب واقع ہوا، میں اپنا ووٹ کا سٹ کرنے کیلئے جلدی سے کمرے میں داخل ہوا تو پیر وارث شاہ مخالف کی صندوق میں ووٹ ڈال رہا تھا، اس کے ہاتھ سے پرچی گر پڑی اور وہ یہ کہتے ہوئے باہر بھاگ گیا کہ میں نے آپ کو ووٹ دے دیا ہے۔ میں نے وہ پرچی اٹھا کر مخالف کی صندوق میں ڈال دی کیونکہ یہ اسی کا حق تھا۔ میرے اور اللہ کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا، میں نے جس کی امانت تھی اس تک پہنچا دی۔ شیطان کو پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی، جس نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی کہ تم ایک ووٹ سے بھی الیکشن ہار سکتے ہو، میرا ضمیر اپنا کام کر چکا تھا۔ یونیورسٹی میں خون جواں تھا، لیکن میری اپنے حریفوں سے دوستیاں تھیں۔ ہم

ایک دوسرے کے خلاف زور و شور سے تقریریں کرتے، لیکن نظریات کی سیاست کبھی ذاتی دشمنیوں میں نہیں بدلی۔ جہانگیر بدر، راجہ انور، انور چودھری، راشد بٹ، حسام الدین قریشی سے اب تک بھائی چارہ قائم ہے۔ راجہ انور کے بال بہت لمبے ہوتے تھے۔ کمرے میں بیٹھ کر ہم اکٹھے چائے پیتے اور اس کے سر اور داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے اور خوب ہنستے۔

1993ء کا واقعہ ہے کہ محترمہ بے نظیر نے لانگ مارچ کا اعلان کیا اور ہماری حکومت نے غلط حکمت عملی سے پورے شہر کو فورٹریس میں تبدیل کر دیا۔ سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب کا راستہ پورے ملک سے کاٹ دیا گیا۔ انک کے پل پر مورچے بنادیئے اور اسلام آباد میں جگہ جگہ پر چوکیاں بنا دی گئیں۔ اس دوران پیپلز پارٹی کے سابق وزیر سیدناظم حسین شاہ ہماری حکومت کو گرانے کیلئے میرے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لانگ مارچ میں شریک ہونے کیلئے اس سے محفوظ راستہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تمہیں معلوم ہے، سیدناظم حسین شاہ میرے قریبی دوست ہیں، ہر الیکشن میں اپنی پارٹی کی حمایت میں اور میری مخالفت میں انتخابی مہم چلاتے ہیں۔ 2002ء کے انتخابات میں بھی میری مخالفت میں پیش پیش تھے۔ میں نے انہیں دوستی کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ سب سے پہلے آپ کو اپنی جماعت سے وفادار رہنا چاہیے اور بعد میں ذاتی دوستوں سے۔ وہ میرے اس مشورے پر بھرپور طریقے سے عمل کرتے ہیں، جب میں جیل میں ہوتا ہوں تو تیتیر، بیڑ، سوہن حلوہ اور شربت بادام کی فراہمی وہ اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود جب بھی اللہ کے گھر جانا ہوتا ہے، پہلی نظر پڑتے ہی، قوت برداشت کی دعا مانگتا ہوں۔ مجھے احساس ہے میری دعا ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔ آؤ تم بھی میری اس دعا میں شامل ہو جاؤ کہ! اے سب کی سننے والے رب، ہمیں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طاقت عطا فرما، آمین۔

والسلام!

تمہارا والد! جاوید ہاشمی

آٹھ ارب کا فائدہ اقتدار اور اختلاف کی سیاست بسم اللہ الرحمن الرحیم

25 جون 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل
سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی
بشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

امید ہے تم خیریت سے ہو گی۔ تم سے ملے ہوئے تین مہینے ہو گئے۔ امتحانات کی تیاری کیسی ہے؟ صاف ظاہر ہے تم ان دنوں بہت مصروف ہو گی۔ جونہی امتحانات ختم ہوں مجھے آکے مل جانا۔ بہتر یہی ہو گا کہ پہلے ملتان جا کر ماں کی خیریت دریافت کرو اور پھر زیادہ وقت اسلام آباد میں رہ کر اپنا تھیسز (Thesis) مکمل کرو۔ یہاں تمہیں تربیت حاصل کرنا آسان ہو گا اور مجھ سے ملنے میں بھی سہولت ہو گی۔ تم نے پوچھا تھا: میرے وزیر بننے کا قوم کو کیا فائدہ ہوا؟ حزب اختلاف میں رہنے سے میں نے کونسی قومی خدمت سرانجام دی اور جیل جانے سے کونسی بہتری آگئی ہے؟

میں مختصراً تمہاری دونوں باتوں کا جواب دیتا ہوں۔ کیونکہ یہ تفصیل کا موقع نہیں۔

میں میاں نواز شریف کی دونوں حکومتوں میں کابینہ میں شامل تھا۔ پہلی کابینہ میں میرے پاس سپیشل ایجوکیشن، سوشل ویلفیئر، ہاؤسنگ و تعمیرات اور کچھ وقت کیلئے ماحولیات کی وزارت تھی۔ ہاؤسنگ و تعمیرات کی وزارت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ پوری قوم کے سر پر چھت فراہم کرنے کی پالیسی پر مبنی نئی تعمیرات سے لے کر ملازمین کو تمام حکومتی گھروں کی الاٹمنٹ اور ان کی درجہ بندی کا آخری فیصلہ متعلقہ وزیر کے پاس ہوتا ہے۔ میں نے بطور وزیر کوئی ایک فیصلہ بھی میرٹ سے ہٹ کر نہیں کیا۔ بلکہ اپنے اختیارات ایک کمیٹی کے

حوالے کر دیئے۔ جس میں عوامی نمائندے موجود تھے۔ (آج تمہیں خط لکھ رہا تھا۔ اخبار میں خبر چھپی ہے کہ یہ اختیارات دوبارہ ہاؤسنگ کے وزیر کو واپس کر دیئے گئے۔) میں فقط ان کے فیصلوں پر عملدرآمد کراتا تھا۔ ایک بہت بڑی جائیداد جس کی قیمت اربوں روپے ہے، محتسب اعلیٰ نے ایک کاروباری گروپ کے حوالے کرنے کو کہا۔ مجھے اس گروپ کے کچھ نمائندے ملے اور کہنے لگے کہ اگر آپ محتسب اعلیٰ کے حکم پر عمل درآمد کرائیں گے تو اس سے آپکی نیک نامی میں اضافہ ہوگا اور آپکے دوست یا عزیز ہمارے پارٹنر بھی بن سکتے ہیں۔ میں نے کہا: آپ کا حق بنتا ہے تو اس حق کی حفاظت کا میں نے حلف اٹھایا ہے۔ اگر آپ کا حق نہیں بنتا تو میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔

میں نے فائل منگوائی، محتسب اعلیٰ کا فیصلہ یکطرفہ تھا۔ میری وزارت نے اس فیصلے کو چیلنج کر دیا اور حکومتی خزانے کو اربوں کے نقصان سے بچالیا گیا۔

محترمہ بے نظیر کے دور میں پھر اس گروپ نے یہ زمین اپنے نام کرانے کی کوشش کی، میں اس وقت قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔ مجھے خواجہ طارق رحیم وی آئی پی لاؤنج اسلام آباد میں ملے۔ میں ارکان قومی اسمبلی کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ حسب عادت اونچی آواز میں کہنے لگے کہ اس بیوقوف سے پوچھو، اس نے کروڑوں روپے کی آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ جائیداد اب انہی لوگوں کو الاٹ ہو گئی ہے، جن کیخلاف یہ رکاوٹ بنا تھا (اس وقت خواجہ طارق رحیم محترمہ بے نظیر کی کابینہ میں وزیر تھے۔) میں نے اور دوسرے حزب اختلاف کے ارکان نے یہ معاملہ پہلے ہی اسمبلی میں اٹھایا ہوا تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر حزب اختلاف باصلاحیت ہو تو حکومت سے زیادہ عوام کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم اتنا احتجاج کریں گے کہ حکومت کو فیصلہ بدلنا پڑے گا اور بعد میں یہی ہوا۔ یہ جائیداد میری معلومات کے مطابق ابھی تک قوم کی ملکیت میں ہے۔

دوسری مرتبہ میں وزیر صحت تھا۔ جب حلف اٹھانے کے بعد اپنے دفتر میں گیا تو سیکرٹری ہیلتھ ظہیر سجاد نے جو ہمارے سابق چیئر مین سینٹ و سیم سجاد کے بھائی ہیں، کہا سر!

ہم نے پولیو کی مہم چلانی ہے، کوئی ملک ہمیں مدد دینے کو تیار نہیں، بجٹ میں اس کیلئے پیسے نہیں ہیں، اب کیا ہوگا؟۔ میں نے اعانت کرنے والے ملکوں کی میٹنگ بلائی۔ ان سے سیاستدان کی زبان میں گفتگو کی۔ خطوط کے ذریعے ان کے ملکوں سے رابطہ کیا، ہمیں کروڑوں روپے کی مطلوبہ ویکسین بروقت مل چکی تھی اور قومی خزانے سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ اس سے پچھلی حکومت کا پولیو کا 35 لاکھ کا ویکسین کا سینڈل بھی ہمارا راستہ نہ روک سکا۔

تمہیں سیاسی اقتدار کے ان پہلوؤں سے روشناس کر رہا ہوں، جو قومی خزانے پر بوجھ بننے کے پروپیگنڈے کا حصہ ہیں۔

صحت کے محکمے کو ایک ٹیکنیکل وزارت سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ میرا علم تھا اور نہ تجربہ، نیکن عوامی تعلق کسی بھی سیاستدان کو کامیاب کر سکتا ہے۔ اسی لئے برطانوی پارلیمانی نظام میں کہا جاتا ہے ”کہ وزیر کو سپیشلسٹ نہیں ہونا چاہئے بلکہ جرنلسٹ ہونا چاہئے“۔ یہاں پر تو سیکرٹری بھی سپیشلسٹ نہیں ہوتا، نہ ہی ٹیکنو کریٹ اور نہ ہی جرنلسٹ۔

میں نے صرف ایک فیصلے سے قومی خزانے کو ہر سال ایک ارب بیس کروڑ کے زرمبادلہ کا فائدہ پہنچایا ہے، اب تک یہ بجٹ آٹھ ارب روپے ہو چکی ہے اور ہر سال ہوتی رہے گی۔ میری طرف سے قوم کے اعتماد پر پورا اترنے کی یہ ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔

ہوایوں کہ مجھے اپنے عوامی رابطوں سے پتہ چلا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں خام مال چین، بنگلہ دیش، سنگاپور سے خرید کر باہر کہیں Dump کرتی ہیں اور پھر اسے سوئٹزر لینڈ، امریکہ یا فرانس یا کسی مغربی ملک کا مال قرار دے کر ہمیں مہنگا فروخت کرتی ہیں۔

اس کا فرق تمہیں یوں سمجھ آئے گا کہ ایک کلو خام مال جو سنگاپور یا تائیوان سے پانچ سو ڈالرنی کلو گرام خریداجاتا، وہ ہمیں 35 ہزار ڈالرنی کلو گرام فروخت کیا جاتا۔ ہم یہ مال ٹنوں میں درآمد کر رہے تھے اور جہاز بھر بھر کر قیام پاکستان سے لے کر اب تک آرہے تھے۔ کسی نے چیک کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اس خام مال کو امریکہ اور یورپی ممالک خود

ہندوستان، چین، سنگاپور اور بنگلہ دیش سے خریدتے ہیں اور وہ اپنے لئے دوائیں بناتے ہیں۔ چونکہ خام مال کی خاصیت ایک ہوتی ہے، اس لئے ترقی یافتہ اقوام اب خام مال تیار کرنے کی بجائے درآمد کرتی ہیں اور ہم جیسے ناسمجھوں کو درآمد کرتی ہیں۔

میراٹارگٹ فی سال پانچ ارب روپے بچانے کا تھا، کیونکہ قومی خزانے کو صرف خام مال کی مد میں ہر سال پانچ ارب روپے کے زرمبادلہ کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔

تم پوچھو گی کہ میں نے یہ کارنامہ سرانجام کیسے دیا جو گذشتہ پچاس سال میں نہ کیا جاسکا؟ ہوا یوں کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لٹیروں کی مفادات کے ٹکراؤ پر جنگ ہو گئی۔ ان میں سے ایک کمپنی کے سربراہ نے مجھے کہا: اگر آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دباؤ میں نہیں آئیں گے تو میں خام مال کی اصل قیمتوں کی تمام فہرستیں آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اسے کہا: میں اپنے عوام کا چوکیدار ہوں تم مجھ پر اعتماد کرو۔ جب میں نے تمام فہرستیں ملٹی نیشنل کمپنیز کے سربراہوں کے سامنے رکھیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اسی دوران میں جینوا گیا تو ان سربراہوں نے مجھے وہاں ملنے کی کوشش کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں محدود ایجنڈا لے کر آیا ہوں۔ یہ معاملات پاکستان کی سر زمین پر میرے دفتر میں مینٹنگ میں طے ہو سکتے ہیں۔ میں اکیلا فیصلہ نہیں کر سکتا، وہ مایوس ہو گئے۔ میں نے ڈاکٹر غیور احمد ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی سے طویل مذاکرات ہوئے اور آخر کار یہ کمپنیاں رضا کارانہ طور پر خام مال کی قیمتوں میں کمی کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ان سے طے پایا کہ پہلے مرحلے میں وہ ایک ارب تیس کروڑ روپے کا زرمبادلہ کم کریں گے۔

ہمارا ٹارگٹ 5 ارب روپے سالانہ کم کرنے کا تھا۔ اس دوران ہماری حکومت ختم ہو گئی۔ اب اس واقعہ کو 6 سال ہو گئے ہیں اور اس طرح قومی خزانے کو 8 ارب کے زرمبادلہ کا فائدہ ہوا ہے اور ہر سال یہ عمل جاری رہے گا۔ خط طویل ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے تین

مرتبہ دواؤں کی قیمتیں کم کیں، یہ کیسے ہوا..... میرے جیل میں آنے کا قوم کو کیا فائدہ۔
یہ ساری باتیں پھر کسی وقت..... بس امتحانات سے فارغ ہو آ کر مجھے مل جاؤ، مگر پہلے
ملتان میں اپنی والدہ سے ملنے کے بعد..... ملتان جا کر سعدیہ سے کہنا، وہ محمد اور ماہ نور
فاطمہ کو مجھ سے ملا جائے، میں ان کے بغیر اُداس ہوں۔

والسلام!

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

عہدے کی سیاست اور نیلسن منڈیلا سے ملاقات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

2 جولائی 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو تم، پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔

میں آج بہت اُداس ہوں، تمہاری ماں اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ گذشتہ ایک ماہ سے جیل تک بھی نہیں آسکی۔ بچوں کی خبر گیری کیسے کرے گی، مومنہ ماں کی تیمارداری بھی کرتی ہے اور میرا خیال بھی رکھتی ہے اور صبح و شام اکیڈمی میں تعلیم کیلئے بھی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ بوجھ میمونہ کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ میرے مقدمات کی پیروی، اسمبلی کی حاضری، مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں شمولیت اور حلقہ انتخاب سے رابطہ۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا، مگر جس ہمت اور حوصلے سے اس نے حالات کا مقابلہ کیا ہے، میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ احباب اسکی تقاریر کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں، اسمبلی میں وہ ایک کہنہ مشق پارلیمنٹیرین کے طور پر ابھری ہے مگر اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔

اس ہجومِ یاس میں سوچا میں تم سے کچھ باتیں کروں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ سیاست میں عہدے کو کیا اہمیت دیتا ہوں۔

ایک مرتبہ بھٹو صاحب کے یاد کرنے پر ہمارا وفد، جو سات افراد پر مشتمل تھا، ان سے ملنے گیا۔ اس میں انجینئرنگ یونیورسٹی کے صدر احمد بلال محبوب بھی تھے جو آج کل پلڈ ایٹ کے ذریعے ارکان اسمبلی کی تربیت کر رہے ہیں۔

میں نے بھٹو صاحب سے مل کر چھٹتے ہی سوال داغ دیا کہ آپ نے ہمیں کیسے یاد

فرمایا؟ یہ میٹنگ گورنر ہاؤس لاہور میں ہو رہی تھی، ہنس کر کہنے لگے: آپ کو آپ کا گھر دکھانے کیلئے بلایا ہے۔ جہاں آپ نے آنا ہے۔ میں نے شرارتا کہا: میری نظریں تو اسلام آباد پر ہیں۔ سنجیدہ ہو کر کہنے لگے: میں تمہیں لندن میں دولتانہ کی جگہ سفیر بنا کر بھیج دیتا ہوں۔ میں نے عرض کی، مجھے اپنی صلاحیتوں کی کمی کا احساس ہے اور عمر کی کمی کا بھی۔ کہنے لگے: یہ دنیا بھر میں ایک ریکارڈ ہو گا کہ اتنی کم عمر کا سفیر اتنے اہم ملک میں تعینات کیا گیا ہے۔

بچپن سے اب تک ایک عجیب بات میرے ذہن پر چھائی ہوئی ہے کہ اگر حالات مجھے موچی بنا دیں تو جوتے گاٹھتے ہوئے مجھے خون پسینہ ایک کر دینا چاہیے، اگر حالات مجھے بس کنڈیکٹر بنا دیں تو میرا ردیہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کیساتھ مودبانہ اور خادمانہ ہونا چاہئے، میں نے کبھی عہدے کی تمنا نہیں کی۔ ہاں استاد بننے کی خواہش دل میں اب تک جواں ہے۔

ساتویں جماعت سے ہی یہ بات ذہن میں مہر ہو گئی کہ میں نے ایم این اے بننا ہے اور عوام کی ترجمانی کرنی ہے۔ وزارتیں تو راستے میں خود بخود آتی گئیں، البتہ میں بچپن سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ (U-Thant) کا ذکر سنتا تو سوچتا کہ ساری دنیا کی تنظیم کو ایک فرد کیسے چلاتا ہے۔ پھر خود سے سوال کرتا کہ کیا میں یہ کر سکتا ہوں؟

صدر اور وزیراعظم کے عہدے میں میں نے کبھی کشش محسوس نہیں کی۔ میں نے عملی زندگی میں ہر وزیراعظم کا جو انجام دیکھا ہے، اس کے بعد وزیراعظم پر ویسے بھی ترس آنے لگا ہے۔ میں ہمیشہ نظام بدلنے کا خواہشمند رہا ہوں۔ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، ذوالفقار علی بھٹو، دو تہائی اکثریت رکھنے والے میاں نواز شریف... ایک لمبی قطار ہے، قوم نے انہیں اپنی نمائندگی کا اعزاز دیا، ان کی بے وقعتی اور در بدری خون کے آنسو لاتی ہے۔

صدر مملکت بھی عجیب ادوار سے گزرے۔ ایوب کا ماتم کرنے والا گوہر ایوب رہ گیا

ہے اور ضیاء الحق کا اعجاز الحق۔ جاہ و جلال کے مظہر یحییٰ خان کے تابوت کو اکیس توپوں کی سلامی باوقار نہ کر سکی۔ غلام اسحق خان کا نام میں بھول گیا تھا، شاید قوم نے یاد رکھا ہو۔ ہاں! ایک سکندر مرزا بھی ہوا کرتا تھا، جب یہ دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ بھی خالی تھے۔ مگر یہ وہ والا سکندر نہیں تھا۔ مجھے ان کی بیگم سے ملک کے اندر اور باہر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ آخری دنوں میں کتنا دکھی شخص تھا..... باقی رہے نام اللہ کا۔

میرے دوست مجھ پر گاندھی یا نوابزادہ نصر اللہ خان کی پھبتی کتے ہیں۔ جہاں تک نوابزادہ نصر اللہ خان کا تعلق ہے، میں ان سے متاثر ہوں۔ آگ اور پانی کو اکٹھا کرنے کے ان کے جادو کا بھی قائل ہوں۔ میں جب اڈیالہ جیل میں آیا، ان کی وفات کا زخم تازہ تھا۔ میں مہینوں افسردہ رہا، پہروں ان کی یاد میں آنسو بہاتا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو آخری سانس تک جمہوریت کی بحالی کے لئے جستجو کر رہا تھا، بستر مرگ پر ذرا حالت سنبھلی تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ مجھ سے اور مخدوم امین فہیم سے رابطہ کرے اور اے آر ڈی کی میٹنگ کی تاریخ کا اعلان کیا جائے۔ وہ اس بات پر سخت ناراض تھے کہ ہم نے ان کی بیماری کی وجہ سے اے آر ڈی کی میٹنگ ملتوی کرتے ہوئے نئی تاریخ کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ یہ ان کی اپنے بیٹے نوابزادہ منصور خان سے آخری گفتگو تھی، وہ ہسپتال سے سیدھا میٹنگ میں آنا چاہتے تھے۔

مریضِ محبت انہی کا فسانہ

ساتا رہا دم نکلتے نکلتے

قیادت کے بارے میں میں نے ایک اصول طے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے مردم آزاری سے نجات مل گئی ہے۔ میں نظریے اور فکر کی سیاست کرنیوالوں کو ولی سمجھتا ہوں، خواہ وہ بائیں بازو کی سیاست کر رہے ہوں یا دائیں بازو کی۔

تیسری دنیا کے سیاست دانوں کو قطب کا مقام دینے کو تیار ہوں، لیکن میں انہیں پینمبر نہیں سمجھتا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو سکتا ہو، البتہ ذات کو قوم اور ملک پر ترجیح دینے والی

سیاست کے خلاف جہاد کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔

میرے بزرگوں نے اڑھائی سو سال تک دریائے راوی اور دریائے سندھ کے اندر بھکر سے دیپالور تک حکومت کی، مگر ہمارے جدِ اعلیٰ نے حکومت کو خیر باد کہہ کر دین کے فریضے کو ترجیح دی۔ میں نے اپنے گھر کی لائبریری کی ایک کتاب میں جب یہ عنوان پڑھا "چھوڑ دی شاہی شاہی شاہ دیندار نے" تو اقتدار سے بے رغبتی کا پورا فلسفہ سمجھ میں آ گیا۔ میرے بزرگ آج بھی میرے لیے مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں تازہ ترین مثال نیلسن منڈیلا کی ہے، جو اقتدار سے علیحدہ ہو کر امر ہو گیا۔ عہدے کی ہوس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

نیلسن منڈیلا رہائی کے بعد پاکستان آئے تو میں نے دو دن ان کے ساتھ گزارے۔ یہ ایک یادگار موقع تھا۔ کراچی سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں رات ہم نے اکٹھے گزاری اور پھر اسلام آباد کی سولو فلائٹ (Solo flight) کے دوران بھی طویل گفتگو ہوئی، وہ اس وقت تک جنوبی افریقہ کے صدر نہیں بنے تھے، نہ انہیں عہدہ سنبھالنے کی جلدی تھی۔ وہ جنوبی افریقہ کی معیشت، اندرونی استحکام اور امن کے رول کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے 27 سال قید و بند کی صعوبتیں اور مشقتیں کیسے برداشت کیں۔

انہوں نے ہنس کر کہا کہ

جاوید! قید میں ایک ایک لمحہ گن گن کر گذرتا ہے۔ باہر آ کر یوں محسوس ہو رہا ہے کہ بس ایک لمحہ تھا جو گذر گیا۔

”بس اپنے مقصد کا تعین ہونا چاہیے“

نیلسن صدر بننے کے بعد دوبارہ پاکستان کی مدد پر شکر یہ ادا کرنے آئے۔

اس مرتبہ انہیں صدارتی پروٹوکول حاصل تھا، مجھے ان کی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔

اس مرتبہ کسی اور کو یہ اعزاز ملا۔

ہم تو سفرِ محبت کے ساتھی تھے، حکمرانوں کے سفر کے ساتھی کوئی اور ہوتے ہیں۔ الوداعی تقریب میں وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے میرا تعارف کرایا۔ نیلسن نے کہا کہ ان کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں، یہ خوشبو میرے اندر بسی ہوئی ہے۔

میں نے اس خوشگوار لمحے کو اپنے دماغ میں ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا۔ جب نیلسن منڈیلا جیل میں تھا، برطانیہ کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے انہیں دہشت گرد قرار دیا۔ وہ اپنی ذات کی بجائے جنوبی افریقہ کے عوام کی آزادی کی بات کر رہا تھا۔ آج وہ امن کا سمبل کہلاتا ہے۔ اس نے غربت، بیماری اور جہالت کے خلاف 85 سال کی عمر میں بھی جنگ جاری رکھی ہوئی ہے۔ مغرب کا حسن کرشمہ ساز جب چاہے کسی کو دہشت گرد بنا دے یا امن کا پیامبر! تم سے باتیں کر کے ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ جلد ملاقات ہوگی۔

والسلام!

تمہارا والد!

قیادت کا تصور اور چرچل کا گاؤں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

20 جولائی 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ جیل راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

میں آج بہت خوش ہوں۔ رات کے تین بجے ہیں، باہر زوردار بارش ہو رہی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ میں اپنے روزن دیوار سے باہر جھانک کر محظوظ ہو رہا ہوں۔ میں نے پھولوں کی جو قلمیں اپنے سیل کی دیواروں کے ساتھ لگائی تھیں، ان پر موتیا، چنبیلی اور گلاب مہک رہے ہیں۔ تیز روشنی کے بلب جو مجھے اذیت دینے کیلئے رات کو جلائے جاتے ہیں، راحت کا باعث بن گئے ہیں۔ ساری رات پھولوں کو دیکھ سکتا ہوں، ان کی خوشبو سے اپنے دماغ کو معطر کر سکتا ہوں۔

حاکموں نے مجھے تنہا کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ میں ہر شام محفل جماتا ہوں، دنیا کی عظیم ہستیاں مجھے میزبانی کا شرف بخشتی ہیں اور میری رہنمائی کرتی ہیں۔ میں خدا اور اسکے رسول ﷺ کی مصاحبت میں رہ رہا ہوں۔ میں تنہا کیسے ہو سکتا ہوں!

ملک کے کروڑوں لوگوں کی دُعائیں، ان کے دکھ درد، ان کی امیدیں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ ہیبت ناک سلاخیں جذبوں اور محبتوں کو اندر آنے سے نہیں روک سکتیں۔ جب چاہتا ہوں کتابوں میں گم ہو جاتا ہوں، جب چاہتا ہوں منزل کو اپنے پاس بلا لیتا ہوں۔ سالک تو بیٹھا ہوا بھی حالت سفر میں ہوتا ہے، میں بھی سلوک کی منزلیں طے کر رہا ہوں۔ رہائی کے بعد جنگل میں بسرام کرنے کا تقاضا کر دوں تو پریشان نہ ہونا۔

خیر اب مقصد کی طرف آتے ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ قیادت کا تصور میرے نزدیک کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر میں مسلمان گھر میں پیدا نہ ہوتا اور دیانتداری سے انسان کی بہتری کا راستہ تلاش کرتا تو ایک ہی راستہ مجھے منزل مقصود پر پہنچاتا اور وہ راستہ خواجہ یثرب ﷺ کی چوکھٹ سے ہو کر گذرتا ہے۔

اقبال تو کہتا ہے کہ تیرے وقت کا امام وہ ہے جو تجھے حاضر اور غائب سے بیزار کر کے نئی دنیا بسانے کیلئے تمہاری زندگی دشوار تر بنا دے، اس میں خوئے دلنوازی ہونی چاہئے ورنہ لوگ کارواں سے ٹوٹتے جائیں گے اور حرم سے بھی بدگماں ہو جائیں گے۔ عوام کو ساتھ لے کر چلنا اُس کی پہلی ذمہ داری ہے، جیسے ایک گڈ ریا اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو بحفاظت اپنی منزل مقصود پر پہنچانے کیلئے ان کے پیچھے چلتا ہے اور ہر ہمسفر پر اُس کی نظر ہوتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی علیہ السلام نے بکریاں چرائی ہیں مگر کئی حکمران انسانوں کو ہی بھیڑ بکریاں سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ رہنما وہی ہوتا ہے جو عوام کا احترام کرتا ہے اور اُن کے اعتماد کے حصول کیلئے اُن سے محبت اور تعاون کرتا ہے اور زمینی حقائق پر نظر رکھتا ہے۔

قومی شعور کی سطح بلند کرنے کیلئے اسے خود کو قربانی کیلئے پیش کرنا چاہئے۔ ذات کی نفی سے اجتماعی شعور بلند ہوتا ہے۔ رہنما کو مشکل ترین حالات میں جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرات کا سامنا کرنا چاہئے۔ جب رسالت مآب ﷺ اکیلے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کا پتہ لگانے نکلے تھے تو اہل مدینہ نے سکون سے سونا شروع کر دیا تھا۔

اعلیٰ نصب العین کے حصول کیلئے قیادت کو خود کو نمونہ کے طور پر پیش کرنا چاہئے۔ اچھے رہنما کو سیاسی عمل سے سیکھے رہنا چاہئے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا، تمہاری دادی ہمیں سکندر اعظم کا قصہ سنا کر بتاتی رہتی تھیں۔ ناگزیر لوگوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں، ہمیں یقین ہونا چاہئے کہ آنے والے ہم سے بہتر ہوں گے۔ اچھا رہنما تاریخ بناتا ہے اپنے ملک اور قوم کو بلندیوں تک پہنچاتا ہے، تاریخ اسے نہیں بھول سکتی۔

میں افراد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو رسالت مآب ﷺ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے کیوں دعا مانگتے۔ افراد اپنی قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں اور اگر جذبے اور صحیح حکمت عملی سے کام کیا جائے تو قوم کو منزل مقصود تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

چرچل کی سیاست عملیت پسندی کی تصویر ہے۔ اس کو عالمی سیاست میں بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ لیکن اس کی سیاست کی بنیاد انسانی فلاح یا ترقی کی بجائے برطانیہ کے مفادات کے تحفظ پر تھی۔ وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے لیکن اسکے کردار کی ایک خوبی سے میں نے بہت زیا دہ اثر لیا۔

1986ء میں چند دوستوں نے پروگرام بنایا کہ چرچل کے گاؤں جا کر اس کا گھر دیکھیں۔ وہاں ان کے پوتے، چرچل جونیر، جو اس علاقے سے ایم پی (M.P) منتخب ہوئے تھے، ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ پھولوں کی روشوں سے گزر کر ہم چرچل کے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ جیسے چرچل نے ابھی استعمال کی ہو۔ بیڈروم میں داخل ہوا تو محسوس ہوا چرچل محو خواب ہے۔ غسل خانے میں جا کر دیکھا اُدھ جلا سگار اسی طرح موجود تھا۔ کموڈ کے ساتھ لکھنے کی سہولت موجود تھی اور کتابوں کا ایک شیلف بھی۔ چرچل کی کئی شاہکار تحریریں زیادہ تر یہیں لکھی گئیں۔ میں نے اس کے پوتے سے پوچھا اس گھر کو قومی ورثہ قرار دینے کا آپ کو کیا معاوضہ دیا گیا۔ ہنس کر کہنے لگا کچھ نہیں ملا اور بہت کچھ ملا۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ میرا دادا بہت خرچہ لگا تھا اور اکثر مقروض رہتا تھا۔ ایک مرتبہ دیوالیہ ہو گیا تو اس گاؤں کے زمیندار نے یہ گھر میرے دادا کو اس شرط پر ہونا کر دیا کہ وہ اسے بیچ نہیں سکے گا اور اس کے مرنے کے بعد یہ قومی ملکیت ہوگا۔ ہمیں یہ معاوضہ ضرور ملا ہے کہ قوم ہماری عزت کرتی ہے اور اس حلقے سے ہمیں منتخب کرتی ہے۔

بشی بیٹا میں، اگرچہ تمہارے لئے کوئی بہت بڑا اثاثہ تو نہیں بنا سکا لیکن اگر تم ملکی معاملات میں آگے بڑھ کر اصلاحی کام کرنا چاہو تو کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ہونگے جو یہ کہہ کر اپنا تعاون پیش کریں کہ تمہارے والد نے اپنی مٹی سے محبت کا رشتہ برسر دار بھی نبھایا تھا۔

والسلام! تمہارا والد!

گلوبل ویج اور بین الاقوامی سیاست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

12 اگست 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

صبح صادق ہونے سے پہلے کوئل میرے سیل کے سامنے والے درخت پر بیٹھ کر اپنی سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچاتی ہے، پھر چڑیاں چھپانا شروع کرتی ہیں، بلبل کی آہ و زاریاں مجھے نغموں پر اُکساتی ہیں، کوئے بھی پیچھے نہیں رہتے، مجھے ان کی آواز بھی زندگی اور آزادی کا احساس دلاتی ہے۔ مالدیپ کے جزیروں میں پرندے نہیں ہوتے، وہاں کوئے کی آواز سے بھی اُنس ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی ہماری ثقافت میں کوماہمان کے آنے کا سندیسہ لے کر آتا ہے۔ کہتے ہیں کوئے نے انسان کو آدم کے بیٹے قابیل کو اپنے بھائی ہابیل کی لاش دفن کرنے کا طریقہ سکھایا۔ اب ابن آدم لاشوں کو دفنانا بھول گیا ہے۔ کوؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پھر سے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔

فاختائیں قریب آ کر میرے قفس کے پنجرے کے باہر بیٹھ جاتی ہیں۔ انسان جسے ”علمہ البیان“ کے تاج سے نوازا گیا تھا، ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے قاصر ہے اور حیوان ناطق ہونے کا حوالہ بھی مشکوک ہونے لگا۔ میں پرندوں کی زبان سیکھ گیا ہوں، جمال ہمنشین نے میرے اندر اثر کر لیا ہے۔ معلوم نہیں رہا ہو کہ میں فاختہ کی زبان میں بات کروں گا یا کوئے کی زبان میں یا حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح چڑے میاں کو دربار میں طلب کرتا ہوں کہ وضاحت کرے کہ اس نے اپنی چڑیا کے سامنے اپنے پر سے میرے تخت کو گرانے کا دعویٰ کیوں کیا تھا۔ اس نے بھی اگر وہی جواب دیا کہ آپ کا تخت کہاں اور میرے

پر کہاں، ہمیں اپنے گھر والوں پر رعب ڈالنے سے تو منع نہ کریں تو میرا رد عمل کیا ہوگا۔
میرے خیال میں میرا رد عمل امریکہ جیسا ہوگا، جو توپ سے چڑیا کا شکار کرتا ہے،
ناگاساکی، ہیروشیما، ویتنام، افغانستان اور عراق اس کا تازہ شکار ہیں۔ میں نے بات کوئی
اور کرنا تھی وہ بات تقریباً اس سے ملتی جلتی ہے اور میری پرندوں والی گفتگو کو اس بات کی تمہید
سمجھ لیں جو میں کر رہا ہوں۔ دنیا پر آج بھی جس کی لاشی اس کی بھینس والا فارمولا کام کر رہا
ہے، یہی فارمولا ہماری دیہاتی زندگی میں رائج ہے۔

دنیا جہاں ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے وہاں وہ تیزی سے پھیل بھی رہی ہے۔ اگست
1978ء میں مجھے اقوام متحدہ میں خطاب کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ تو اس وقت اقوام متحدہ
127 ملکوں پر مشتمل تھی۔ آج اقوام متحدہ میں 202 کے قریب ممالک شامل ہیں۔ یعنی
26 سال میں 75 مزید ممالک آزاد ہو چکے ہیں۔ دنیا کی ان تمام قوموں میں مشترکہ عنصر
جمہوریت ہے، جمہوری رویوں کی بنیاد کو معیشت کی ترقی کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے
پاس جمہوریت کے قیام کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ ہمیں خوشدلی سے اس حقیقت کو
تسلیم کر لینا چاہیے۔ بین الاقوامی مذاکروں میں شرکت اور امریکی یونیورسٹیوں میں لیکچر
دینے کے موقع پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانی ذہن ابھی پختگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا
ہے اور فطرت کے سربستہ رازوں سے نا آشنا ہے۔ اس کیلئے اسے ابھی کافی مراحل سے
گزرنا ہوگا۔

دنیا میں طاقت کے تین مراکز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ واشنگٹن، ماسکو اور بیجنگ۔ اتفاق
سے مجھے تینوں مراکز میں سربراہ سطح کے مذاکرات میں شرکت کا موقع ملا۔ روس کے
وزیر اعظم پریماکوف کمر کے درد کا سامنا کر رہے تھے۔ مذاکرات کے بعد ہلکی پھلکی گپ
شب چل رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ وزیر صحت ہیں، پاکستان میں اوکاڑہ کے قریب کسی
کے پاس کمر کے درد کی دوا ہے۔ میں حیران رہ گیا۔ روس کا وزیر اعظم خلاء میں انسان بھیج
سکتا ہے مگر اپنی کمر کیلئے دیپالپور کے حکیم سے مسیحا کا طالب ہے۔ میاں نواز شریف نے

ہنتے ہوئے کہا۔ لگتا ہے اس کی کمریلسن نے توڑی ہوئی ہے اور وقتاً ایک ہفتے کے اندر روس کے صدر یلسن نے جو خود ہسپتال میں مہینوں موت و حیات کی کشمکش میں رہے، اسے وزارت عظمیٰ سے چلتا کیا۔

امریکہ کے مرکز میں ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا جا رہا تھا کہ محترمہ بے نظیر اور ضیاء الحق کو میل جمل کر کام کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے لئے یہ ناقابل یقین تھا۔ بعد میں سردار شیر باز مزاری نے کہا، ہاں، ایسا ہو رہا تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

بیجنگ والے تو بالکل سادہ لوگ ہیں مگر زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس لئے ہمیں سپر پاورز کو خدائی مخلوق نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم بالکل اُن جیسے ہیں یا وہ ہمارے جیسے۔

ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم اقوام متحدہ کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے، جن سے میری طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم کا جھکاؤ یہودیوں کی بجائے فلسطینیوں کی طرف تھا۔ اس پر الزام لگا دیا گیا کہ وہ نازی ازم میں یقین رکھتا ہے۔ مگر قوم نے اسے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ بطرس بطرس غالی دوسرے اور کوئی عنان تیسرے سیکرٹری جنرل ہیں، جن کے ساتھ مجھے مل بیٹھنے کا مجھے موقع ملا۔ بطرس بطرس غالی نے فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ امریکا کی قیادت کو یہ پسند نہ آیا اور انہیں گھر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ یہ اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے افراد ہیں۔ کوئی عنان چلتی پھرتی بے بسی کی تصویر ہیں۔ ”ہمارے وزیر اعظم کی طرح“۔ ادارے کی وجہ سے پوری دنیا ان کی طرف رہنمائی کیلئے دیکھتی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی بڑا عبقری نہیں جو جریدہ عالم پر اپنا نقش ثبت کر سکے۔

مجھے دو بین الاقوامی انتخابی مہمات میں حصہ لینا پڑا تو اندازہ ہوا کہ بین الاقوامی سوچ ابھی میرے گاؤں کی سیاسی سوچ سے بلند نہیں ہو سکی، بلکہ کئی معاملات میں میرے گاؤں کی سوچ بین الاقوامی سوچ سے بہتر ہے۔

گوہر ایوب خان انٹرنیشنل پارلیمنٹری یونین کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ میری سربراہی

میں ایک وفد وزیراعظم نواز شریف کا پیغام لے کر یورپی ممالک کے سربراہوں سے مل رہا تھا۔ میرٹھ شیر مزاری بھی وفد میں شامل تھے۔ ہم جہاں جاتے وہ جمہوریت کیلئے ہماری خدمات کا پوچھتے۔ ہم جھینپ جاتے مگر پھر انہیں کہتے کہ آپ ہمیں موقع دیں گے تو ہم جمہوریت کی خدمت کریں گے۔ وہ یورپی امیدوار پر ہمیں ترجیح دینے کو تیار نہیں تھے۔ رہی سہی کسر ہمارے امیدوار نے سٹرا سبرگ کی کانفرنس میں تقریر کر کے پوری کر دی۔ اپنی تقریر میں وہ ایوب کے مارشل لاء کا دفاع کرتے رہے۔ حالانکہ ساری رات اکرم ذکی اور میں ان کی منتیں کرتے رہے کہ آپ جمہوریت کے فورم پر یہ تقریر نہ کریں۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا، وہ جو محاورتا کہتے ہیں، ہم اپنی ضمانت بھی ضبط کرا بیٹھے اور زمبادلہ الگ ضائع ہوا۔

دوسرا انتخاب محترمہ نفیس صادق کا تھا جو اقوام متحدہ کی این ایف پی اے (N-F-P-A) بہبود آبادی کی سربراہ تھیں۔ وہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (W-H-O) کی سربراہ بننا چاہتی تھیں۔ مقابلے میں ناروے کی تین مرتبہ وزیراعظم منتخب ہونے والی مس لین (Ms-Lin) تھیں۔ جنہوں نے تیسری مرتبہ وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور بین الاقوامی سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کیلئے افریقی ممالک میں سرگرم عمل ہو گئیں۔

مجھے وزیر صحت ہونے کی وجہ سے وزیراعظم نے کہا کہ محترمہ نفیس صادق کی انتخابی مہم کے سلسلے میں مختلف ممالک کا دورہ کروں۔ ہمیں شروع سے ہی اندازہ ہو گیا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن امیدوار کی خوش فہمی وہی تھی، جو گاؤں یا محلے میں الیکشن لڑنے والے کونسلر کی ہوتی ہے۔ مجھے اس مہم میں بین الاقوامی ذہن میں جھانکنے کا موقع ملا۔ پوری دنیا گاؤں کی طرح تقسیم تھی، برادریوں کی بات کی اہمیت تھی، علاقائی حقائق فوقیت رکھتے تھے، امیدوار کے الیکشن میں اخراجات فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے تھے۔

عربوں سے ووٹ مانگتے تو وہ کہتے ہمارا اپنا علاقائی امیدوار ہے۔ یورپ والوں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کہ یورپی برادری کے فیصلے کا انتظار ہے۔ افریقی ممالک میں مس لین نے زیادہ سماجی کام کرا دیئے۔ ہندوستان سے انڈونیشیا تک کوئی صاف انکار بھی نہ کرتا۔

ہمارے ہاں اسے منافقت کہتے ہیں، بین الاقوامی سطح پر یہ ڈپلومیسی (Diplomacy) کہلاتی ہے۔ یہ باتیں اگر کونسلر کے انتخاب میں بھی کی جا رہی ہوں تو بھی قابل قبول نہیں ہوتیں۔

دُنیا میں کئی ملک ترقی یافتہ ہو گئے ہیں مگر انسان ترقی کے مراحل طے کر کے بھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکا۔

ابھی انسانی ترقی کے مدارج کی رفتار انتہائی سُست نظر آتی ہے، جو قوم انصاف، مساوات اور سچائی کا پرچم لے کر چل پڑے گی زمانہ اس کی یلغار کا ساتھ دے گا۔ وسائل کی عدم دستیابی انسانی شعور کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ قاضی تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے کہ زیادہ وسائل والی بے انصاف قوموں کی جگہ بے وسیلہ، مگر عدل و انصاف کی حامل قوموں کو برتری نصیب ہوتی ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

پارلیمنٹ کی بالادستی واحد علاج بسم اللہ الرحمن الرحیم

10 اگست 2004ء

گوانتانا مو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

پچھلی ملاقات میں ابو القاسم اپنی تو تلی زبان میں کہہ رہا تھا "بابا سائیں گھر جلو" اسے کہنا میں اس کی ہر ضد پوری کر سکتا ہوں، مگر میری بھی ایک ضد ہے۔ میں اپنی آزادی پر عوام کی آزادی کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ ضد اس کے خون میں بھی ہے۔ بڑا ہو کر میری مجبوری کو سمجھ جائے گا۔ دو سال پہلے جب وہ پیدا ہوا تو میں کیمپ جیل لاہور میں قید تھا۔ اس کی ماں منہ 1977ء میں پیدا ہوئی تو یہ عجیب اتفاق ہے میں اس وقت بھی کیمپ جیل لاہور میں تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے سلسلے میں قید تھا۔ اتنا شاندار ماضی رکھتے ہوئے اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔

جب کوئی مفلس و نادار اپنے منتخب نمائندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ آپ نے دوبارہ میرے دروازے پر آنا ہے جو برتاؤ آج میرے ساتھ کریں گے، کل اسی برتاؤ کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہو جائیں تو اس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ اسے ووٹ کی پرچی "برچھی" نظر آنے لگتی ہے۔ اگر عوام سے پرچی کی طاقت چھین کر فرد واحد کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ بے زبان ہو کر بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ وڈیرے، جاگیردار اور بااثر افراد اس موقع کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فرد واحد کا عوام سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا، اسے بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ازلی تابعدار اس کی تابعداری کر کے کمزور طبقات سے تابعداری کرانے کا لائسنس حاصل کر لیتے ہیں۔

عوام کی آزادی کا مطلب ہے، پارلیمنٹ کی بالادستی اور سیاسی عمل کا تسلسل۔ سیاسی جماعتیں جب بار بار عوام کے دروازے پر جاتی ہیں تو سیاسی عمل کی وجہ سے معاشرے کے تمام طبقات اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو اپنی پارٹی کے دانشوروں، مزدوروں، کسانوں اور قانون دانوں کو ٹکٹ جاری کرنا پڑتا ہے۔ جس پارلیمنٹ میں تمام طبقات کی متوازن نمائندگی ہو جائے وہ ملک خوش قسمتی کی معراج پر پہنچ جاتا ہے۔

جب کسی قبیلے کا سردار اس قبیلے کے محروم اور مقہور شخص کی کٹیا کے باہر کشکول گدائی لے کر اپنے لئے عزت و وقار کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔

جب کوئی نواب اپنی ریاست کے سرسوں کے کھیت کے کنارے اپنی سابقہ رعایا کے سامنے تاج شاہی اُتار کر دستارِ فضیلت کیلئے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا ہے۔

جب کوئی مرشد یا مخدوم شہروں اور بستیوں کی خاک چھان رہا ہوتا ہے اور عزتِ سادات بھی داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ جس مرید کے گھر میں مٹی کا دیا بھی نہ ہو، پیروہاں سے روشنی تلاش کرتا ہے۔

جب کوئی وڈیرا، کوئی چودھری، کوئی خاں صاحب 16 کروڑ عوام کو پہاڑی چوٹیوں پر غاروں میں، صحراؤں، کوچوں اور گلیوں میں تلاش کرنے کیلئے در بدر ہورہا ہوتا ہے۔

جب علمائے کرام انسانوں کے دروازے پر اپنی حاجت پوری کرنے کیلئے انتظار کرتے ہیں، نہ عورت کے دوٹ کو آدھا ہونے دیتے ہیں اور نہ کسی کو عامی کہتے ہیں۔

جب کوئی کارخانہ دار اپنے مزدور سے بھیک مانگ رہا ہوتا ہے تو سلطانی جمہور کا یہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ کے قیام کے ساتھ ہی حکومت بنتی ہے۔ یہ حکومت عوام کی دی ہوئی ہوتی ہے حزب اختلاف اس کے احتساب کا عمل شروع کرتی ہے۔ یہ احتساب کا حق بھی عوام کا دیا ہوا ہوتا ہے۔

اگر حکومت عوام کا خیال رکھے تو عوام بھی پانچ سال بعد اس حکومت کا خیال رکھتے ہیں،

ورنہ احتساب کرنے والوں کو موقع عطا کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے وعدوں کو عمل میں بدل کر دکھائیں۔

ملک کا ہر فرد سمجھتا ہے، پارلیمنٹ میں اس کی آواز موجود ہے۔ وہ تمام ملکی معاملات میں اپنے آپ کو شریک سمجھتا ہے اور اجتماعی سوچ پیدا ہونے لگتی ہے، قوم کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔

فیوڈل فوجی اور سول بیورو کرہیسی کا احتساب شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ پارلیمنٹ کے ارکان کو ملک میں ہونے والے تمام واقعات اور فیصلوں کے بارے میں پوچھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

اگر دس فی صد ارکان پارلیمنٹ بھی سوالات پوچھنا شروع کر دیں اور اپنی تقاریر میں حکومت کی بے اعتدالیوں کو قوم کے سامنے لائیں تو پارلیمنٹ کی بالادستی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر حزب اختلاف، احتساب صحیح طریقے سے نہ کر سکے تو قوم اگلے انتخابات میں اس کا احتساب کر لیتی ہے۔

پارلیمنٹ بنانے کے عمل میں اگر مداخلت نہ ہو تو اس کی کارکردگی میں پختگی آجاتی ہے اور پارلیمنٹ کے فورم سے نئی قیادت جنم لیتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم نہ کی جائے تو پھر انفراتفری کا عالم ہوتا ہے، کوئی کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ نہیں سمجھتا اور جس معاشرے میں جوابدہی کا عمل نہ ہو وہ معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالادستی سے دنیا میں معاشی ترقی ہوئی یا معاشی ترقی سے جمہوریت نے جنم لیا، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشی ثمرات کے بغیر ایک کھوکھلی جمہوریت جنم لیتی ہے۔ جو اڑھائی ہزار سال قبل ("جو لیس سیزر" سے بھی پہلے) موجود تھی۔ جو لیس سیزر نے اسے ختم کر دیا۔ کمزور پارلیمنٹ کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، نہ ہی اس جمہوری عمل کیلئے کوئی جان دینے کو تیار ہوتا ہے۔

انسان شروع دن سے اپنی زندگی کے تحفظ اور معاشی مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے۔ جو

پارلیمنٹ بے روزگاری اور بھوک کا علاج دریافت کر لیتی ہے، عوام اس کی پشت پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تمام حکمران طبقے جب جو ابدهی کے عمل سے گذرتے ہیں تو ان کا وجود نا قابل برداشت نہیں رہتا بلکہ سوال صرف اچھے اور برے حکمران کا رہ جاتا ہے۔ برے حکمران کو پانچ سال کے اندر نکالنے اور اچھے حکمران کو مزید پانچ سال کیلئے کام کرنے کا موقع دینے کا فیصلہ عوام کے ہاتھوں میں آجائے تو ایک متوازن معاشرہ جنم لیتا ہے۔

اگلی صدی جمہوریت کی صدی ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگلی صدی کا مذہب ہی جمہوریت ہے۔ یہ بات اسلام کے پھیلنے کا باعث بنے گی، چونکہ اسلام سچائی کا مذہب ہے، آزاد فضا سے اس آتی ہے، پابندیاں اسلام کیلئے زہر قاتل ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دوران تبلیغی جماعت کو اجتماع کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح سعودی عرب میں تبلیغی جماعت کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں جمہوریت کی وجہ سے یہ اجتماع ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ اور برطانیہ میں اس قسم کے اجتماعات پر کوئی پابندی نہیں۔

جب پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم کر لی جائے تو طاقتور ملکوں کی مداخلت سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ فرد و احد باؤ میں آسکتا ہے، پارلیمنٹ چونکہ اپنے عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے، اس لئے وہ ملک کا دفاع فوج سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ کر سکتی ہے۔

جمہوریت میں عوام کی بالادستی کا حق تسلیم شدہ اصول ہے۔ اکثریت کا فیصلہ قانونی شکل اختیار کر لے تو پرامن معاشرہ جنم لیتا ہے۔ فیصلوں میں عوام کی شرکت قوم کو متحد کرنے کا باعث بنتی ہے۔ عوام کے نمائندوں کے ذریعے زمینی حقائق اور عوام کے مسائل پارلیمنٹ کے ذریعے قومی بحث کا حصہ بن جاتے ہیں۔

سول یا فوجی بیورو کریسی، زمینی حقائق جاننے اور لوگوں کے مسائل سمجھنے میں پٹواری سے اسٹنٹ کمشنر اور وہاں سے ڈی سی او اور ڈی سی او سے صوبائی سطح اور وہاں سے

مرکز تک کئی مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ مراحل زمینی حقائق اور مسائل کو قومی سطح پر پہنچانے میں کافی وقت لگاتے ہیں۔ اس وقت تک مسئلہ بحرانی شکل اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مسئلہ کا انتظامی حل عوام کی سوچ کے مطابق ہو۔ حل کی تلاش میں دیر کی وجہ سے عوام اور بیورو کریسی میں غلط فہمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کی وجہ سے بیورو کریسی اور عوام میں دوری پیدا ہو جاتی ہے، یہ دوری محرومی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ملک کے وجود پر عوام کا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے۔ امن کی صورت حال بحران میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالادستی کی سب سے بڑی خوبی، جو کسی دوسرے نظام حکومت میں نہیں، وہ یہ ہے کہ ایک نمائندہ اگر صبح کے وقت کسی محلے یا دور دراز دیہات میں لوگوں کے مسائل سے آگاہ ہوتا ہے تو پارلیمنٹ کے شام کے اجلاس میں وہ مسائل ملکی سطح پر اجاگر ہو کر حل طلب بن جاتے ہیں۔ اسی طرح نمائندوں کے سوال کرنے سے حکومت اور افسر شاہی کو ہر وقت جوابدہی اور احتساب کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

صبح آزادی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

14 اگست 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! اُمید ہے تم خیریت سے ہوگی!

آج چودہ اگست ہے۔ صبح جلدی جاگ گیا، میرے سیل اور اس کے باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ بجلی جا چکی تھی اور سخت جس کی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ سامنے کے درخت پر پرندوں نے چہچہانا شروع کیا، پھر تیز ہوا چلنے لگی، مگر ابھی تک صبح کے ماتھے کا رنگ کالا تھا۔ موذن کی اذان نے شبستان وجود میں قندیل روشن کر دی، سکوتِ شب کو سپیدہ سحر نے زندگی کا پیغام دیا۔ میں اپنے سیل کی سلاخوں کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ صبح آزادی آیت کی طرح آسمان سے اتر رہی تھی۔ آزادی کی پہلی کرن زندان کی سلاخوں پر پڑی تو میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ روشنی پھیلنے لگی تو موتیا، چنبیلی اور گلاب عجب رنگ بکھیرتے نظر آئے۔ میں انہیں روزِ دیوار سے دیکھ سکتا تھا، ان تک رسائی ناممکن تھی۔ اگرچہ یہ پھول میں نے خود لگائے ہیں اور انہیں اپنے ہاتھوں سے سینچا ہے مگر جب تک صیاد مجھے اجازت نہ دے میں قریب ہوتے ہوئے بھی ان پھولوں کی خوشبو تک نہیں پہنچ سکتا مگر آج میرا دماغ آزادی کی خوشبو سے معطر ہے۔

میں اپنے حصے کے آسمان کو دیکھ سکتا ہوں اور اپنے حصے کی زمین پر پاؤں جمائے بیٹھا ہوں۔ زمین کے رشتے کتنے مضبوط اور کتنے حقیقی ہوتے ہیں! فضا میں محو پرواز طیارے کو دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ وہ جتنا زمین سے دُور ہوتا جاتا ہے اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیو قامت عمارات، دریا اور پہاڑ ریت کے ذرے کے برابر نظر آتے ہیں اور زمین پر انسان ایک ریگنے والے کیڑے کی طرح۔ جو نہی زمین سے دوبارہ رشتہ قائم ہوتا ہے، زندگی کے

آثار لوٹ آتے ہیں اور انسان پھر انسان نظر آنے لگتا ہے۔

بشری بی بی کبھی زمین سے رشتہ نہ توڑنا۔ تمہارے آباؤ اجداد نے صدیوں تک اسے خون جگر سے سینچا ہے۔ ان کی ہڈیاں اسی مٹی کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں جو پھول دیکھ رہا ہوں، جو خوشبو سونگھ رہا ہوں، ان میں رنگ بھرنے کیلئے لاکھوں انسانوں نے اپنے جگر کو لہو کیا ہے۔ کروڑوں انسانوں نے اس زمین سے اپنا رشتہ جوڑنے کی لئے آباؤ اجداد کے گھروں کو چھوڑا ہے، لاکھوں اس خوشبو کو سونگھنے کی حسرت کو دل میں لئے دنیا سے چل بے۔

زندانی میں میں نے اپنی شاموں کو کبھی اُداس نہیں ہونے دیا۔ جب پرندے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں اُن پر عجیب سرشاری کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ تلاش رزق کے سفر سے واپسی پر چہچہا رہے ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ملنے اور اپنے آشیانے تک پہنچنے کی ترنگ میں ہوتے ہیں۔ جو نہی بچوں تک پہنچتے ہیں اپنے دن بھر کی جمع پونجی اُن پر نثار کر دیتے ہیں۔ میں یہ سارا منظر اپنی آنکھوں میں جذب کر لیتا ہوں۔ یہ منظر خوش کن بھی ہے اور دل گداز بھی۔ ہم نے بھی آج کے دن اپنا آشیانہ بنایا تھا، میں اس خوشی کے موقع پر اس کی تزئین و آرائش کے بارے میں سوچتا رہا۔

پرندوں کو اپنے بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوئی تھیں، یہ ایک کمزوری کا لمحہ تھا جو بہت جلد گزر گیا۔ میری آنکھیں ڈھا کہ کے سیلاب پر مرکوز ہو گئیں اور پھر ایک اور سیلاب میری آنکھوں سے بہنے لگا۔ ہمارے خاندان میں کسی کی موت کے بعد آئیوالی پہلی عید پر پورا خاندان اکٹھا ہو کر کچھ وقت کیلئے سوگ مناتا ہے۔ میری والدہ کی وفات پر ہر رمضان شریف کا پہلا ہفتہ سوگ میں گزارا جاتا۔ یہ سلسلہ کچھ سالوں تک چلتا رہا پھر حالات معمول پر آ گئے۔ میں مادر وطن کے حصے مشرقی پاکستان کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ آزادی کی خوشیوں کو اپنی خود غرضی تک محدود کر لوں۔

14 اگست 1947ء کو جب پاکستان بنا تو برصغیر کے ان حصوں پر مشتمل تھا جو انتہائی

پسماندہ تھے۔ مشرقی پاکستان کی نوے فیصد زمین ہندو مارواڑیوں کے پاس تھی۔ صنعتی لحاظ

سے انگریز نے اس علاقے کو بانجھ کر دیا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں کو اس بات کا شدید احساس تھا اسی لئے وہ ہر سیاسی عمل میں پیش پیش رہے۔ قیام پاکستان کے وقت متحدہ بنگال اور آسام میں مسلم لیگ کی حکومت تھی، مولوی فضل حق، شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین یکے بعد دیگرے بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے۔ اس سے پہلے مولوی فضل الحق کلکتہ کے میئر بھی منتخب ہوئے۔ ان سیاستدانوں کی اکثریت متوسط طبقے سے تھی۔ جب تک مشرقی پاکستان ہمارا رہا، وہاں سے متوسط طبقہ ہی اسمبلیوں میں آتا رہا، جو مغربی پاکستان کی فیوڈل قیادت اور افسر شاہی کیلئے ناقابل قبول تھے، وہ پاکستان سے چمٹے رہنا چاہتے تھے، کیونکہ انہیں پاکستان کے قیام نے ہندو کی معاشی، سماجی اور مذہبی بالادستی سے نجات دلائی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر علاقہ میں ہندوستان کی بالادستی پھر قائم ہو گئی تو وہ صدیوں تک دوبارہ نہ اٹھ سکیں گے۔ قیام پاکستان کے بعد بہاری اور پنجابی بیوروکریسی نے ہر قدم پر انہیں احساس کمتری میں مبتلا کیا۔ جس قوم نے انگریز کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور ہندو کو صوبے کی سیاست میں مات دے دی تھی انہوں نے مات کھا گئے۔

مغربی پاکستان میں سیاسی قیادت فیوڈلز کے پاس تھی اور انہیں قیام پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پنجاب، سندھ اور سرحد میں کہیں بھی مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل نہیں تھی۔ پنجاب میں مسلمان فیوڈلز نے ہندوؤں اور سکھوں سے مل کر یونینسٹ وزارت قائم کر لی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت تجارت پر قابض ہندو طبقہ ہندوستان چلا گیا، صنعت کا وجود نہیں تھا۔ پنجاب فیوڈل اور افسر شاہی نے مل کر غریب عوام اور چھوٹے صوبوں کا ناک میں دم کر دیا۔ مسلم لیگ کے سیاستدان نو آموز تھے، گھاگ بیوروکریسی نے ان کی طفلانہ حرکتوں سے فائدہ اٹھا کر اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کر لیا۔ وہ کوئی ایسا آئین نہیں بننے دیتے تھے جس سے اقتدار اعلیٰ عوام کو منتقل ہو سکے۔ انہوں نے سیاستدانوں کو پیچھے دھکیل کر اقتدار پر براہ راست قبضہ کر لیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے، جن کی حیثیت ایک بیوروکریٹ سے

زیادہ نہ تھی۔

سیاستدانوں نے جمہوریت کی جدوجہد جاری رکھی۔ جب وہ طاقتور ہونے لگے تو بیورو کریسی نے فوج کو اپنے ساتھ ملا لیا اور 1954ء میں کمانڈر انچیف ایوب خان کو وزیر دفاع بنا دیا گیا، بعد میں وہ پہلے وزیر اعظم بنائے گئے اور پھر صدر بن گئے۔ قائد ملت لیاقت علی خان کی شہادت اور خواجہ ناظم الدین کی سبکدوشی کے بعد ہرڈپٹی کمشنر ملک کا گورنر جنرل اور وزیر اعظم بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ فوجی قیادت کو جب اپنی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے براہ راست اقتدار پر شب خون مارنے کا پروگرام بنایا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں فاصلے بڑھنے لگے۔ مشرقی پاکستان کی معیشت پر مغربی پاکستان کے صنعت کاروں نے قبضہ کر لیا، وہ نوآموز ہونے کی وجہ سے تجارت کی بجائے لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ پاکستان میں فیوڈل بیورو کریٹ اور نئے صنعت کاروں کا طبقہ مستحکم ہو گیا، جرنیل اور ان کی اولادوں نے بھی اپنی صدیوں کی محرومیوں کا علاج دریافت کر لیا، اب اگر فیوڈل ازم کو ختم کرنا چاہیں تو فیوڈل اور جرنیل کا اتحاد رکاوٹ بن جاتا ہے۔ صنعت اور تجارت پر جرنیلوں کی اولاد قابض ہے، متوسط اور غریب طبقہ پس رہا ہے، ملک کے دانشور اہل قلم بے بس ہیں، علماء کا ایک طبقہ بھی پاکستان کے حکمرانوں کی صفوں میں شامل ہو گیا ہے۔ راستے میں مشکلات ضرور ہیں، لیکن ناامیدی گناہ ہے۔ ہمیں ہر حالت میں اداروں کو مستحکم کرنا ہوگا۔ ورنہ بچے کھچے پاکستان کو بھی قائم رکھنا دشوار ہو جائیگا۔ آج یوم تجدید عہد ہے۔ میں صبح آزادی کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں قیدی ہوں مگر غلام نہیں ہوں، میرا اس دھرتی کے ذرے ذرے پر حق ہے اور میں آج کو قربان کر کے کل کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ آئین کی بالادستی میری آشیاں بندی کی بنیاد ہے اور میں اس بنیاد کو مضبوط کرنے کا عہد نبھانے کیلئے آخری سانس تک لڑوں گا، اس دھرتی نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں آزادی مبارک ہو اور مجھے بھی۔ یہ نگار وطن کی سلامتی کیلئے دست بدعا ہونے کا دن ہے۔

والسلام! تمہارا والد!

